عہد نبوی میں نظام حکمرانی

جلد اوّل

از

محمد حمید اللہ

مکتبہ جامعہ

بار اوّل ۱۵۰۰ — دہلی، نئی دہلی، لاہور، لکھنؤ، بمبئی — قیمت [illegible]

سنہ ۱۳۶۳ھ

م

سنہ ۱۹۴۳ء

مطبوعہ دیال پریس دہلی

فہرست

رسول اکرمؐ کی سیرت کا مطالعہ کس لئے کیا جائے

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت یعنی سوانح حیات و تعلیمات کا مطالعہ اب بھی کیوں کیا جائے جب کہ آپ کی وفات پر ساڑھے تیرہ صدیاں گذر چکی ہیں، علوم و فنون میں بے انتہا ترقی ہو چکی ہے متمدن قوموں کے ماحول، اور تصور حیات میں زمین و آسمان کا فرق ہو چکا ہے، اور آپؐ بھی ہمارے جیسے ایک انسان تھے؟

یہ سوال ہر سنجیدہ طالبِ علم اور ذاتی غور و فکر کر کے ذمہ وارانا اور مستقل رائے قایم کرنے والے کے ذہن میں پیدا ہوتا ہے۔ اصولی حد تک تو اس سے کسی کو انکار نہیں ہوتا کہ انسانی تمدن کی ترقی کا راز اس پر مبنی ہے کہ "ہر کہ آمد عمارتِ نو ساخت۔" البتہ اس طرح نہیں کہ اُدھیڑ بُن کا ختم نہ ہونے والا سلسلہ (کالتی نقضت غزلہا من بعد قوۃ انکاثا) جاری رکھا جائے بلکہ عمارتِ سابقہ پر عمارتِ جدیدہ کا اضافہ کیا جائے۔ ظاہر ہے کہ قدیم و جدید دونوں عمارتوں کا مالک متمول تر ہوگا بہ نسبت اس شخص کے جس کے قبضے میں صرف کوئی ایک عمارت ہو۔ البتہ یہ سوال ایک تفصیلی جواب چاہتا ہے کہ خاص محمد رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کا کیوں

مطالعہ کیا جائے، کسی اور کی سیرت کا کیوں نہیں؟

اس سوال کے جواب میں بعض باتیں صرف مسلمانوں سے متعلق ہیں۔ بعض غیر مسلموں سے، اور بعض بلا امتیاز ہر کسی سے

مسلمانوں کے لئے | سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت جو اہمیت رکھتی ہے وہ کسی لمبی تفصیل کی محتاج نہیں۔ اسلامی قانون اور عقائد کا یہ ایک مسلمہ کلیہ قاعدہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ہر قول اور ہر فعل، حتیٰ کہ اپنے صحابہ میں ہر گوارا کی اور روا رکھی ہوئی چیز قانونی حیثیت رکھتی ہے، اور قرآن یا کلام اللہ کی طرح سنتِ نبوی سے بھی واجبات، مستحبات، مباحات، مکروہات وغیرہ قایم ہوتے ہیں۔

یوں تو کسی مسلمان کی زندگی اصل میں صرف اسی وقت اسلامی کہلا سکتی ہے، جب وہ قرآن مجید کے احکام کے عین مطابق ہو، لیکن خود قرآن مجید میں بہ کثرت موقعوں پر نہایت صاف و صریح الفاظ میں سنتِ نبوی کی قانونی حیثیت کو تسلیم کیا گیا اور اسے واجب التعمیل قرار دیا گیا ہے۔ اس سے سنت یا سیرتِ نبوی کی حیثیت بھی جُزو قرآن نہیں تو کم از کم ضمیمۂ قرآن اور تتمۂ قرآن کی ہو جاتی ہے۔ ایسی چند قرآنی آیتوں کی طرف یہاں توجہ منعطف کرائی جا سکتی ہے:-

(۱) ما آتاکم الرسول فخذوہ وما نھاکم عنہ فانتھوا	رسول تم کو جو دے وہ لے لو اور جس سے وہ تم کو روکے تو رُک جاؤ۔

(ب) لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ ۔ — تمہارے لئے رسولِ خدا میں ایک بہترین نمونہ عمل ہے۔

(ج) ماینطق عن الھویٰ ان ھو الا وحیٌ یوحیٰ ۔ — (آنحضرت) اپنی خواہش سے کچھ نہیں کہتے، نہ وہ (خدا ہی کی) بھیجی ہوئی وحی ہوتی ہے۔

ان اور دیگر آیتوں سے صاف ظاہر ہے کہ سرورِ کائنات کی سیرت کو نمونہ سمجھنا اور اس پر عمل کرنا اتنا ہی ضروری ہے جتنا خود احکام خداوندی پر۔

غیر مسلموں کے لئے | سیرتِ نبویہ کا مطالعہ اس لئے ضروری ہے کہ جب ایک شخص ہم سے بیان کرے کہ میں تمہارے فائدے کی کچھ بات بے غرضانہ طور سے کہنا چاہتا ہوں تو کون عقل سلیم رکھنے والا ایسا ہوگا جو سننے سے پہلے یہ فیصلہ کرلے کہ وہ بات سننے کے قابل نہیں؟ آنحضرتؐ نے جب یہ فرمایا کہ میں تمام عالموں کے لئے رحمت بن کر آیا ہوں اور میرے لائے ہوئے دینِ اسلام کے بغیر دنیا اور آخرت کی بھلائی حقیقت میں حاصل ہی نہیں ہوسکتی، تو اس پر اوچھی طبیعت والوں نے ٹھٹول شروع کیا یا مخالفت پر اُتر آئے۔ اس کے برخلاف سنجیدہ لوگوں نے یہ پوچھا کہ دینِ اسلام کس کو کہتے ہیں اور آپ کی رائے میں ہمیں کیا کرنا چاہیئے؟ پھر جواب اور توضیح پر ٹھنڈے دل سے غور کیا۔ اور جس کی دانست میں بات معقول تھی اُس نے

اس دین کو قبول کر لیا۔

ہادیِ اسلامؐ کے اقوال وافعال اور آپ کی تعلیم اب تک محفوظ وموجود ہے اور محض آثار قدیمہ کے رتی سے ہاتھی بنانے اور قیاس آرائی وخوش عقیدگی کی ضرورت نہیں ہے۔ یوں بھی:-

ہر کسی کے لئے | چند بنیادی اصول سے خود فیصلہ کر لینا ممکن ہے۔

اسلام کا اصل اصول یہ ہے کہ فی الدنیا حسنۃ وفی الآخرۃ حسنۃ (یعنی دنیا میں بھی اچھے رہیں اور آخرت میں بھی) اولاً ہم یہی دیکھیں گے کہ دنیاوی معاملات میں آنحضرت کی سیرت اور طرزِ تعلیم میں ہمارے لئے کیا سبق ہیں؟

دنیا میں یک حیثیتی بڑے لوگوں کی کمی نہیں۔ لیکن اگر ہم مثلاً سکندر اعظم اور نپولین وہٹلر کو لیں تو ان کی زندگی صرف ایک سپہ سالار اور فاتح کے لئے مفید مطالعہ ثابت ہو سکتی ہے اور بس۔ گوتم بدھ کی زندگی، ریاضت اور عبادت میں خصوصی دلچسپی لینے والوں ہی کے لئے سبق آموز ہو سکتی ہے۔ ہومر صرف ایک شاعر اور قصہ گو تھا۔ افلاطون وارسطو صرف حکیم وفلسفی تھے، زندگی کے دوسرے شعبوں میں ان کی کوئی بڑی وقعت نہیں۔ خاص کر اکثر ناصح بے عمل رہے۔

اس کے برخلاف پیغمبر اسلامؐ کی زندگی قول وفعل کی یکسانی ہمہ جہتی حیثیت اور سب سے بڑھ کر یہ کہ زندگی ہی میں کامیابی کے لحاظ سے ایک بے مثل چیز ہے۔

چنانچہ سیاسی پہلو کو لیجئے تو آپ ؐ نے دس سال کے قلیل عرصے میں جزیرہ نمائے عرب کے تاراج (حکومتی) جہاں زیادہ تر خود سر، خانہ بدوش قبائل میں خانہ جنگیاں ہی رہا کرتی تھیں، ایک مستحکم اور بڑی مملکت قایم کر دی۔

بہ حیثیت سپہ سالار کے آپ ؐ کی لڑائیوں میں بہ مشکل چند سو آدمی فریقین کے مارے گئے لیکن دس سال میں دس بارہ لاکھ مربع میل کا رقبہ مطیع اور ماتحت ہو گیا۔ پھر یہ آپ ؐ ہی کے تربیت یافتہ تھے جن سے زیادہ مہذب وحشتی کبھی فتوحات کے لئے نہیں نکلے اور جن سے زیادہ تیز اور ٹھوس فتوحات کا اگلوں پچھلوں کسی نے ریکارڈ نہیں قایم کیا۔

بہ حیثیت منتظم و مدبر کے ہم دیکھتے ہیں کہ آپ ؐ ایک ایسے ملک میں پیدا ہوئے جہاں صحیح معنوں میں کبھی کوئی مملکت قایم ہی نہیں ہوئی تھی، اس کے باوجود آپ ؐ نے جو دستور مملکت مرتب اور جو نظام حکمرانی قایم فرمایا۔ اس پر عمل دنیا کی اس عظیم الشان مملکت کے لئے نہ صرف ہر طرح کارآمد ثابت ہوا بلکہ جب تک اس پر عمل رہا، وہ دنیا کی مہذب ترین حکومت بنی رہی۔ اسے انسانیت کا دور زرین کہنا مبالغہ نہیں۔

عمرانی حیثیت سے تقسیم و گردش دولت کا اصول سرور کائنات ؐ کے ہر مالی حکم میں نظر آتا ہے۔ تقسیم ترکہ، تحدید وصیت، ممانعت سود دولت اور جائداد پر محصول (زکات) وغیرہ کی طرف اشارہ کافی ہے

جن کا اصول یہ تھا کہ دولت صرف الداروں ہیں نہ گھومتی رہی اور یا لداروں سے لئے ہوئے حصول سے حکومت اپنی رعایا میں سے جملہ غریب مسکین افراد کو روزی مہیا کرنا اپنا اولین فریضہ سمجھے۔ عورت غلام مزدور وغیرہ کے متعلق بھی اسلامی احکام تاحال غیروں کے لئے آئیڈیل ہیں۔

سماجی اور اخلاقی حیثیت سے آپ نہ صرف معلّم اخلاق تھے بلکہ اپنی تعلیم پر سب سے پہلے خود عمل کرتے اور دوسروں کو جتنا حکم دیتے اس سے کہیں زیادہ خود انجام دیتے۔ ایک باپ، ایک شوہر ایک حاکم، ایک دوست ایک تاجر، شریک تجارت۔ غرض ہر حیثیت سے آپؐ کا کردار اتنا بے داغ ہے کہ دشمن تک کو اس کے سوا بغیر چارہ نہیں۔ علاوہ اور مسلمہ برائیوں کے، شراب اور جوئے اور بت پرستی کی ممانعت مسلمانوں کی ایسی خصوصیت ہیں کہ دنیا اب اس کو خواہی نخواہی ماننے پر مجبور ہے۔

دنیا میں بہت سے ہادی، معلّم اور پیغمبر آئے لیکن تاریخ شاہد ہے کہ کسی کو اپنی زندگی میں اتنی کامیابی نہیں ہوئی جو نبی عربیؐ کو ہوئی۔ سنہ ۱۰ھ میں جب آپؐ حج کو تشریف لے گئے تو آپ کے ساتھ ڈیڑھ لاکھ مسلمان تھے، جو بر اعظم عرب کے ہر حصے سے آئے تھے۔

آنحضرتؐ نے جو دین پیش فرمایا، اس نے اپنے لئے خود بخود

جگہ پیدا کر لی چین میں کبھی اسلامی حکومت قایم نہ ہوئی مگر وہاں پر
کروڑوں مسلمان ہیں۔ ہندوستان اور افریقہ میں غیر مسلم حکومتوں کی
موجودگی اور اپنے مذہب کے پھیلانے کے لئے وسیع اور منظم تدابیر
عمل میں لانے کے باوجود مسلموں کی روز افزوں کثرت اس بات
کا کافی ثبوت ہیں کہ اسلام کی اندرونی کشش کتنی ہے۔

وہ آپ ہی تھے کہ قسم قسم کے تعصبات سے لبریز دنیا میں
یہ اعلان فرما گئے کہ نسل، رنگ، زبان، جغرافی سکونت سے کسی انسان
کو دوسرے پر قطعاً کوئی فوقیت نہیں۔ حقیقی فضیلت اس نیکو کاری اور
خدا ترسی ہے (ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم) خدا کے نزدیک تم میں سب
سے زیادہ معزز و مکرم وہ ہے جو تم میں سب سے زیادہ متقی ہو)۔
آپ نے اس اصول پر جس زور سے عمل کرایا اسی کا نتیجہ ہے کہ تمام
پست اور مظلوم قومیں اسلام ہی کو اپنی نجات کا واحد ذریعہ
سمجھتی رہی ہیں۔ اسلام سے زیادہ مساوات کسی اور مذہب میں نظر
نہیں آتی۔ اور فطرت کی تنوع پسندی کے باعث بین الاقوامی تعلقات
کا حل اسلام کے سوا کسی ذریعے سے ممکن بھی نظر نہیں آتا۔

یہ دنیاوی پہلو تھا۔ اسلام کی خصوصیت یہ رہی ہے کہ وہ دین و
دنیا دونوں کی بیک وقت بھلائی چاہتا ہے۔ روحانی ترقی اور تزکیہ
نفس کے لئے توحید سے بڑھ کر کوئی وسیلہ نہیں ہو سکتا۔ اگر کوئی شخص
خدا کو ایک مان لے اور خیر و شر اس کے سوا کسی اور کی قدرت میں نہ

سمجھے اور حشر و نشر کو مان لے تو پھر اس سے گناہ کا سرزد ہونا محال نہیں۔ تو مشکل ضرور ہو جائے۔ ہر شخص کے ایمان کی پختگی اس کے اعمال میں ہویدا رہتی ہے، نماز، روزہ، حج، زکات اور جہاد فی سبیل اللہ ایسے احکام ہیں جن سے انسان فرشتوں سے بھی سبقت لے جاتا ہے۔ جس میں عدول حکمی کی صلاحیت ہی نہ ہو اور کسی کل کی طرح حرکت کرتا چلا جائے وہ نہ ثواب کا مستحق اور نہ عذاب کا مستوجب۔ جس میں خیر و شر کی قدرت یکساں ہو اور وہ اپنی قوتِ ارادی سے کام لے کر صرف خیر پر عمل کرے یقیناً وہی اشرف المخلوقات ہے۔

مختصراً یہی وہ چیزیں ہیں جو رسول عربی کی سیرت میں ہم کو نظر آتی ہیں۔ ان کا سنجیدہ اور غیر جانب دارمطالعہ ہمیں ان کو اسوۂ حسنہ ماننے کے سوا چارہ نہیں چھوڑتا۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العلمین۔

(نشریۂ صدر مجلس اشاعت سیرت)

حیدرآباد دکن

شہری مملکتِ مکّہ

"ہر زمانے اور ہر ملک میں قدیم مصر سے لے کر جدید امریکہ تک انسانی ذہنیت کی عظیم ترین ترقی، جدت پسندی اور کارگزاری شہری زندگی بسر کرنے والوں ہی میں نظر آتی رہی ہے جب تک لوگ چرواہوں یا کسانوں کے پیشوں پر اکتفا کرتے رہے اُس وقت تک معاشی فرائض کی تقسیم کے لئے کوئی خاص ترغیب نہیں پائی جاتی تھی اور لوگوں کی توانائیاں تمام تر غذا حاصل کرنے کی کوشش میں صرف ہو جایا کرتی تھیں جب سے "شہر" وجود میں آیا تقسیم کار بھی ہونے لگا، معاشی بچت کے امکانات بھی پیدا ہو گئے اور یہیں سے دولت، فرصت، تعلیم، ذہنی ترقی اور علوم و فنون کی توسیع ہونے لگی۔"[1]

اس مقالے[2] کا منشا صرف یہ ہے کہ علمی دنیا کو ایک ایسی زرخیز

---

[1] انسائیکلوپیڈیا آف سوشیل سائنس تحت عنوان سٹی (شہر) ۱۲۷ ص انڈلیم سنرد۔

[2] مقالہ جو دسمبر ۱۹۳۷ء میں ٹریونڈرم میں اورینٹل کانفرنس میں سنایا گیا۔

زمین کی تحقیق کے لئے متوجہ کیا جائے جسے اب تک بالکل ہی نظر انداز کیا جاتا رہا ہے۔ اسلام نے جس حیرت انگیز تیزی سے توسیع حاصل کی اور اس کے آغاز ہی میں شہری مملکتِ مکہ کے "غیر مہذب اور غیر تعلیم یافتہ" باشندوں سے جتنے کثیر غیر معمولی طور سے قابل مدبر پیدا ہوئے، وہ ایسے حقایق ہیں جن کے کچھ نہ کچھ پس منظر کا ہونا ناگزیر ہے۔ نپولین (ناپولیون) نے یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ عرب مسلمانوں کی بہادری کا راز غالباً اس واقعے میں پوشیدہ تھا کہ اسلام سے پہلے ان میں بڑے طویل عرصے سے خانہ جنگیاں ہوتی رہی تھیں جنھوں نے ان میں بعض اوصاف پختہ کر دئے ہوں گے[۱]۔ ۱۹۳۵ء میں سوربون (پارس) میں ایک پبلک لکچر دیتے ہوئے میں نے یہ چیز واضح کرنے کی کوشش کی تھی کہ آغازِ اسلام کے وقت پورے جزیرہ نمائے عرب میں ایک معاشی وفاق قایم ہو چکا تھا جس کا باعث وہاں کے سالانہ میلے اور وہاں کے کاروانوں کا نہایت ترقی یافتہ نظام خفارہ (بدرقہ) تھے۔ بہ ظاہر یہ معاشی وفاق نیز یہ واقعہ کہ پورے ملک میں ایک ہی بولی بولی جاتی تھی، ایک ہی طرح سے وہ تال دیکھا کرتے تھے، مختلف بتوں یا دیوتاؤں کو وہ مشترکہ طور سے مانتے تھے، اور بڑی حد تک ان کے رسم و رواج بھی یکساں ہی تھے۔ اس لئے ان چیزوں نے سیاسی اتحاد کے لئے بہت کچھ

---

[۱] ناپولیوں کی نوشتہ فرانسیسی "یادداشت، جزیرہ سینٹ ہیلینا" جلد ۲ ص (۱۸۳)

زمین ہموار کر دی، اور جب اسلام آیا تو اس نے جزیرہ نمائے عرب کے مزاج میں بڑی تیزی سے ایک مرکزیت پیدا کر دی۔ اب میں ایک دوسرا نظریہ اضافہ کرتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ شہر مکہ کے باشندوں نے اپنی شہری مملکت کے لئے ایک ترقی کناں دستور، اسلام سے خاصا عرصہ قبل بنا لیا تھا۔ جس کے ذریعے سے ان کو اس بات کی تربیت مل چکی تھی کہ آئندہ اسلامی دَور میں عربی شہنشاہت کے نظم و نسق کو چلا سکیں۔ یہ شہنشاہت تیس ہی سال کے عرصے میں مدینے کی چھوٹی سی شہری مملکت سے پھیلتے ہوئے رومی ایرانی اور دیگر حکومتوں پر ایشیا، افریقہ اور یورپ کے تین برّاعظموں میں چھا گئی تھی۔ چنانچہ یورپ کے سلسلے میں یہ ایک تاریخی واقعہ ہے کہ ۲۷ھ مطابق ۶۴۷ء میں خلیفۂ سوم حضرت عثمانؓ کے زمانے میں اسلامی فوجیں اسپین میں گھس چکی تھیں اور کئی نسلوں کے بعد طارق کے آنے اور فتح کو مکمل کرنے تک وہیں قابض و مقیم تھیں۔[۱]

عرب کی شہری مملکتوں کا مطالعہ ابھی کچھ سنجیدہ طور سے شروع نہیں کیا گیا ہے۔ اس غرض کے لئے میں مکے کے سوا کسی اور شہر کا بھی انتخاب کر سکتا تھا، مثلاً طائف، دومۃ الجندل، تیمار، سبا، عدن

---

[۱] تاریخ طبری ۲۷ھ ص ۲۸۱۷ نیز دیکھئے گبن کی انگریزی تاریخ "انحطاط و زوال روما" جلد ۵ ص ۵۵۵ مطبوعہ آکسفرڈ یونیورسٹی پریس۔

صحارو غیرہ لیکن مکے کے انتخاب کے ایک سے زیادہ وجوہ ہیں، مثلاً مکے کے متعلق ہمارے معلومات دیگر شہروں کے مقابلے میں زیادہ یقینی اور زیادہ کثیر ہیں۔ مکہ اسلام کا گہوارہ تھا، یہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پیدا اور بڑے ہوئے تھے، یہیں آپ کی تبلیغی زندگی کا بڑا حصہ صرف ہوا تھا، اور اولین اسلامی شہنشاہت کی قریب قریب تمام نمایاں ہستیاں اسی شہر میں پیدا ہوئیں، اور یہیں تربیت پائی تھیں، مزید براں یہی وہ شہر تھا جس پر قبضے کے لئے تین ہم عصر شہنشاہتوں میں رقابت چلی آتی تھی، رومی، ایرانی اور حبشی، تینوں اس پر قبضے کے خواہشمند تھے۔ اگر کتاب التیجان کے مؤلف ابن ہشام کی بات پر یقین کیا جائے تو سکندر ذوالقرنین[۱] تک نے ضروری خیال کیا تھا کہ اس شہر کے معبد یعنی کعبے کی زیارت کرے[۲]

---

[۱] میرے خیال میں ذوالقرنین (یعنی دوسینگوں والا) کا لقب سکندر اعظم کو عربوں کی طرف سے دئے جانے کا اصلی باعث یہ تھا کہ مقدونیہ والے ایک ٹوپی پہنا کرتے تھے جس کی دوسینگیں ہوتی تھیں۔ ان کا یہ قومی لباس اب تک باقی ہے، چنانچہ ۱۹۳۴ء میں جب یوگوسلانیا کے بادشاہ الگزنڈر کو مارسیلز میں قتل کر دیا گیا تو اس کی لاش کے بازو اس کے تمام شاہی زیوروں وغیرہ کے ساتھ اس کی دوسینگوں والی ٹوپی بھی رکھی گئی تھی۔ ("الروم ذات القرون" کی اصطلاح کے لئے دیکھئے بلاذری کی فتوح البلدان طبع مصر ص ۵)

[۲] نیز دیکھئے عینی شرح بخاری ۳۶۵/۶ اور ازرقی کی اخبار مکہ برموقع،

ابھی بیان ہوا کہ رومی، ایرانی اور حبشی تینوں سلطنتیں مکّے پر قبضے کی خواہشمند تھیں چنانچہ رومیوں کے سلسلے میں یہ ایک واقعہ ہے کہ ایلیوس گالوس کے زمانے سے نیرو کے زمانے تک ہر رومی شہنشاہ کی یہ تمنا رہی کہ اپنا اثر و نفوذ کسی طرح مکّے تک پھیلا دے چنانچہ اس کے لئے متعدد کوششیں عمل میں لائی جاتی رہیں[۱۵]۔ ابن قتیبہ کی بات پر اگر اعتبار کیا جائے تو قیصر روم نے خود قصی کو مدد دی تھی کہ مکّے پر وہ قبضہ کر لے[۱۶]۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ بعد میں قصی نے خود مختاری برتنی شروع کر دی اور رومی مفادات نظر انداز کرنے شروع کر دیئے۔ چنانچہ چند نسلوں بعد جب مکّے کے عثمان بن الحویرث الاسدی نے عیسائیت قبول کی تو قیصر روم نے اسے ایک تاج شہریاری سے سرفراز کیا اور ایک فرمان دے کر مکہ روانہ کیا جس میں حکم تھا کہ مکّے والے اُسے اپنا بادشاہ تسلیم کرلیں۔ عثمان کے لئے بڑے اچھے مواقع حاصل تھے کیونکہ مکّے والے غلہ اور دیگر ضروریات اور نیز اپنے تجارتی کاروانوں کے لئے مصر، فلسطین اور شام کے رومی صوبوں کے دست نگر تھے اور وہ آسانی سے فرمان قیصری کو نظر انداز نہیں کر سکتے تھے۔ لیکن عین لمحۂ آخر میں عثمان ہی کے ایک رشتہ دار نے جلسے میں اٹھ کر اعتراض کرنا شروع کر دیا اور کہا کہ مکّے کے آزاد باشندے

---

[۱۵] لانس کی فرانسیسی کتاب "مکہ ہجرت سے پہلے" صفحہ ۲۳۹ و ۲۴۳۔

[۱۶] معارف ابن قتیبہ طبع یورپ ص ۳۱۳۔

بادشاہت اور راہبانیت کی بدعتوں کو کیسے قبول کر سکتے ہیں، اور اس خیال کا خوب ہی مضحکہ اڑایا اور روم کے دم میں جلسے کی رائے بدل گئی۔ عثمان بیزار ہو کر شام واپس چلا گیا اور قیصر روم نے اس کا بدلہ یوں لیا کہ اپنی قلمرو مکے والوں کے لئے بند کر دی اور ان کے جو تاجر اس وقت وہاں تھے ان کو قید کر لیا[1] (یہ واقعہ غالباً اس کے بعد پیش آیا ہوگا جب قیصر نے آنحضرت صلعم کے پردادا ہاشم کو اس بات کا منشور عطا کیا تھا کہ وہ تجارت کے لئے شام آیا کریں، نیز ایک سفارشی خط نجاشیِ حبش کے نام دیا تھا کہ وہ بھی مکے والے کاروانوں کو اپنے ملک میں آنے دیا کرے[2]) قیصر اس وقت اس سے زیادہ اور کچھ نہ کر سکا کیونکہ ایران سے جنگ چھڑ گئی تھی۔ الواحدی نے کتاب اسباب النزول[3] میں بیان کیا ہے کہ مدینہ کا ابو عامر راہب وہاں والوں کو یہ کہہ کر دھمکایا کرتا تھا کہ "میں قیصر کی فوجیں بلوا لوں گا"۔

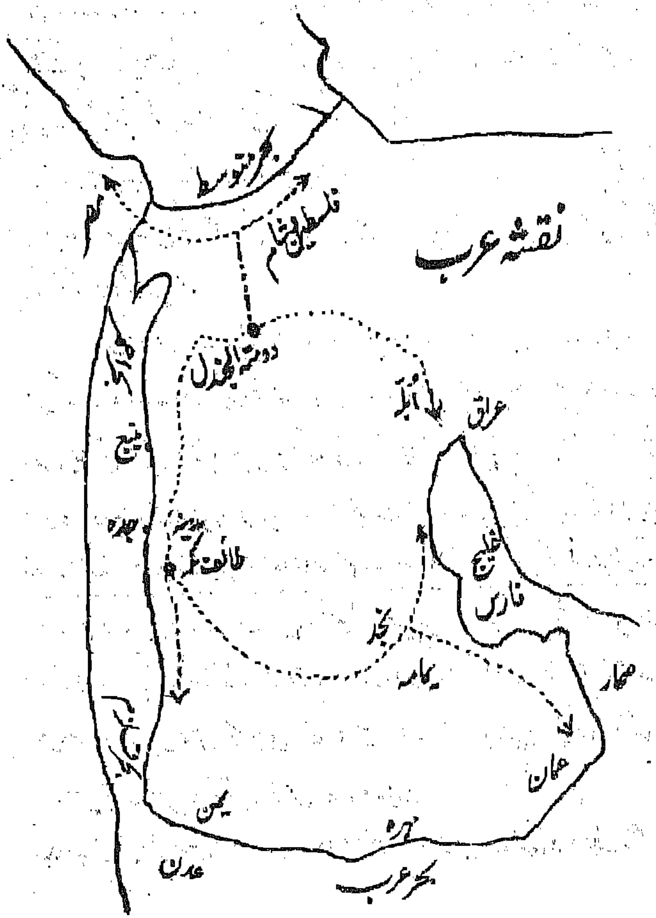
---

[1] الفاسی طبع یورپ ص ۱۴۴ سہیلی کی الروض الانف $\frac{1}{۱۴۴}$ لامنس کی مذکورہ بالا کتاب مکہ ص ۲۶۷، اشپرنگر کی جرمن سیرۃ و تعلیمات محمدی جلد ۱ ص ۸۹ تا ۹۰۔

[2] تاریخ یعقوبی $\frac{1}{۲۸۰}$ تاریخ طبری ص ۱۰۸۹، طبقات ابن سعد جلد ۱ حصہ اول ص ۴۳ تا ۴۵، لسان العرب تحت کلمہ "ایلاف" لامنس کی مذکورہ کتاب مکہ ص ۱۲۸۔ نیز تفسیر طبری وغیرہ میں سورۂ ایلاف کی تشریح۔

[3] اسباب النزول ص (۱۹۵)

قریش کا رحلۃ الشتاء والصیف یا کاروانی راستے



ایرانیوں کے سلسلے میں تاریخیں بتاتی ہیں کہ یمن کی فتح کے بعد وہ خیال کرنے لگے تھے کہ خود بخود ان کے اقتدار میں آچکا ہے چنانچہ خسرو ایران نے ایک مرتبہ گورنر یمن کے نام حکم لکھ بھیجا تھا کہ جناب رسالت آب صلی اللہ علیہ وسلم کو ایران جا کر شہنشاہ سے ملنے کی ہدایت کرے اور اگر رسول عربی اس سے انکار کریں، تو آپ کو گرفتار کر کے مدائن روانہ کرے[1]

حبشیوں کے سلسلے میں مشہور واقعہ ہے کہ انہوں نے مکے پر ایک چڑھائی کی تھی[2] جس میں ابرہہ اپنے مشہور ہاتھی محمود[3] کے ساتھ کمان کر رہا تھا۔

اس قسم کے بے شمار تذکرے عرب مؤلفین کے ہاں ملتے ہیں کہ مکے کے اور دیگر اقطاع عرب کے معززین قیصر روم، کسریٰ ایران، نجاشی حبش وغیرہ بیرونی حکمرانوں کے ہاں باریاب ہوا کرتے تھے ان واقعات سے بھی اس بات کا ثبوت مل سکتا ہے کہ یہ حکمران جزیرہ نمائے عرب کے اندرونی حصے میں مسالمانہ ذرائع سے اپنا اثر بڑھانے کی کوشش کیا کرتے تھے

---

[1] تاریخ طبری صفحہ ۱۷۲۵ و مابعد [2] دیکھئے کسی تفسیر میں سورۂ فیل نیز فرانسیسی رسالہ ژورنال آزیاتیک سنہ ۱۹۱۱ء صفحہ ۵ تا ۳۶ اور اطالوی رسالہ R.S.O جلد ۹ صفحہ ۴۷۳ و مابعد میں کونتی روسینی کے مضامین عرب میں حبشیوں کی خانہ جنگیوں کے متعلق نیز لامنس کی کتاب مکہ ص ۲۸۰ و مابعد۔

[3] سیرۃ ابن ہشام ص ۲۹ و مابعد۔ معلوم نہیں کہ حبشیوں نے محمود کا (بقیہ ص ۱۹ پر)

جغرافیہ شہر | جزیرہ نمائے عرب کا شمالی و مغربی حصہ زیادہ تر بنجر اور صحرا ہے۔ ایک چھوٹا سا نخلستان اور چشمہ بھی ہو تو لوگوں کو وہاں آکر بس جانے کے لئے کافی ہوتا ہے اور اگر کسی بڑی تجارتی شاہراہ پر ایسے قدرتی انتظامات پائے جائیں تو وہاں کسی بستی کے بس جانے کے لئے اور بھی زیادہ سہولت ہوتی ہے کہ کاروانی راستوں پر ایک اہم اسٹیشن تھا اور کہتے ہیں کہ حضرت ابراہیم کے زمانے میں یہ ایک آباد شہر تھا جہاں وہ آیا جایا کرتے تھے عرب مؤلفین ہمیں یقین دلاتے ہیں کہ اس زمانے میں گھنے جنگل اور اچھی چراگاہیں اس وادی میں پائی جاتی تھیں جہاں مکہ بسا ہوا ہے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے جد اعلیٰ قصیٰ نے جنگل کا بڑا حصہ صاف کر دیا تاکہ اپنے اور اپنے قبیلے والوں کے گھروں کے لئے معبد کعبہ کے اطراف جگہ فراہم کی جائے۔ بعد کے زمانوں کے متعلق بھی ہمیں اسی طرح کے

(بقیہ نوٹ صفحہ ۱۸) عربی نام کیوں رکھا گیا۔ شاید یہ لفظ MAMMOTH کا معرب جو ایک گراں ڈیل قسم کے ہاتھی کو کہتے ہیں۔

۱؎ ازرقی اخبار مکہ صفحہ ۴۴ نیز کتاب الاغانی ۱۳/۱۰۸

۲؎ سیرۃ ابن ہشام ص ۸۰ تاریخ طبری ص ۱۰۹۷ قطب الدین الاعلام باعلام بلد اللہ الحرام ص ۴۴

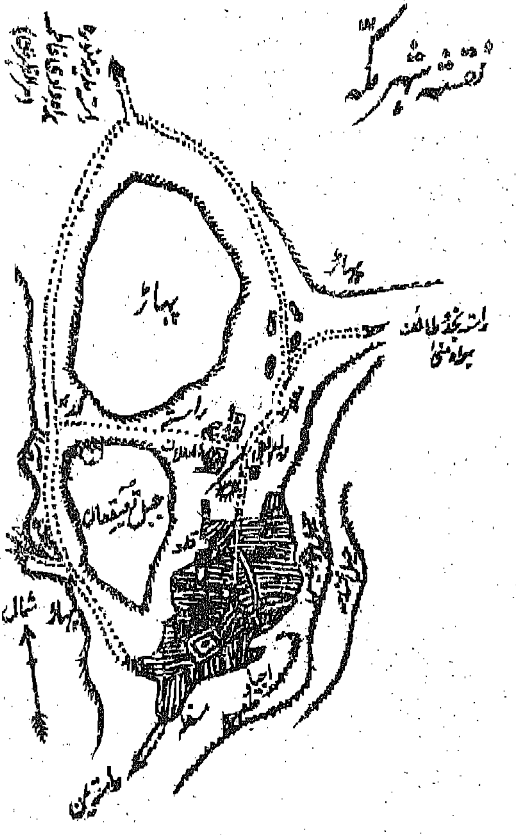
ثبوت ملتے ہیں[1]۔ خود آج بھی ابراہیم کی رباط مکہ معظمہ میں اتنی شاندار ہے کہ وادی غیر ذی زرع[2] کے کسی مکان کی جگہ کبھی کے ملبیار کے کسی قصر سے شاید ہے۔ مکہ تجارت کے لئے شام، یمن، اور طائف و نجد جانے والے کاروانوں کا جنکشن تھا۔ اور چشمۂ زمزم کے قریب آباد ہوا تھا۔ اور ہر طرف بلند اور ناقابلِ تسخیر پہاڑیوں نے اسے جنگی نقطۂ نظر سے بھی محفوظ بنا دیا تھا۔ اس کی ابتدائی تاریخ بہت دھندلی ہے، وہاں کی سیاسی زندگی سے آئندہ باب میں بحث ہوگی جس مقام پر اور جس طور سے شہر بسا تھا اُس کی کچھ تفصیلیں یہاں بیان کی جاتی ہیں۔

قدیم یونانی شہروں کے دو حصے ہوتے تھے "پولس" اور "استو" یعنی بلند اور پست حصہ۔ اسے شہر نامعلوم زمانے سے، مکہ بھی دو حصوں میں بٹا ہوا ہے: معلاۃ اور مسفلہ اور یہ تقسیم آج تک پائی جاتی ہے کسی قدیم زمانے میں ان دونوں حصوں کا نام بکہ اور مکہ رہا ہوگا۔

---

[1] جرہمی دور کے لئے دیکھئے ازرقی کی اخبار مکہ ص ۴۷

[2] قرآن مجید ۱۴/۳۷ میں مکے کے جائے وقوع کو یہ نام دیا گیا ہے، کیونکہ وہاں کوئی زراعت نہیں ہوتی۔ اگرچہ حالیہ زمانوں میں نہر زبیدہ کے باعث شہر میں سرسبزی نظر آنے لگی ہے، اور سعودی دور میں باغات بھی ترقی کرنے لگے ہیں۔


پہاڑ
شمال

چنانچہ ازرقی[1] نے اپنی تاریخ مکہ میں بیان کیا ہے کہ بکہ وہ مقام ہے جہاں مسجد تعمیر ہوا ہے، اور مکہ پوری بستی کا نام ہے۔ قرآن مجید میں بھی اس کی تائید ہوتی نظر آتی ہے۔ چنانچہ ایک آیت میں ہے:۔ وہ پہلا گھر جو لوگوں کے لئے (بغرض عبادت) بنایا گیا وہ وہ ہے جو بکہ میں ہے۔[2] اور ایک دوسری آیت میں ہے:۔ یہ وہی تھا جس نے ان کو تم پر حملہ کرنے سے وادی مکہ میں روک دیا تھا۔[3] مکتین[4] (دو مکے) کی اصطلاح قریتین[5] (دو شہر) کے معنوں میں ابن ہشام نے استعمال کی ہے جس سے مکہ اور طائف کی دو مشہور بستیاں مراد لی گئی ہیں۔ اس سے بھی اس خیال کی مزید تائید ہوتی ہے۔

ظاہر ہے کہ مؤذنین معلات میں رہتے تھے اور شہر کی عبادت گاہ اور قبرستان بھی وہیں آباد تھے۔ تاریخ ہمیں یقین دلاتی ہے۔[6]

---

[1] اخبار مکہ ص ۱۹۶ سطر ۱۲ بکہ موضع البیت و مکۃ القریہ۔

[2] قرآن مجید ۳/۹۶

[3] قرآن مجید ۴۸/۲۴،

[4] سیرۃ ابن ہشام ص ۲۱ و ۵۱۹،

[5] قرآن مجید ۴۳/۳۱ نیز کامل المبرد ص ۲۹۱، بلاذری کتاب (انساب الاشراف) مجلد اول لاطینی ص ۳۴ و ۳۵،

[6] سیرۃ ابن ہشام ص ۸۰

کہ جب قصی نے مکے پر قبضہ کر لیا تو اپنے تمام رشتہ داروں کو ظواہر یعنی مضافات شہر سے بطحا یعنی مرکز شہر میں منتقل کر دیا تھا اور آباد کیا تھا[۱] یعنی کعبے کے سامنے ہی دار الندوہ تعمیر کیا جس کا نام دارالندوہ یعنی مشورہ گاہ رکھا گیا[۲]۔ مکے کی عبادت گاہ یعنی الکعبہ دیوتاؤں کا ایک آماجگاہ (دیوستھان) (PANTHEON) بن گیا تھا، جہاں اصنام[۳] تھے۔ جو مختلف قبائل[۴] کے معبودوں کی نمائندگی کرتے تھے۔ لات اور عزیٰ[۵] اصل میں بالترتیب طائف اور نخلہ کے لوگوں کی دیویاں تھیں اور کعبے کے احاطے میں بھی ان کے مثنے DUPLICATES پائے جاتے تھے، اور مکے والوں کے نزدیک بھی ان دیویوں کا بڑا احترام تھا[۶]۔

---

[۱] قطب الدین کی کتاب مذکورہ ص ۴۳

[۲] ازرقی کی اخبار مکہ ص ۷۵ تا ۷۶ ۔ ابو نعیم کی المنتقی مخطوطہ بزم ادب حیدر آباد دکن ورق نمبر ۱۳۰۵ تا ۱۲۰۹

[۳] دیوتر سلے کی فرانسیسی کتاب ص ۱۰۱ عمود اوّل

[۴] یہ بت بہت چھوٹے ہوں گے، چنانچہ تاریخ طبری ص ۱۳۹۵ اور کتاب الاغانی ۱۵/۱۴ سے معلوم ہوتا ہے کہ جنگ احد کے دن ابو سفیان ان کو اٹھائے لئے جا رہا تھا

[۵] سیرۃ ابن ہشام ص ۵۵ کلبی کی کتاب الاصنام بر موقع۔

یونانی شہروں ہی کی طرح[1] مکے کے اطراف بھی ایک ماتحت سرزمین تھی، جسے حرم کہتے تھے اور جو تخمیناً سوا سو مربع میل پر مشتمل تھی[2]۔ اسلام نے حدود حرم میں مزید توسیع کر دی اور شہر کی وہ سرحدیں قرار دیں جو اب "میقات" کہلاتی ہیں اور جہاں سے حاجیوں کو اپنا معمولی لباس اتار کر احرام پہننا پڑتا ہے۔ (دیکھئے نقشہ حدود حرم مکہ، چند ورق بعد۔

یہ نہیں معلوم ہوتا کہ اس زمانے میں مکے میں کوئی بازی گاہ، گھوڑ دوڑ کا میدان، کسی مہم پر روانہ ہونے کے لئے فوج کا اجتماع گاہ اور محصورہ و محفوظ چراگاہیں (حمٰی) تھیں یا نہیں، مدینے وغیرہ دوسرے شہروں کی حد تک البتہ ان چیزوں کا کافی پتہ چلتا ہے۔ مکے کے ایک محلے کا نام "اجیاد" ہے جس کے معنی اچھی نسل کے گھوڑوں کے ہیں۔ اگرچہ یاقوت وغیرہ اس کی وجہ تسمیہ کچھ اور بتاتے ہیں۔ لیکن ممکن ہے کہ اس کو

---

[1] فلیس کی انگریزی کتاب "قدیم یونان اور روما میں بین الممالک قانون اور رواج" جلد ۱ ص ۴۸ اور فاؤلر کی انگریزی کتاب "شہری مملکت" بر موقع، ہیالیڈے کی ہسٹری آف دی ورلڈ شایع کردہ ہیامرٹن باب یونانی شہری مملکتیں صفحہ ۱۱۰۷،

[2] حدود حرم کا جو ذکر ازرقی ۳۶۰ تا ۳۶۱، اور احمد ابن محمد الخضراوی کی العقد الثمین فی فضائل البلد الامین، مطبوعہ قاہرہ سنہ ۱۲۹۰ء ص ۱۲۱۳ میں ہے۔ اس سے یہ اندازہ کیا گیا۔

گھوڑ دوڑ سے بھی کچھ تعلق رہا ہو۔

پروفیسر ہیا لیڈ سے نے یونانی شہری مملکتوں پر اپنے دلچسپ مضمون میں لکھا ہے کہ:-

"جب وہ پرآشوب دَور ختم ہو گیا جس میں ترک وطن کے عظیم الشان سلسلے جاری تھے تو بجائے اسکے کہ جنگ ایک عادتی حالت سمجھی جائے ہمہ گیر امن کا دَور دَورہ ہو گیا اور خانہ بدوشی کی جگہ بستیوں میں توطن اختیار کیا جانے لگا۔

لیکن یہ شہر کس طرح وجود میں آئے؟ قدیم ترین بستیاں بلا شبہ گاؤں میں ہوئی ہوں گی .... بہرحال عام طور پر چند دیہات کے مجموعے نے اس چیز کو مناسب پایا ہو گا کہ کسی پہاڑ، یا خود میدان میں اچھی طرح مدافعت کئے جانے کے قابل مقام کو قلعہ بنا کر مستحکم کر لے تاکہ اگر کسی موسم گرما کی لوٹ کے لئے نکلی ہوئی ہمسایوں کی ٹکڑی آن پڑے تو اپنے بیوی بچوں اور جانوروں کو وہاں حفاظت کے لئے بھیج سکیں .... اس قلعے میں دیوتا کا مندر اور بادشاہ کا محل بھی عموماً ہوا کرتے تھے۔ اس کے بعد ایک نیا رجحان یہ پیدا ہوا کہ عوام اپنے دیہات کو چھوڑ کر پناہ لینے کے لئے شہر کے قریب رہنے لگیں اور وہاں سے روزانہ اپنے کھیتوں کو جانے لگیں۔ معززین کو یہ مناسب معلوم ہوا کہ بادشاہ کے آس پاس اور حکومت کے مرکز میں رہیں۔ اس طریقے سے بلند حصّۂ شہر یا قلعہ کے

اطراف ایک پست حصہ شہر آباد ہونے لگا اور رفتہ رفتہ پست حصہ شہر کے اطراف ایک شہر پناہ یا فصیل بھی تعمیر ہونے لگی۔[1]

قریب قریب یہی صورت حال حجاز کی بھی تھی۔

مکہ جس مقام پر آباد ہے وہاں ایک گہری وادی ہے جس کے چاروں طرف اونچے اور ناقابلِ عبور پہاڑ ہیں۔ شہر میں صرف ایک شاہراہ ہے جو ایک طرف سے داخل ہو کر دوسری طرف نکل جاتی ہے۔ ذیلی راہیں شہر میں آنے جانے کے لئے صرف دو ہیں۔[2] یہاں کے باشندوں کو اس بات کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی کہ کوئی فصیل بھی تعمیر کریں، اس کے باوجود ہمیں قطب الدین کی تاریخ مکہ میں حسبِ ذیل ذکر ملتا ہے۔

> قدیم زمانوں میں مکے میں بھی شہر پناہ کی دیواریں پائی جاتی تھیں، چنانچہ معلاۃ کے رخ جبل عبداللہ بن عمر اور اس کے سامنے کے پہاڑ کے مابین ایک وسیع دیوار پائی جاتی تھی، اس میں ایک دروازہ تھا جس پر لوہے کے پتر چڑھے ہوئے تھے، یہ ہندوستان کے ایک بادشاہ نے امیر مکہ کے پاس بطور تحفہ روانہ کیا تھا .... ایک اور دیوار مسفلہ کے رخ میں بھی درب الیمن نامی محلے میں تعمیر کی گئی تھی .... تقی الفاسی نے بیان کیا ہے کہ معلات میں مذکورہ بالا

---

[1] ہسٹری آف دی ورلڈ ص ۱۱۲۔

[2] مرآۃ الحرمین ج ۱ نیز دیکھئے کوئی نقشہ شہر مکہ۔

دیوار کے علاوہ ایک اور دیوار بھی تھی .... لیکن مجھے معلوم نہیں کہ مکے کی یہ دیواریں کب تعمیر ہوئی تھیں۔ نہ یہ کہ ان کو کس نے تعمیر کیا تھا۔ اور نہ یہ ہی کہ ان کی مرمت کس نے کی تھی۔" میں نے بعض تاریخوں میں دیکھا ہے کہ عباسی خلیفہ المقتدر کے زمانے میں ایک دیوار پائی جاتی تھی۔[1]

یہ دیواریں غالباً اسلام سے پہلے کی دیواروں کی جگہ نئے سرے تعمیر کی گئی ہوں گی۔ وادی مکہ میں سب سے کشادہ اور مسطح مقام شروع ہی سے قومی عبادت گاہ کے لئے محفوظ رہا۔ عرب مؤلفات[2] ہمیں یقین دلاتے ہیں کہ اس وادی کے پرانے باشندے اتنے وہمی تھے کہ بیت اللہ (کعبہ) کے قریب اپنے رہنے کے لئے کوئی عمارت تعمیر کر لینی روا نہیں رکھتے تھے مکانات انھوں نے مضافات شہر میں بنوائے اور کعبے کے قریب صرف خیمے لگائے جاتے تھے۔ مورخین کا یہ بھی بیان ہے کہ وہ پہلا شخص جس نے عبادت گاہ کے اطراف گھر تعمیر کئے، وہ قصی تھا۔ اس جدت یا بدعت پر عوام کو آمادہ کرنے کے لئے اس نے یہ استدلال کیا کہ:-

---

[1] قطب الدین کی کتاب مذکورہ بالا ص ۷

[2] تاریخ طبری ص ۱۰۹۷ نیز قطب الدین کی کتاب مذکورہ ص ۳۴

"اگر تم عبادت گاہ کے اطراف رہنے لگو تو لوگ تم سے ڈرا کریں گے
اور لوٹ مار کے لئے تم پر حملہ کرنے سے باز آجائیں گے"

یہ کہہ کر قصی نے سب سے پہلے خود ہی اپنے لئے مکان تعمیر کیا جس میں قومی مشورہ گاہ یعنی دار الندوہ بھی تھا۔ یہ کعبے کے شمالی رخ تعمیر ہوا...... اور کہتے ہیں کہ وہ اس جگہ تھا جہاں آج کل حنفی مصلےٰ[1] بنا ہوا ہے، مکے کی اس عبادت گاہ کے باقی تین طرف جو زمین تھی وہ قصی نے قریشی قبائل میں بانٹ دی جہاں انہوں نے اپنے رہنے کے گھر تعمیر کر لئے[2]۔

<u>سیاسی نظام</u> | مکہ پر خزاعیوں کی حکومت تھی قصی نے ان کے سردار کی بیٹی سے شادی کی اور جب وہ مر گیا تو قصی سرداری کی وراثت کا دعویدار بن گیا۔ قصی کا تعلق قبیلۂ قضاعہ سے تھا چنانچہ اس خانہ جنگی میں قبیلۂ قضاعہ نے قصی کی مدد کی اور اگر ابن قتیبہ کی بات پر یقین کیا جائے تو خود قیصر روم[3] نے بھی قصی کو مدد دی جس کا منشا بظاہر یہ تھا کہ جہاں تک ہو سکے عرب کے اندر اپنے اثرات بڑھائے اور ہندوستان سے خشکی کی راہ ہونے والی تجارت کے گزرگاہ کو اپنی نگرانی اور حفاظت میں لے لے۔

---

[1] قطب الدین کی کتاب مذکورہ ص۴۳۔ حنفی مصلے کے لئے آگے مسجد حرم کا نقشہ۔

[2] " " " "

[3] معارف ابن قتیبہ ص ۳۱۴ (مطبوعہ یورپ)

سرداری حاصل کرنے کے بعد قصی[1] کو وہاں متعدد سیاسی ادارے موجود ملے ہوں گے۔ مثلاً معبد کعبہ کی تولیت کا عہدہ وغیرہ، کوئی تعجب نہیں جو اس ذہین شخص نے خود بھی چند نئے ادارے قایم کئے ہوں تاکہ اپنے اقتدار کو محفوظ و مستحکم کرے، لیکن یہ معلوم کرنا مشکل ہوگا کہ قصی کے زمانے میں جن دس سرکاری[2] عہدوں کا مکے میں پتہ چلتا ہے، ان میں سے کتنے قصی کے قایم کردہ تھے اور کتنے قدیم ادارے ہی تھے۔ شہر میں ایک دار الندوہ[3] بنانا اور رفادہ[4] کے نام سے ایک سالانہ محصول باشندگان شہر پر عائد کرنا صراحت کے ساتھ قصی کی طرف منسوب کئے جاتے ہیں، ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ نسی، اجازہ اور افاضہ کے ادارے

---

[1] قصی کے حالات کے لئے دیکھئے مارٹن ہارٹ مان کا مضمون جرمن رسالہ اشوریات (Z. f. Assyriologie) جلد ۲۸ صفحہ ۴۳ تا صفحہ ۴۹۔

[2] ابن عبد ربہ کی العقد الفرید ۲/۴۵ تا ۴۶ اور زبیر بن بکار کی انساب قریش مخطوطہ استنبول، جس کا حوالہ لامنس نے اپنی فرانسیسی کتاب مجلس سہ گانہ (TRIUMVIRIT) ص ۱۱۴ میں دیا ہے۔

[3] ابن ہشام ص ۸۰ و ۸۳، طبری ص ۱۰۹۹، ابن سعد جلد اول ص اول، ص ۴۹، اور اخبار مکہ مطبوعہ یورپ مؤلفہ ازرقی ص ۶۵،

[4] سیرۃ ابن ہشام ص ۸۳، تاریخ طبری ص ۱۰۹۹، طبقات ابن سعد جلد ۱ حصہ اول ص ۴۱، جغرافیہ یاقوت تحت عنوان مکہ اخبار مکہ مطبوعہ یورپ ۱۴/۴۱ تا ۴۲

قدیم خاندانوں ہی کے ہاتھ میں رہنے دیئے گئے تھے[۵۱] بہرحال عام طور پر قصی کے ہاتھ میں چھ عہدوں[۵۲] کا ہونا بیان کیا جاتا ہے۔ یہی عہدے اہم ترین تھے اور آمدنی کا ذریعہ بھی اُن ہی سے تھا۔

ابن عبد ربہ[۵۳] اور دیگر مؤلف بیان کرتے ہیں کہ مکہ میں دس ہی سرکاری عہدے تھے جن کو دس قبائل کے سردار موروثی طور سے انجام دیا کرتے تھے[۵۴] ممکن ہے کہ یہ عہدے ابتدا میں دس ہی رہے ہوں جیسا کہ وینس اور پالمیرا میں تھا۔ چنانچہ شابو[۵۴] کے حوالے سے لامنس[۵۵] نے بیان کیا ہے کہ:

"دس ارکان کی ایک مجلس ہوتی تھی جو دس بڑے خاندانوں کے سرداروں پر مشتمل ہوتی تھی کتبوں سے معلوم ہوتا ہے کہ پالمیرا میں اس طرح کی ایک مجلس موجود اور کارفرما تھی جس کے علاوہ ایک مجلس عام یا سینیٹ بھی تھی جس کا اپنا صدر اور اپنا معتمد ہوا کرتا تھا مجلس دہگانہ اور سینیٹ قانون بناتے۔ قوانین مالی کے نفاذ کی نگرانی کرتے۔ اور ضرورت پر سزاؤں کے احکام دیتے............"

---

۵۱ تاریخ طبری ص ۱۱۳۴/۳، سیرۃ ہشام ص ۶۶، ۶۷، ۶۷ تا ۶۸۔

۵۲ ازرقی ص ۶۷ (الموسوعۃ)

۵۳ العقد الفرید ۲/۳۵ تا ۴۶

۵۴ شابو (CHABOT) کی فرانسیسی کتاب پالمیرا کے کتبوں کا انتخاب ص ۲۷ وغیرہ

۵۵ لامنس کی کتاب مکہ صفحہ ۶۹

جس کے بعد لامنس نے بیان کیا ہے:-

"یہ لاحاصل کوشش ہوگی کہ اس کے مماثل کسی ادارے کی تلاش ہم مکے کے نظام میں کریں۔"

حقیقت میں ہمیں دس سے بہت زیادہ اداروں کا پتہ چلتا ہے جن کی تفصیل عرب مؤلفوں کی کتابوں کی ورق گردانی پر معلوم ہو سکتی ہے۔ خود ابن عبدربہ نے اگرچہ صراحت سے بیان کیا ہے کہ مکہ میں سردار دس ہی تھے لیکن خود اسی مؤلف نے سترہ عہدوں کے نام گنائے ہیں اور بعض سرداروں کو ایک سے زیادہ عہدوں پر مامور بتایا ہے۔ ان سترہ عہدوں پر ہم موجودہ مواد سے چار پانچ اور عہدوں کا بڑی آسانی سے اضافہ کر سکتے ہیں، چنانچہ ان کی ایک فہرست یہ ہے:-

(۱) ندوہ	(۶) سقایہ	(۱۱) قبہ
(۲) مشورہ	(۷) عمارۃ البیت	(۱۲) عنۃ
(۳) قیادہ	(۸) افاضہ	(۱۳) رفادہ
(۴) سدانہ	(۹) اجازہ	(۱۴) اموال محجرہ
(۵) حجابہ	(۱۰) نسی	(۱۵) ایسار

(۱۶) اشناق (۱۷) حکومہ (۱۸) سفارہ (۱۹) عقاب (۲۰) لواء (۲۱) حلوان النفر۔

مجلس دہگانہ کے الجھے ہوئے مسئلے کو نظر انداز کر کے میں چاہتا ہوں کہ شہری مملکت مکہ کے دستور کی حفاظت اور کارکردگی کو

اپنے طور پر واضح کروں:-

چنانچہ اولاً آبادی یا شہریوں کو "جماعہ"[1] کا نام دیا جاتا تھا۔ یہ لفظ جناب رسالتمآب صلعم نے بھی برقرار رکھا اور اس سے مراد آپ کے زمانے میں آپ کے متبعین کی پوری جماعت ہوتی تھی، جو باقی دنیا سے ممتاز ایک وحدت تھی اور بحرین کے حکمران کے نام جو مکتوب نبوی گیا[2] اس میں بھی اسے دعوت دی گئی ہے کہ وہ اس "جماعت" میں شریک ہو جائے "ملت"[3] کا لفظ سیاسی سے زیادہ مذہبی مفہوم رکھتا تھا، قرآن مجید میں "قوم"[4] کا لفظ ایک وسیع معنوں میں استعمال ہوا ہے، اور اس میں نہ صرف عام رائے دہندگانِ شہر، بلکہ ایک حد تک جملہ ساکنین ملک شامل ہوتے ہیں۔ جن لوگوں کو حق رائے حاصل ہوتا تھا اور وہ شوریٰ عمومی میں حصہ لینے کے مجاز ہوتے تھے ان کو قرآن میں ہمیشہ "ملأ"[5] کے نام سے یاد کیا گیا ہے، اور یہ "ملأ" کی "تراضی" یعنی رضامندی ہی ہوتی تھی جس کے مطابق مقامی حکمران فیصلہ کرتا، چنانچہ قرآن مجید میں بھی لفظ

---

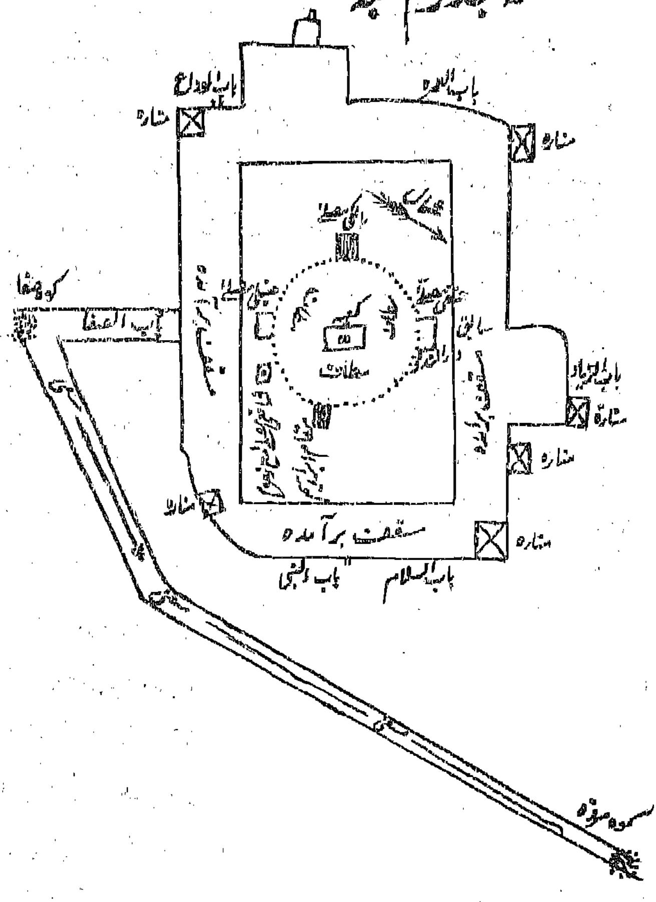
[1] مغازی واقدی صفحہ ۵۹ سطر ۳

[2] طبقات ابن سعد جلد ۲ حصہ اول ص ۲۷، میری فرانسیسی کتاب "اسلامی سیاست خارجہ بہ عہد نبوی و خلافت راشدہ" ص ۴۷، نیز میری الوثائق السیاسیہ برقم

[3] دیکھئے قرآن مجید ۲/۱۳۰، ۳/۹۵، ۴/۱۲۵ وغیرہ

[4] قرآن مجید ۷/۶۰ و ۶۶ و ۱۰۹ و ۱۲۷، ۱۱/۲۷ و ۳۸، ۲۳/۲۴ و ۳۳ وغیرہ

نقشہ مسجد حرم کعبہ



"راضی" استعمال ہوا ہے۔[۱]

قرآن مجید میں جہاں کہیں فرعون کی "ملا" کا ذکر ہے اس سے بنی اسرائیل خارج نظر آتے ہیں جن کو کوئی شہری حقوق حاصل نہ تھے۔ حضرت یوسف علیہ السلام کے زمانے میں جو عزیز مصر تھا اور حضرت سلیمانؑ کے زمانے میں جو ملکہ سبا تھی ان کے ہاں بھی قرآن مجید[۲] کے مطابق جو مجلس شوریٰ تھی اس کا نام "ملا" ہی تھا۔ اس مجلس میں "اولو قوۃ" یا اہل حل وعقد ہی ہوا کرتے تھے۔ اور اگر کوئی چیز نامناسب پیش آتی تو یہ مداخلت بھی کیا کرتے تھے۔[۳] پالمیرا میں جو مجلس شوریٰ تھی اس کے متعلق بھی ایسا ہی مواد ملتا ہے۔[۴]

مکہ میں جو دارالندوہ تھا اس میں صرف معمر اہل مکہ شریک ہو سکتے تھے۔ چنانچہ ازرقی[۵] اور ابن درید[۶] نے وضاحت سے بیان کیا ہے کہ دارالندوہ کے اجلاس میں صرف وہی لوگ شریک ہو سکتے تھے جن کی

۱؎ قرآن مجید ۲/۲۳۳ ، ۴/۲۹ ،

۲؎ قرآن مجید ۱۲/۴۳ ، ۲۷/۲۹ و ۳۲

۳؎ الفاسی کی اخبار مکہ ص ۱۰۹

۴؎ لامنس کی کتاب مکہ ص ۹۷

۵؎ ازرقی کی اخبار مکہ ص ۶۴ ، ۶۵ ، ۶۵ ، ۴۶۵

۶؎ کتاب الاشتقاق ص ۹۷

عمر کم از کم چالیس سال کی ہو، صرف حکمران شہر قصی کے بیٹوں کو یہ رعایت حاصل تھی کہ وہ عمر کی اس شرط سے مستثنیٰ تھے[1]۔ غالباً اسی حق رائے کی عمر چہل سالگی کی طرف اشارہ ہے، جو قرآن مجید میں "حَتّٰٓى اِذَا بَلَغَ اَشُدَّهٗ وَبَلَغَ اَرْبَعِيْنَ سَنَةً"[2] کے الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔ یہ قصی کے زمانے کا ذکر تھا۔ بعد کے زمانوں میں مختلف نرمیاں برتی جاتی نظر آتی ہیں، چنانچہ بیان کیا جاتا ہے کہ ابوجہل[3] کو تیس ہی سال کی عمر میں اس کی عمدہ رائے (الجود رائیہ) کے باعث دارالندوہ کے اجلاس میں شریک کیا جاتا تھا اور حکیم بن حزام[4] کو تو بیس یا پندرہ ہی سال کی عمر میں یہ عزت حاصل ہو گئی تھی، یونان کے شہر اسپارٹا میں تو مجلس شوریٰ واقعی مجلس معمرین تھی، چنانچہ ساٹھ سال[5] سے کم عمر کا کوئی شخص وہاں کی مقامی مجلس شوریٰ (GEROUSIA) میں شریک ہی نہیں ہو سکتا تھا[6]

---

[1] ازرقی ص ۶۴، ۶۵، ۴۶۵

[2] قرآن مجید ۴۶/۱۵

[3] ابن درید کی کتاب الاشتقاق ص ۹۷ سطر (۶)

[4] ابن عساکر کی تاریخ دمشق جلد ۴ ص ۴۱۹ سطر ۲

[5] اس کے مماثل ہندوستانی کہاوت "ساٹھا پاٹھا" کی طرف توجہ منعطف کرائی جاسکتی ہے۔

[6] پلوٹارک کی سوانحعمریاں دیکھئے لائیکرگس کے حالات، نیز وارڈ فاؤلر کی انگریزی کتاب "شہری مملکت" ص ۷۱ تعلیق ۳

قصی سے پہلے کے والے یا تو کسی کھلے مقام پر مشورے کے لئے جمع ہوا کرتے ہوں گے یا اپنے سردار کے خیمے میں۔ اس غرض کے لئے ایک مستقل عمارت بنانا قصی کے لئے مقدر ہو چکا تھا قصی ہی نے اسے دارالندوہ نام دیا تھا، اور جناب رسالت آب صلعم کے ملک الشعراء حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس نام کی یاد اپنے اشعار میں باقی رکھی ہے۱۔ یہ مشورہ گاہ کعبے کے شمال میں تعمیر ہوئی تھی لیکن زمانہ اسلام میں اُسے منہدم کر کے کعبے کے اطراف جو مسجد حرم تھی اس کی توسیع کے کام میں لایا گیا، یہ ظاہر ہے کہ اس مجلس کا انعقاد معینہ اوقات پر نہیں ہوتا تھا بلکہ وقتاً فوقتاً جب کبھی ضرورت پیش آئے ہوتا۲۔

اسی دارالندوہ میں مشورے ہوا کرتے، جنگوں کا اعلان کیا جاتا یا مدافعتی تدبیروں پر بحث و غور ہوتا۳۔ یہیں شادیاں بھی رچائی جاتیں اور تجارتی معاہدے طے ہوتے تھے۴۔ بیرونی مہمان آتے تو ان کی ضیافت بھی یہیں ہوتی تھی۵۔ نیلگری کے قدیم باشندوں کی طرح زمانۂ قبل اسلام

---

۱ دیوان حسان بن ثابت مطبوعہ یورپ نظم نمبر ۴۵ و ۱۸۳

۲ کتاب الاشتقاق مؤلفہ ابن درید ص ۹۷

(۳ چنانچہ مثال کے طور پر ہجرت سے قبل رسول کریم صلعم پر قاتلانہ حملہ کرنے کی پخت و پز بھی یہیں ہوئی تھی۔

۴ لامنس کی کتاب مکہ ص ۲۷

۵ مغازی واقدی شائع کردہ فون کریمر ص ۲۳ (نوٹ نمبر ۵ صفحہ ۳۷ پر)

سے مکے والے بھی ایک رسم کرتے جو لڑکی کے سن بلوغ کو پہنچنے پر انجام دی جاتی اور اسے ایک نئی اور پوری قمیص (درع) پہنائی جاتی، اور وہ بے نقاب آتی اور بے نقاب ہی جاتی، گھر پہنچنے کے بعد اس پر پابندیاں عائد ہو جاتیں۔ اس رسم کا منشا یہ تھا کہ لڑکی کے قابل نکاح ہونے کا اعلان کیا جائے اور خواہشمند آگاہ ہو کر رونمائی کے لئے پہنچیں یہ رسم بھی دارالندوہ ہی میں انجام پاتی[۵۱]۔

دارالندوہ شہر مکہ کا مرکزی دارالسلطنت تھا۔ اس کے علاوہ شہر میں جتنے محلے یعنی قبائلی آبادیاں تھیں اتنے ہی مجالس محلہ بھی تھے۔ ان کو "نادی" کہا جاتا تھا، جیسا کہ شہر مدینہ میں محلہ وار مجالس کو سقیفہ یعنی سقف و سائبان کا نام دیا گیا تھا۔ نادی اور دارالندوہ دونوں کے معنی ایک ہی ہیں۔ چنانچہ مشہور محدث و لغت نویس ابو عبید[۵۲] نے نادی اور ندوہ دونوں کا مادہ "ندا" ہونا بتایا ہے۔ قرآن مجید نے لفظ نادی کو جیسا کہ جاوید

(بقیہ نوٹ صفحہ ۳۶) ۵۰ کتاب نیاگری مؤلفہ حمید اللہ شائع کردہ مکتبہ ابراہیمیہ حیدرآباد دکن صفحہ ۱۹۔

۵۱ سیرۃ ابن ہشام ص ۸۰

۵۲ نادی بنی عبد مناف کا ذکر "قسامۃ" کے طریقہ عدل گستری کے آغاز کے سلسلے میں بھی آتا ہے۔ (دیکھئے کتاب المحبر مؤلفہ ابن حبیب ورق ۱۸۰ ب) نادی کے متعلق مزید تفصیلات کے لئے دیکھئے لامنس کی کتاب مکہ صفحہ ۸۸ و مابعد۔

۵۳ غریب الحدیث ورق نمبر ۱۹۱ (بحوالہ مکہ مؤلفہ لامنس ص ۷۳)

عطا کر دی ہے اور "فَلْيَدْعُ نَادِيَهُ"[1] اور "تَاْتُوْنَ فِیْ نَادِيْكُمُ الْمُنْكَرَ"[2] دو مرتبہ اس کا ذکر آیا ہے اور ماضی مضارع کے صیغے بھی ان کے علاوہ مستعمل ہوئے ہیں[3]۔ اِن نادیوں یا قبائلی مجالسِ محلّہ میں اجنبیوں کو معاہدے کے ذریعے سے مولا، یعنی فردِ خاندان بنانے کی رسم بھی انجام دی جاتی تھی[4]، اور کسی فردِ خاندان کو بے راہ روی وغیرہ پر جات باہر "طرد" یا "خلع" کرنے کا اعلان بھی وہیں کیا جاتا تھا[5]۔ محلّے والے اور بعض وقت دیگر محلّوں کے دوست بھی چاندنی راتوں میں یہاں جمع ہو کر مسامرہ یعنی شبانہ قصّہ گوئی کیا کرتے تھے[6]۔ تجارتی معاملات اور کاروانوں کی آمد یا روانگی بھی یہیں قبائلی نادیوں سے ہوا کرتی تھی۔

اتھینس (اثینا) کے متعلق جاوٹ (JOWETT) نے اپنی کتاب (TNUCYOIDES)[7] میں لکھا ہے کہ:-

---

[1] قرآن مجید ۹۶/۱۷

[2] قرآن مجید ۲۹/۲۱

[3] قرآن مجید میں نادٰی، نادوا، نادیتم، نادت، ینادی، تنادون، لنودی، تنادوا، نداء، ندیاً، منادی، تناد کے لفظ بھی بار بار آئے ہیں۔

[4] سیرت ابن ہشام ص ۲۴۳ و ۲۴۶ کتاب الاغانی ۱۴/۹۹

[5] اغانی ۸/۵۲ و ۵۴

[6] ازرقی کی اخبار مکہ میں ص ۷۷، ۱۰۳ اغانی ۱۳/۱۱۲ اور لامنس کی کتاب مکہ ص ۸۸ و مابعد تعلیق ۸

[7] دیکھئے جلد اول ص ۱۰۴ (بحوالہ وارڈ فاؤلر ص ۴۸ تا ۴۹)۔

قرقروپ (CERCROPS) اور ابتدائی بادشاہوں کے
زمانے میں حتیٰ کہ تیسیوس (THESEUS) کے زمانے تک
شہر اتینا مختلف محلوں میں منقسم تھا جن میں سے ہر ایک کے اپنے
مجالس محلہ اور مجسٹریٹ ہوا کرتے تھے۔ بجز اس کے کہ کوئی خطرہ
درپیش ہو، پورے شہر کی آبادی کا اجلاس جو بادشاہ کی
صدارت میں ہوتا، نہیں ہوتا تھا، بلکہ یہ لوگ اپنے معاملات
کا انتظام اپنے مجالس محلہ ہی میں آپس کے مشورہ سے
طے کر لیا کرتے تھے۔

مکے میں نقیب کا عہدہ بھی پایا جاتا ہے جسے منادی اور مؤذن کہتے تھے، (مؤذن اپنے ان ابتدائی معنوں میں اب تک شامی بدویوں میں مستعمل ہے[1]) جس کا کام یہ ہوتا تھا کہ مجالس کے انعقاد کا ڈھنڈورا پیٹے[2]۔ ہر قبیلے کے سردار کے پاس اس کے اپنے خصوصی ایک یا زاید منادی بھی ہوا کرتے تھے[3]۔ یہ منادی نہ صرف غیر معمولی انعقاد مجالس کی اطلاع مشتہر

---

[1] دیکھئے لامنس کی کتاب مکہ ص ۱۲۰ تعلیق ۳ نیز قرآن ۷/۴۲، ۲۲/۲۸
[2] ابو عبید کی کتاب الاموال ف ۴۵۵ سے معلوم ہوتا ہے کہ کم از کم سنہ ۹ ھ تک بھی ایسا ہی ہوتا تھا۔
[3] تاریخ یعقوبی جلد (۱) ص ۲۸۱ سطر ۱۴ نیز ص ۲۹۰ و ۲۹۲، لامنس کی کتاب مکہ ص ۶۴، ۶۵۔ اسی مؤلف کی فرانسیسی کتاب (بقیہ نوٹ صفحہ ۴۰ پر)

کرتے تھے بلکہ کسی تقریب یا دعوت میں دعوتیں پہنچانا، اور کسی فرد خاندان لٹنا کے جات باہر کئے جانے کی اطلاع اور محلوں میں بھی کرنا انھیں سے متعلق تھا۔ غیر معمولی صورتوں میں منادی کے علاوہ دیگر عام لوگ بلکہ اجنبی اشخاص بھی مجالس بلدیہ کے انعقاد کی اطلاع کے مجاز تھے۔ ایسی صورتوں میں اجنبی لوگ اپنے تمام کپڑے اتار دیتے اور کسی اونچے مقام پر بالکل برہنہ ہو کر دہائی دیا کرتے۔ عربی داں "النذیر العریان" کی اصطلاح سے اچھی طرح باخبر ہیں۔ بدر میں قریش کے کاروان پر آنحضرتؐ کے حملے کے خطرے کی اطلاع مکے میں ابوسفیان کے قاصد نے اسی طرح دی تھی۔

مورخین کے بیانوں سے معلوم ہوتا ہے کہ قصی پورے شہر کا ایک واقعی مطلق العنان اور با اقتدار بادشاہ تھا جس کا ہر لفظ قانون کا حکم رکھتا تھا۔[۵۱] بعد کی نسلوں نے شکر گزاری اور احسان مندی کے ساتھ اس کی یاد باقی رکھی اور اسے "مجمع" کا خطاب[۵۲] عطا کر دیا تھا۔ کیونکہ اسی نے جملہ قریشی قبائل کو جمع اور متحد کر کے شہر میں انھیں دیگر آبادی میں ایک امتیازی حیثیت عطا کر دی تھی قصی کی وفات کے بعد ایک اعیانیت قائم ہو گئی، کیونکہ خود قصی نے

(بقیہ ص ۳۹ کا) "گہوارہ اسلام" جلد ۱ ص ۲۲۹ کتاب الاغانی جلد ۱۱ ص ۶۵ سطر ۵، ابن درید کی کتاب الاشتقاق ص ۹۴، مفضلیات، مطبوعہ یورپ ۲/۳۔

۵۱ سیرت ابن ہشام ص ۸۴۔

۵۲ سیرت ابن ہشام ص ۸۰، تاریخ طبری ص ۱۰۹۵،

مختلف انتظامی عہدے اپنے مختلف بیٹوں میں بانٹ دیئے تھے[۱] اور
غالباً مشہور مجلس دیگانہ[۲] کا آغاز اسی طور سے ہوتا ہے جو زمانۂ اسلام تک
باقی نظر آتی ہے، اس میں بھی انکار نہیں کہ قصی کو مطلق العنان اختیارات
حاصل رہے ہوں گے اور اسکا کوئی حریف و مدمقابل نہ ہوگا، کیونکہ
اس نے اپنی قوم کے لئے بڑے بڑے کارہائے نمایاں انجام دیئے
تھے لیکن بعد کے زمانوں میں سید الناس[۳] وغیرہ کے القاب سے
کہیں ہم یہ خیال کریں کہ مکہ میں بھی مثلاً دمشق کی طرح کوئی دو جج
یا قائد و سردار ہوا کرتا تھا شہر مکہ کے عہدداروں میں ایک قیادہ[۴] بھی بیان
کیا جاتا ہے لیکن اس کا منشا کیا تھا پوری طرح معلوم نہیں ہوتا، ولہاوزن
بھی اپنے عالمانہ اور دلچسپ مقالے ....

(EINGEM SINWES E NOANEOBRIGKEN) (یعنی ایک سیاسی
اجتماعیت بغیر سرداری کے) میں اس نتیجے پر پہنچا ہے کہ شہر مکہ میں کوئی
فردی حکومت نہ تھی۔ اس میں شک نہیں کہ عرب کے مختلف حصوں

---

[۱] مسعودی کی التنبیہ والاشراف ص ۲۹۳

[۲] ابن عبد ربہ کی العقد الفرید جلد ۲ ص ۴۵، اور مسعودی کی مروج الذہب ۳/۱۱۹ تا ۱۲۰، ۳/۱۲۱

[۳] ازرقی کی اخبار مکہ ص ۶۴، لامنس کی کتاب مکہ ص ۶۹

[۴] ازرقی ص ۶۴

میں فردیت یا بادشاہت کی طرف رغبت پیدا ہو چلی تھی، چنانچہ اوپر بیان ہو چکا ہے کہ عثمان[1] بن الحویرث نے مکے میں بادشاہ بننے کی کوشش کی تھی. مدینے میں عبداللہ بن اُبی سلول کے لیئے تو تاج شہر یاری[2] کی تیاری تک کاریگروں کے سپرد ہو چکی تھی کہ اتنے میں جناب رسالت مآب صلعم کی ہجرت کا واقعہ پیش آیا اور پھر اس کے ساتھیوں کے لیئے اس کا موقع نہ رہا کہ کسی کو بادشاہ بنانے کی تجویز کر سکیں۔ اشپرنگر کو یقین تھا کہ "یہ لوگ یعنی عرب کے بدوی اپنی بدویانہ زندگی کے باوجود فردیت یعنی بادشاہت کی طرف میلان رکھنے لگ گئے تھے[3]

---

[1] روض الانف ۱/۱۴۶ ،

[2] (لیتوجوہ) صحیح بخاری ۷۹/۲۰ ، تاریخ طبری ص ۱۵۱۱ اور مابعد، سیرۃ ابن ہشام ص ۷۲۷، نیز قرآن مجید ۶۳/۸ کی تشریح کسی تفسیر میں ،

[3] اشپرنگر کی جرمن سیرۃ و تعلیمات محمدیہ ۱/۲۴۹ ،

(۲)

مذہبی نظام | اس قدیم زمانے میں جب ہر شخص اپنی آپ حفاظت کرنے پر مجبور ہوا کرتا تھا کسی ملک کا سب سے اہم کشوری انتظام وہاں کے معبد کا انتظام ہوا کرتا تھا۔ سدانہ، حجابہ، سقایہ اور عمارت البیت اسی سے متعلق تھے۔ ان کے علاوہ ایسار اور ازلام کے چرچے بھی ہم سنتے ہیں جن سے ڈیلفی وغیرہ کے یونانی مندروں کی دیوبانی (اوراکل) کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ اسی طرح وہاں ایسے بھی افراد پائے جاتے تھے جو ما فوق الفطرت طاقتوں کے مالک ہونے کا زعم کرتے تھے۔ جیسے عائف، کاہن، عرّاف، خرّیت، منجّم، بلکہ خود ان لوگوں کی بھی خاصی تعداد جو شاعر کہلاتے تھے۔ اور ان لوگوں کی مزعومہ قابلیتوں سے وقت بوقت زود یقین اہل ملک فائدہ اٹھایا کرتے تھے، وہاں کے لوگوں کا ہاتف پر بھی اعتقاد تھا، جو ایک نظر نہ آنے والے مگر آواز سے باتیں سنانے والے کا نام تھا، بھینٹ بھی چڑھائی جایا کرتی تھی۔ جسے قربان کا نام دیا گیا تھا۔ ملک کے دیگر عام اوہام کا تفصیلی ذکر شاید یہاں غیر ضروری ہوگا۔

سدانہ سے مراد معبد کی رکھوالی، اور حجابہ سے مراد معبد کی دربانی

ہوتی تھی، اور دروازے کی چابی پاس ہونے سے جس کو چاہے معبد کے اندر جانے دیا جا سکتا تھا، اور اس سلسلے میں دربان کو خاصی آمدنی بھی ہو جاتی تھی، یہ ایک مشہور واقعہ ہے کہ قصی نے کعبے کی دربانی کا عہدہ ایک مشک بھر شراب کے عوض خرید کر لیا تھا[۵۱]۔ اور یہ بھی ایک مشہور واقعہ ہے، کہ کس طرح جناب رسالت مآب صلعم نے فتح مکہ کے بعد دروازۂ کعبہ کی چابی وہاں کے قدیم موروثی دربان ہی کو واپس کر دینی مناسب خیال فرمائی تھی[۵۲]۔ یہ اب تک اسی خاندان میں چلی آ رہی ہے، اور سعودی دَور نے بھی تبدیلی نہیں کی ہے

سقایہ سے مراد کعبے کی زیارت کے لئے حج یا عمرے کے زمانہ میں آنے والوں کو پانی پلانا، اور عمارۃ البیت سے مراد حرم کعبہ کا انتظام کرنا تھا، ان دونوں چیزوں کا ذکر قرآن مجید میں بھی آیا ہے[۵۳]۔

حجاج کو پانی پلانا مکے میں بھی ایک منفعت بخش فریضہ ہوگا کیوں کہ وہاں پانی کی عام قلت ہے، اور زمزم کے کنویں کا مقدس پانی ہر حاجی کو بھی درکار رہتا ہوگا، پالمیرا میں ایک مماثل فریضے کی انجام دہی سے سالانہ آٹھ سو طلائی اشرفیوں کی معقول آمدنی ہو جایا کرتی تھی[۵۴]۔ غالباً مکے کے

---

۵۱ تاریخ طبری ص ۱۰۹۴

۵۲ دیکھئے سیرۃ نبوی کی کسی بھی کتاب میں فتح مکہ کے حالات۔

۵۳ قرآن مجید $\frac{9}{19}$

۵۴ پالمیرا کے کتبوں پر شابو کی فرانسیسی کتاب ص ۳۰ بحوالہ مکہ مؤلفہ لامنس۔

باشندے خود اس سلسلے میں کوئی فیس ادا کرنے سے مستثنیٰ رہتے ہوں گے۔ ابن عبدربہ نے بیان کیا ہے، کہ عمارۃ البیت کا مقصد یہ ہوتا تھا، کہ افسر متعلقہ وقتاً بوقتاً حرم کعبہ میں گھوم پھر کر نگرانی کیا کرے اور دیکھے کہ کوئی شخص جھگڑے، گالی گلوچ، یا بلند شور اور پکار سے اس کے تقدس کو ٹھیس نہیں پہنچا رہا ہے، اور ایک زمانے میں یہ فریضہ جناب رسالت مآب صلعم کے چچا حضرت عباسؓ انجام دیا کرتے تھے[۱]

مجھے معلوم نہیں کہ اسلام سے پہلے جو حج ہوا کرتا تھا، وہ بھی اتنے ہی ارکان و مراسم پر مشتمل ہوا کرتا تھا جتنا اب ہے، یا یہ کہ اس کی بعض چیزیں زمانہ اسلام کا اضافہ ہیں، اور وہ چیزیں اسلام سے پہلے حج سے الگ الگ مستقل حیثیت رکھتی ہوں۔ اس سلسلے میں یہ امر قابل ذکر ہے کہ قرآن مجید میں طوافِ کعبہ اور صفا اور مروہ کے درمیان سعی، دونوں کے لئے ایک ہی لفظ تطوّف یعنی طواف استعمال کیا گیا ہے (چنانچہ صفا و مروہ کے سلسلہ میں يَطَّوَّفَ بِهِمَا وارد ہوا ہے[۲] تو طوافِ کعبہ کے لئے لِيَطَّوَّفُوا بِالْبَيْتِ الْعَتِيقِ[۳] کے الفاظ آئے ہیں) اس کے باوجود صفا و مروہ کا طواف نہیں کیا جاتا بلکہ ان کے مابین سات مرتبہ آنا جانا پڑتا ہے۔ یہ چیز

---

[۱] العقد الفرید $\frac{۲}{۴۶}$،
[۲] قرآن مجید $\frac{۲}{۱۵۸}$،
[۳] ،، ،، $\frac{۲۲}{۲۹}$،

بھی قابل ذکر ہے، کہ صفا و مروہ کے سلسلے میں قرآن مجید نے لا جناح علیہ ان یطوف بہما یعنی "کوئی حرج نہیں، کہ ان دونوں کا طواف کیا جائے" کے الفاظ استعمال کئے ہیں، شاید پہلے ان کا بھی طواف ہوا کرتا تھا، جس طرح کہ کعبے کا، لیکن اب قرآن مجید کے اس حکم کی تعمیل، سنت نبوی کی روشنی میں طواف کی جگہ سعی سے کی جاتی ہے۔ حج کے سلسلے میں اضافہ و اجازہ[۱] بھی دو عہدے تھے، اور ان کو یہ اہمیت حاصل تھی، کہ عہدہ داران متعلقہ اور ان کے قبیلے والے سب سے پہلے روانہ ہو سکتے تھے، جب کہ بھیڑ بھاڑ کم ہوتی تھی، لیکن مجھے نسی کے عہدے پر زیادہ تفصیل سے کچھ عرض کرنا چاہیے[۲]

---

[۱] سیرۃ ابن ہشام ص ۷۶ و ما بعد

[۲] نسی یعنی قمری مہینوں کو کبیسہ کرکے شمسی بنانا عہد نبوی کی تاریخ پر جو اہم عملی اثرات ڈالتا ہے، اس کی تفصیل کے لئے دیکھئے رسالہ معارف اعظم گڈھ جولائی ۱۹۳۲ء میں میرا مضمون "عہد نبوی کے عربی ایرانی تعلقات"۔ اس موضوع پر عام معلومات کے لئے دیکھئے محمود آفندی کا (جو بعد میں محمود پاشا فلکی کے نام سے مشہور ہوئے) تحقیقی مقالہ فرانسیسی رسالہ ژورنال آزیاتیک ۱۸۵۸ء ص ۱۰۹ تا ۹۲ بعنوان "عربی تقویم پر ایک یادداشت"۔ یہ مقالہ عربی میں بھی چھپا ہے، موبرگ کا جرمن زبان میں جامعہ لونڈ واقع سویڈن میں چھپا ہوا مقالہ بعنوان "نسی اسلامی روایت میں" (بقیہ نوٹ صفحہ ۴۷ پر)

اسلام سے پہلے مکے والوں کا تمدن جسقدر افتادہ حالت میں تھا، اس کے باوجود انھیں شمسی اور قمری سالوں کا فرق محسوس ہو چکا تھا، چنانچہ ایک سرسری اندازے کے مطابق وہ ہر تیسرے سال ایک تیرھواں مہینہ بھی قایم کر لیا کرتے تھے، جو ذی حجہ اور محرم کے مابین ہوا کرتا تھا، کبیسہ بنانے کا یہ کام مختلف مراسم کے ساتھ انجام پاتا تھا، اور اس کا اعلان جس افسر کے فرائض میں داخل تھا وہ قبیلہ بنی فقیم سے تعلق رکھا کرتا، اور قلمس[1] یا قلنبس[2] کہلاتا تھا، شاید یہ لفظ Calendus (یعنی کیلنڈر والا) کا بگڑا ہوا ہے۔

کبیسہ بنانے کے سلسلے میں ہمیں اشہر حُرم یعنی حرام اور مقدس مہینوں کا بھی کچھ ذکر کرنا چاہیئے، دنیا کے دیگر ممالک کی طرح معبد کی زیارت کے لئے جو مذہبی حج ہر سال ایک معینہ زمانے میں کیا جاتا وہ ساتھ ہی ایک

(بقیہ نوٹ ص۴۶ کا) حوالوں اور اس موضوع پر شایع شدہ مقالوں اور کتابوں کی تفصیل کے لئے مفید ہے۔

[1] عام طور سے قلمس اس شخص کا لقب سمجھا جاتا ہے جس نے عرب میں کبیسہ سال رائج کیا، لیکن محمد بن حبیب نے کتاب المحبّر (مطبوعہ حیدرآباد) میں قلامسہ بصیغہ جمع بھی استعمال کیا ہے۔ نیز دیگر قدیم عرب مؤلفوں نے بھی۔

[2] یہ قلمس کا مترادف ہے۔ دیکھئے لسان العرب تحت کلمہ قلمس۔

تجارتی میلے کی بھی حیثیت اختیار کر لیا، کیونکہ کچھ تو حج کے لئے آنے والے نوواردوں کی ضروریات خورد و نوش کے لئے درآمد کی ضرورت ہوتی اور فروخت گاہوں کی بھی، اور خود نوواردحجاج بھی اپنے ساتھ تجارتی سامان لے کر حج کے ساتھ ساتھ تجارتی کاروبار بھی انجام دے لیتے۔ قرآن مجید نے بھی اس قدیم طرز عمل کو جاری رہنے دیا بلکہ اس کی حوصلہ افزائی بھی کی، اور قرار دیا کہ لیس علیکم جناح ان تبتغوا فضلا من ربکم [۱] یعنی کوئی حرج نہیں کہ تم اپنے رب کا فضل حاصل کرنے کی کوشش کرو۔ اور تجارتی کاروبار کے نفع کو خدا کا فضل قرار دیا۔ اس طرح ہر سال جو میلہ لگا کرتا اس سے میلہ لگنے کے مقام کے سردار کو تمام تجارتی درآمد کا عشر یعنی دسواں حصہ محصول درآمد میں مل کر خوب آمدنی ہو جایا کرتی تھی، اس لئے وہ ہر ممکن ذریعے سے اس بات کی کوشش کرتا تھا کہ بیرونی لوگوں کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں آنے کی بڑی سے بڑی ترغیب ہو، بدرقے یا خفارے کا نہایت منظم اور ترقی یافتہ ادارہ بھی جس میں قریش مکہ کو کافی دخل تھا، اس بارے میں خاصا مددگار ثابت ہوتا تھا۔ حرام مہینوں کا ادارہ بھی اسی غرض کے لئے وجود میں آیا تھا کہ اس زمانے میں لوٹ مار کو مذہبی نقطۂ نظر سے ممنوع قرار دینے کے باعث اجنبیوں اور تاجروں کو اس میلے میں آنے کی ترغیب ہو امن کا سب سے طویل زمانہ جو تاریخ نے محفوظ کر رکھا ہے، وہ حج کعبہ کے

۱؎ قرآن مجید ۲/۱۹۸

سلسلے میں مسلسل تین مہینوں پر مشتمل ہوا کرتا تھا[۱]۔ دیگر معبدوں کے حج نسبتاً کم مدت تک امن و امان قائم کرا سکتے تھے۔ اس سے لامنس[۲] اور اس کے ہم خیالوں کے مسلسل اور شدید اصرار انکار کے باوجود یہ بات صاف طور پر ثابت ہو جاتی ہے کہ حج کعبہ کو کس طرح غیر معمولی اور امتیازی اہمیت حاصل تھی، اور وہاں نہ صرف پورے جزیرہ نمائے عرب بلکہ شام اور مصر[۳] تک سے حجاج آیا کرتے تھے۔ ضمناً یہ بھی بیان کر دیا جا سکتا ہے، کہ قریش کے چند ممتاز خاندانوں کو مسلسل آٹھ مہینوں تک "اشہر حرم" حاصل رہتے تھے۔ اور تاریخ نے اس کو بسل کے نام سے یاد رکھا ہے[۴]۔ غالباً یہ خانوادے طویل تجارتی سفر کے لئے قافلے لایا اور لے جایا کرتے ہوں گے، اور جن علاقوں سے گذرتے تھے وہاں والوں کا سامان بھی کوئی معاوضہ اور کمیشن لئے بغیر کاروبار تجارت کے لئے لایا اور لے جایا کرتے ہوں گے جس کے باعث اہل قبائل بھی ان کے چھیڑنے سے باز رہتے ہوں گے کمیشن کے بغیر قریش کا بعض قبائل کے سامان تجارت کو لانا اور لے جانا ایک تاریخی واقعہ ہے[۵]۔ بہرحال ان تمام چیزوں سے

---

[۱] دیکھئے قرآن مجید ۹/۳۶ کی تشریح کسی تفسیر وغیرہ میں [۲] دیکھئے لامنس کا مضمون "مکہ کا فوجی نظام" فرانسیسی رسالہ ژورنال آزیاتیک بابت ۱۹۱۶ء [۳] ازرقی کی اخبار مکہ ص ۱۰۷، سیرۃ ابن ہشام ص ۲۸۲ طبقات ابن سعد ۱/ص ۱۴۵ [۴] سیرۃ ابن ہشام ص ۷۶، قاموس فیروزآبادی تحت کلمہ "بسل"۔

[۵] طبقات ابن سعد ۱/۴ ص ۹۴،

یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ملک میں امن و سلامت کی جانب ایک بیّن رجحان پایا جاتا تھا، نہ کہ ہر شخص کا باقی تمام دنیا سے اپنے کو برسرِ پیکار خیال کرنا۔ اس معاشی صورتِ حال کے اثرات ایک مستقل مقالے میں بہتر موقع پر ملیں گے۔

یہ واقعی ایک بدبختی کی بات تھی، گو عمداً اس کا ارادہ نہیں کیا گیا ہوگا کہ ہر تیسرے سال جب قلمّس حج کے مہینے یعنی ذالحجہ میں اعلان کرتا تھا، کہ آئندہ مہینہ محرم الحرام نہیں ہوگا، بلکہ ایک معمولی اور غیر حرم مہینہ ہوگا (جس کے دوران میں بدویوں کے لئے لوٹ مار سے باز رہنے کی کوئی پابندی نہیں ہوگی) تو اس طرح تین حرام مہینوں کا تسلسل ٹوٹ جاتا اور نتیجتاً ان لوگوں کو دشواریاں پیش آتیں جو جلد رخصت ہونا چاہتے یا راستے میں ہوتے۔

مکے والے تین مسلسل اور چوتھے ایک علیحدہ مہینے کو مقدس تسلیم کرتے تھے، چنانچہ ذی قعدہ، ذی الحجہ اور محرم عرفات کے حج اکبر[1] کے لئے اور رجب حجِ اصغر یا عُمرے[2] کے زمانے میں جب کہ لوگ کعبے کی زیارت کو آتے۔ قریشی اثر سے ان مقدس مہینوں کا قریب قریب پورے عرب میں

---

[1] جناب رسالت مآب صلعم نے یمن کے گورنر عمرو بن حزم کو جو ہدایت نامہ دیا تھا (متن کے لئے دیکھئے سیرۃ ابن ہشام ص ۹۶۱، نیز قرآن مجید ۹/۳ کی تشریح تفسیر طبری میں) اس میں حج عمرہ اور حج اکبر کی تشریح کی گئی ہے [2] ایضاً۔

احترام کیا جاتا۔ دیگر مقامات کے حج اور میلے کے سلسلے میں بھی حرام مہینے ہوتے، اور اسی لئے جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خطبۂ حجۃ الوداع میں "رجب مُضَر" کا محاورہ برتا گیا ہے[۴] تاکہ اس کو "رجب ربیعہ" سے ممتاز کیا جائے۔ یہ غیر قریشی حرام مہینے نسبتاً کم سختی سے ملحوظ رکھے جاتے تھے۔ جیسا کہ ابھی بیان کیا گیا۔ قریشی حرام مہینوں کو عام طور پر ملحوظ رکھا جاتا تھا، بجز اس کے کہ طے اور خثعم کے دو ضرب المثل لٹیرے قبائل اس حرمت و امتناع کی پرواہ نہیں کرتے تھے[۵] عام عربوں کے برخلاف یہ دونوں قبیلے چونکہ عیسائیت بڑی حد تک قبول کر چکے تھے، اس لئے بدوی اوہام و روایات کی وہ پرواہ نہیں کرتے ہوں گے لیکن عیسائیت اور لوٹ مار کا میل کچھ اچھا نہیں معلوم ہوتا۔ قریش مہینوں کا احترام بے شبہ اس لئے تھا، کہ قریشی کاروبار اور تجارتی تعلقات بہت پھیلے ہوئے تھے اور ان کی حلیفیوں کا جال بھی خوب وسیع تھا۔ اس سلسلے میں محمد بن حبیب کی کتاب المحبر کا ایک اقتباس دلچسپی کا باعث ہوگا

"ہر تاجر جو یمن یا حجاز سے (شمالی عرب کے میلے دومۃ الجندل کو)
جانا چاہتا، تو وہ جب تک مضری قبائل کی سرزمین سے گزرتا

۴؎ خطبہ حجۃ الوداع کے لئے دیکھئے سیرۃ ابن ہشام ص ۹۶۸ تا ۹۷۰۔ تاریخ طبری ص ۱۷۵۳ تا ۱۷۵۵۔ تاریخ یعقوبی ۲/۱۲۲ تا ۱۲۳، جاحظ کی البیان والتبیین ۲/۲۴ تا ۲۶ ابن عبد ربہ کی العقد الفرید باب خطب وغیرہ ۵؎ تاریخ یعقوبی ۱/۳۱۳ تا ۳۱۴، مرزوقی الازمنہ والامکنہ ۲/۱۶۶،

رہتا تو قریشی بدرقے حاصل کرتا، کیونکہ کوئی مُضری قبیلہ نہ تو کسی قریشی تاجر کو ستاتا اور نہ کسی مُضریوں کے حلیف کو، چنانچہ قبیلہ کلب والے کسی ایسے شخص کو نہیں لوٹتے کیونکہ وہ قبیلۂ بنی الجشم کے حلیف تھے۔ اسی طرح قبیلہ طے والے بھی ان کو نہیں ستاتے کیونکہ ان کی بنی اسد والوں سے حلیفی تھی۔"

یہ چیز دوبارہ یاد دلائی جاسکتی ہے کہ طے اور خثعم[۵۱] والے عرب کے حرام مہینوں کی پرواہ نہیں کرتے تھے، مگر قریشیوں کو اس حلیفی کے باعث سال بھر ہی ان سے امن رہتا۔ محمد بن حبیب نے مزید برآں بیان کیا ہے:

"اگر مسافر بنی عمرو بن مرثد کا خفارہ حاصل کر لیتے، تو اس پورے علاقے میں جہاں قبائل ربیعہ بستے تھے، انھیں حفاظت حاصل تھی، اگر بحرین کے سوقِ مشقر جانا ہوتا تو قریشی خفارہ ہی حاصل کر لیا جاتا .... اگر جنوبی عرب کے سوقِ مہرہ کو جانا ہوتا، تو بنی محارب کا بدرقہ حاصل کیا جاتا .... حضرموت کے سوقِ رابیہ کو جانے کے لئے قریش قبیلۂ بنی آکل المرار کا خفارہ حاصل کرتے، اور دیگر لوگ کندہ کے آلِ مسروق کا، اس طرح ان دونوں ہی قبائل کو عزت حاصل تھی، لیکن قریشی سربرآ

---

[۵۱] کوئی حیرت نہ ہو کہ ایک خثعمی ہی نے اس بات پر رضامندی ظاہر کی تھی کہ ابرہہ نے اصحاب الفیل کے ساتھ مکے پر چڑھائی کرنی چاہی تو یہ اس کی رہنمائی کرے، دیکھئے ابن عبد ربہ کی العقد الفرید، ۳]

کے باعث اکل المرار کو اپنے حریفوں پر فوقیت حاصل ہوگئی[1]

"........ عکاظ عرب کا سب سے بڑا میلا ہوا کرتا تھا، اور وہاں
قریش، ہوازن، غطفان، عضل، لیث، حیا، مصطلق، احابیش
اور دیگر قبائل[2] آیا کرتے تھے"

اگرچہ قبہ منڈپ یا شامیانہ اور راعقہ یعنی گھوڑے کی لگاموں کے اداروں کا منشا عرب مؤلفوں[3] نے یہ بیان کیا ہے کہ اول الذکر کا مطلب ایک ڈیرہ لگا کر کسی عام قومی ضرورت کے لئے چندہ جمع کرنا ہوتا، اور ثانی الذکر سے مراد سوارہ فوج کی افسری ہوتا، لیکن غالباً لامنس کا خیال[4] درست ہے کہ اصل میں قبے سے مطلب وہ شامیانہ ہوتا ہوگا، جو جنگ یا عہد کے موقع پر قابل حمل و نقل بتوں کے اوپر سایہ کرنے کے لئے استعمال ہوتا اور راعقہ سے مراد وہ امتیاز تھا کہ کسی بت کو گھوڑے پر رکھ کر جلوس سے لے جائیں تو اس گھوڑے کی لگام پکڑے چلیں،

---

[1] اس سلسلے میں ملاحظہ ہو Olinder کی کتاب The Kings of Kinda
مطبوعہ جامعہ لونڈ واقع سویڈن ۱۹۲۷ء

[2] ابن حبیب کی کتاب المحبر باب اسواق العرب۔

[3] ابن عبد ربہ کی العقد الفرید ۲/۵۴

[4] لامنس کا مضمون "بت خانے اور مذہبی جلوس زمانہ جاہلیت کے عربوں میں" ہے، اس کی فرانسیسی کتاب "مغربی عرب" میں بھی چھپا ہے۔

مقدس شامیانے کا ذکر عربی ادبیات میں کچھ شاذ و نادر نہیں ہے، یہ باور کرنا کافی مشکل معلوم ہوتا ہے، کہ مکی سماج جس پست اور ابتدائی حالت میں تھا، اس کے باوجود وہاں سپہ سالارِ فوج اور سوارہ فوج کا افسر دو الگ الگ عہدے پائے جاتے ہوں[1]۔ اسلام آنے کے بعد جب زمانۂ جاہلیت کی بہت سی رسمیں مٹ گئیں اور چند صدی بعد جو مؤلف پیدا ہوئے، انھیں ان چیزوں کا کوئی علم نہ ہو سکا تو ذہانت سے کام لے کر انھوں نے اکثر قدیم اصطلاحات کا منشا، ان کے لغوی معنوں کو سامنے رکھ کر واضح کرنے کی کوشش کی اور چونکہ انھیں ان اصطلاحات کا پس منظر معلوم نہ تھا، اس لئے بعض وقت وہ غلطی بھی کر جاتے تھے، بہر حال ہمارے مؤلف بیان کرتے ہیں کہ اعنّہ کا عہدہ زمانۂ جاہلیت میں خالد بن الولید کو وراثت میں ملا تھا۔ یہ استنباط غالباً اس واقعے کی بنا پر ہے، کہ اُحد کی لڑائی میں خالد بن الولید نے مکے والوں کے رسالے

---

[1] بہر حال یونان کے شہر اثینہ کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ "وہاں دس سالارانِ فوج ہیں، ہر ایک، ایک ایک قبیلے کے لئے اور ہر ایک اپنے قبیلے والوں کی سالاری کرتا ہے اور ان کی پلٹنوں کے افسر مقرر کرتا ہے، اسی طرح وہاں دو سالاران رسالہ پائے جاتے ہیں جن کا انتخاب تمام شہری مل کر کرتے ہیں اور جو سوارہ فوج کی سالاری کرتے ہیں ان میں سے ہر ایک کے تحت پانچ پانچ قبائل کے سوار ہوتے ہیں (بقیہ صفحہ ۵۵)

کی قیادت کی تھی[1]۔ لیکن اُحد کو چھوڑ کر بدر یا خندق یا کسی اور لڑائی میں قریش کے ساتھ گھوڑے کبھی اتنی تعداد میں نہ تھے، کہ ان کا ذکر کیا جا سکے، عرب میں گھوڑے عام طور پر ایک تعیش ہی کی چیز سمجھے جا سکتے ہیں، یوں بھی قبہ اور اعنۃ دونوں عہدے عرب مؤلفین کے بیان کے مطابق ہمیشہ ایک ہی شخص کو حاصل ہوا کرتے تھے[2]۔ اور ظاہر ہے کہ کسی شخص کا افسر رسالہ اور افسر چندہ دونوں ہوتا کوئی ایسا ضروری امر نہیں، کیونکہ یہ چیزیں لازم وملزوم نہیں۔

نظام مالیہ

کسی مملکت کے نظم ونسق میں مالیئے کی اہمیت قدیم ہی سے رہی ہے۔ ذہانت کے پتلے قصی[3] نے، کہتے ہیں کہ مکے والوں پر ایک سالانہ محصول لگانے کا بہت اچھا بہانہ ڈھونڈھ لیا تھا

(بقیہ نوٹ[1] صفحہ ۵۴) دیکھئے ارسطو کا دستور اثینہ ترجمہ انگریزی ص ۱۱۲ تا ۱۱۳

[1] حقیقت میں دائیں جانب کے رسالہ کی قیادت خالد بن الولید نے کی تھی اور بائیں جانب کے رسالے کی عکرمہ بن ابی جہل نے، دیکھئے سیرۃ ابن ہشام ص ۵۶۱ اس طرح مکہ میں بھی مثل اثینہ (یونان) دو سالاران رسالہ ہو جاتے ہیں۔

[2] ابن عبد ربہ کی العقد الفرید ۲/۴۴

[3] سیرۃ ابن ہشام ص ۸۳، تاریخ طبری ص ۱۰۹۹، طبقات ابن سعد ۱/۱ ص ۴۱، جغرافیہ یاقوت تحت کلمہ مکہ،

[4] سیرۃ ابن ہشام ص ۸۳، تاریخ طبری ص ۱۰۹۹ طبقات ابن سعد ۱/۱ ص ۴۱ جغرافیہ یاقوت تحت کلمہ مکہ

کہ حج کے زمانے میں جو غریب حجاج آئیں، اُن کی خبر گیری اور "بلدیہ" کی طرف سے حجاج کی عام "ضیفہ" یعنی ضیافت کے لئے (جس کا عرب کے دیگر حصوں میں بھی وہاں کے سرداروں کی طرف سے عام رواج تھا) مصارف میں[ف۱] سب مل کر حصہ لیں، جو بچت ہوتی ہوگی اس سے یقیناً سردار کا خزانہ معمور ہوتا جاتا ہوگا قصیٰ[ف۲] کا یہ عہدہ خاندان نوفل میں متوارث ہونے لگا تھا[ف۳]، یعقوبی نے صراحت سے بیان کیا ہے کہ قصی نے جب بعض بدعتیں اختیار کیں، اور حرم کعبہ کے قریب رہنے کے لئے عمارتیں تعمیر کرلیں، تو باہر سے آنے والے حجاج کی ناراضی کو ٹھنڈا کرنے کے لئے اس نے بلدی ضیافت کی تجویز پیش کی تھی۔ بہر حال جب یہ رواج پڑ گیا تو قصی اور اس کے جانشین اس سے فائدہ اٹھاتے رہے۔ یہ محصول رفادہ کہلاتا تھا۔

ف۱ محمد بن حبیب کی کتاب المحبر باب اسواق العرب، مرزوقی کی الازمنہ والامکنہ ۲/۱۶۱-۱۶۶

ف۲ ابن عبد ربہ کی العقد الفرید ۲/۴۵،

ف۳ تاریخ یعقوبی ۱/۲۴۵-۲۴۶،

ف۴ ابتداءً جب یہ سطریں معارف (اعظم گڈھ) میں چھپیں تو یہاں یہ جملہ تھا کہ "اور شاید بی بی خدیجہؓ کی ضرب المثل دولت بھی اسی خاندانی اندوختے کا نتیجہ ہوگی"۔ لیکن اب تحقیق مزید پر یہ جملہ حذف کرنا پڑتا ہے۔ کیونکہ بنی نوفل سے بی بی خدیجہؓ کا کوئی تعلق نہ تھا۔ (مؤلف)

قصی کو مال لاوارث کا بھی مستحق تسلیم کر لیا گیا تھا، اور جو اجنبی مکہ میں لاوارث مر جاتے تھے اُن کا مال قصی ہی کو مل جاتا[۵۱]۔ شہری مملکتوں، اور خاص کر مکے کے زمانے میں جو عُشر یا محصول درآمد لیا جاتا وہ بھی آمدنی کا ایک بڑا ذریعہ تھا۔ کہتے ہیں کہ مکے میں زمانۂ قبلِ تاریخ کے عمالقہ بھی[۵۲] عُشر لیا کرتے تھے۔ جرہم اور قطورا کے دو قبیلوں نے مکے میں مشترکہ یا وفاقی حکومت قائم کی تو بھی انھوں نے شہر کے دو حصے کر کے آپس میں بانٹ لئے تھے، اور جس حصے سے جو تاجر آتا اس کا عُشر اُسی حصے والے قبیلے کو حاصل ہوتا[۵۳]۔

قصی کے زمانے میں اس تقسیم کی ضرورت نہ تھی، اور پورے شہر کا وہ اکیلا سردار تھا[۵۴]۔ ظاہر ہے کہ خود شہر مکہ کے باشندے محصولِ درآمد سے مستثنیٰ تھے[۵۵]۔ محصول درآمد لینے کا یہ رواج عام طور پر عرب کے دوسرے شہروں میں بھی نظر آتا ہے، اور وہ عموماً سامان کی مالیت کا ۱/۱۰

---

۵۱ بلاذری کی انساب الاشراف بحوالہ مکہ مؤلفہ لامنس ص ۴۴،

۵۲ دیکھئے منائح الکرم بحوالہ مرآۃ الحرمین ۱/۹۹،

۵۳ سیرۃ ابن ہشام ص ۷۲، ازرقی کی اخبار مکہ ص ۴۷، کتاب الاغانی ۱۳/۱۰۸،

۵۴ طبقات ابن سعد ۱/۱ ص ۳۹،

۵۵ ایضاً

ہوا کرتا تھا۔[51] جیسا کہ لفظِ عُشر خود بتاتا ہے، ایک مرتبہ مکے میں سامان
بلامحصول درآمد کرنے کا ایک دلچسپ واقعہ ازرقی نے بیان[52] کیا ہے
کہ جب ایک دفعہ کعبہ میں آتشزدگی ہوئی، اور پھر طغیانی نے اس کو بالکل منہدم
کر دیا تو مکے والوں نے شعیبہ (جدہ) کی بندرگاہ پر طوفان میں آکر ٹوٹنے
والے ایک جہاز کو خرید لیا تھا، اور جہازیوں کو اجازت دی تھی کہ
اپنا بچا کھچا مال لاکر مکے بیچیں، اور ان سے کوئی عُشر نہ لیا جائے۔

قومی معبد پر جو چڑھاوے ہوتے، ان کی حفاظت کے لئے بھی
ظاہر ہے کہ ایک افسر کی ضرورت ہوتی[53]۔ چنانچہ یہ عہدہ جو "اموال محجرة" کہلاتا
تھا موروثی طور پر قبیلہ بنی سہم میں چلا آتا تھا۔

آمدنی کا ایک اور ذریعہ جو اجتماعی نہیں بلکہ انفرادی تھا، یہ بیان
کیا جاتا ہے کہ کوئی اجنبی شخص کعبے کی زیارت کو آتا تو اُسے یا تو کسی مکے
والے کا لباس حاصل کر کے اس میں طواف کرنا پڑتا، ورنہ اپنے غیر مقدس
اور گناہ آلود لباس کی جگہ کامل برہنگی کی حالت میں یہ رسم انجام
دینی پڑتی، چاہے مرد ہو کہ عورت[54]، اور ظاہر ہے کہ مکے والے اپنا

---

[51] محمد بن حبیب اور مرزوقی کی مذکورہ بالا کتابوں میں باب اسواق العرب۔

[52] ازرقی کی اخبار مکہ ص ۱۰۶ تا ۱۰۷، ۱

[53] ابن عبد ربہ کی العقد الفرید ۲/۴۶

[54] قرآن مجید ۷/۳۱ کی تشریح کسی تفسیر میں خاص کر تفسیر طبری ۸/۱۲۰،

لباس مفت نہیں دیا کرتے تھے۔ عورت کے متعلق مشہور تو یہی ہے اور ثبوت میں ایک عورت کا شعر پیش کیا جاتا ہے[۵۱]

اَلیومَ یَبدُو کلہ اوبعضہ   فما بدا منہ فلا اُحلّہ

مکہ والوں نے بیرونی حجاج کے قیام و طعام کے لئے بھی مصارف دہندہ مہمانوں کا طریقہ رائج کر لیا تھا، اور ان کے مہمان انھیں کپڑوں کا جوڑا، قربانی کا جانور، یا کوئی اور چیز اس کے معاوضے میں دیتے تو اسے[۵۲] حریم کا نام دیا جاتا تھا، اور اس لئے اہل مکہ حرمی کہلاتے، چنانچہ محمد بن حبیب نے اسلام سے پہلے خود جناب رسالت مآبؐ کے بھی حرمی بننے کا ذکر کیا ہے[۵۳]

نظام عدل گستری

مجلس حکومت (یا مجلس شوریٰ عمومی) اور عدالت میں باہم فرق کرنے کی ضرورت ہے۔ آخر الذکر کا مقصد صرف جرائم کی ذمہ داری اور دعوؤں میں حقوق کا تعین ہوا کرتا تھا اور بس۔

---

[۵۱] دیکھئے تفسیر طبری جلد ۸ ص ۱۱۴ (تفسیر سورہ ۷ آیت ۳۱) لیکن محمد بن حبیب کی کتاب المنمق میں اس عورت کا قصہ تفصیل سے درج ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کوئی عام قاعدہ اور رواج نہیں بلکہ اتفاقی واقعہ اور استثنائی صورت تھی۔ یعنی ہوا یہ تھا کہ ایک شخص نے اپنی بیوی کی خلع کی درخواست اس شرط سے منظور کی تھی کہ وہ کسی اور سے آئندہ شادی نہ کرے ورنہ علاوہ اور امور کے اسے برہنہ طواف کعبہ کرنا ہوگا! اس شرط کو پوری کرنے کا انتظام یوں کیا گیا کہ بڑے تڑکے وہ آئی اور اس کے عاشق کے اثرات سے مطاف بالکل خالی کرا دیا گیا، اور کسی کی نظر پڑے بغیر اس عورت نے برہنہ طواف کر لیا۔ اسی موقع پر اس نے وہ شعر کہا۔

[۵۲] ابن درید کی کتاب الاشتقاق ۱۷۱ تا ۱۷۲، [۵۳] کتاب المحبر ص ۱۸۱۔

دیگر ممالک کی طرح عرب میں بھی پنچایت اور حکومت دونوں کے لئے ایک ہی لفظ پایا جاتا تھا، چنانچہ لفظ "حکم" کے معنی حکومت کرنے، اور مقدمے کا فیصلہ کرنے دونوں کے ہیں[1]۔ ہر قبیلے کا سردار اس کا پنچ بھی ہوا کرتا تھا[2]، لیکن بین القبائل جھگڑوں میں بہرحال اس کی ضرورت ہوتی تھی کہ کسی دو قبیلوں کے لئے اجنبی ثالث سے رجوع کریں، چنانچہ مختلف معبدوں کی دیو بانی یا مشہور پنچوں کے پاس لوگ اپنے مقدمے پیش کرتے۔ عرب میں کاہن، ہاتف، عائف، ازلام اور ایسار کے جو تذکرے ملتے ہیں، اُن سے ہمیں ڈیلفی وغیرہ یونانی مندروں کی دیو بانی کی یاد تازہ ہوجاتی ہے[3]۔ قصی کے بعد پورے شہر مکہ کے لئے کوئی واحد حاکم عدالت نہیں ہوسکا، جس کا باعث مختلف قبائل کی رقابتیں اور جھگڑے تھے، انھیں کے سبب سے وہ مشہور رضاکاروں کی جماعت قایم ہوئی جس کا نام حلف الفضول تھا، اور جس کا مقصد یہ تھا کہ ہر اُس مظلوم کی مدد کی جائے جو شہر مکہ کے حدود میں پایا جائے۔ چاہے وہ

---

[1] تفصیلات کے لئے دیکھئے باب "عدل گستری ابتدائے اسلام میں"۔

[2] دیکھئے تاریخ یعقوبی ۱/۲۰۰ نیز محبر مؤلفہ محمد بن حبیب باب "حکام قریش"۔

[3] محمد بن حبیب نے کتاب المحبر میں ایک پورا باب عربی دیو بانی کے طریقے کی تفصیل پر دیا ہے۔

وہیں کا باشندہ ہو یا کوئی اجنبی[1]۔ یہ ممکن تھا کہ حلف الفضول کا ادارہ ترقی کر کے ایک مستقل نظام کی حیثیت اختیار کر لیتا، لیکن جلدی ہی اسلام کا زمانہ آگیا جس کے باعث یہ ادارہ غیر ضروری ہو گیا۔ کیونکہ اسلامی حکومت نے ایک نہایت منظم مرکزی نظامِ عدالت قایم کر لیا، اور خود عہد نبوی میں پورا جزیرہ نمائے عرب اور جنوبی فلسطین اس مرکزی نظام عدالت کے تحت آچکے تھے[2]۔

اس سلسلے میں عُہدۂ اشناق کا ذکر کیا جا سکتا ہے۔ کہتے ہیں کہ یہ موروثی طور پر حضرت ابوبکرؓ کے خاندان میں چلا آرہا تھا[3]۔ اس کا مقصد یہ بیان کیا جاتا ہے[4] کہ جو کوئی کسی ایسے جُرم یا قابلِ ضمان فعل کا ارتکاب کرے جو قابلِ راضی نامہ ہو تو عہدہ دار اشناق اس بات کا تعین کرتا کہ کس پر اور کتنی مالی ذمہ داری عاید کی جائے، اور پورا شہر اس کے تسوے کو مان لیتا، اور ملزم کا خاندان اس ہرجانے کی ادائی کے لئے چندہ کرتا۔ یہ رواج اور مقاموں پر بھی تھا۔ چنانچہ ہجرت کے بعد ہی شہری مملکت مدینہ کا جو

---

[1] سیرۃ ابن ہشام ص ۸۵تا۸۶، سہیلی کی الروض الانف ۱/۹۰تا۹۴، طبقات ابن سعد ۱/ص ۸۲، مسند ابن حنبل ۱/۱۹۰، نیز محمد بن حبیب کی کتاب المحبر اور کتاب المنمق کے ابواب متعلقہ۔ [2] تفصیل کے لئے دیکھئے باب "عدل گستری ابتدائے اسلام میں"۔ [3] ابن عبد ربہ کی العقد الفرید ۲/۴۶۔ [4] ایضاً۔

تحریری دستور جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مرتب اور نافذ فرمایا ـــــــ اور جس کا متن ایک طویل دستاویز کی صورت میں لفظ بلفظ ہم تک پہنچا ہے[۱] ـــــــ اس میں بھی اِس طریقے کو پوری تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ مجھے معلوم نہیں کہ لامنس[۲] نے یہ مضحکہ خیز رائے کس مآخذ کی بنا پر قائم کی ہے، کہ عہدہ دار اشناق وہ ہرجانہ یا خوں بہا اپنی جیب سے دیا کرتا تھا۔

نظامِ سفارت

مکے کے کشوری نظام ونسق میں ایک آخری لیکن خاصا اہم عہدہ "سفیر ومنافر" کا ہوا کرتا تھا[۳]۔ کہتے ہیں کہ یہ عہدہ موروثی طور پر بنی عدی، یعنی حضرت عمرؓ کے خاندان میں چلا آرہا تھا۔ ابنِ عبدِ ربہ نے مختصر وجامع ومانع الفاظ میں اِس کی یوں تشریح کی ہے:۔

"جب کبھی کوئی جنگ چھڑتی تو وہ عمر کو اپنا سفیر مختار بنا کر بھیجتے اور

۱؎ متن کے لئے دیکھئے سیرۃ ابن ہشام ص ۳۴۱ تا ۳۴۴، ابوعبید کی کتاب الاموال ص ۵۱۷، ابن کثیر کی البدایہ والنہایہ ۳/۲۲۴ تا ۲۲۶، وغیرہ، اور عام تحلیل کے لئے آگے باب "دنیا کا سب سے پہلا تحریری دستور"

۲؎ لامنس کی کتاب مکہ ص ۷۶ تا ۷۸،

۳؎ ابن عبد ربہ کی العقد الفرید ۲/۴۵ ،

جب کبھی کوئی بیرونی قبیلہ قریش کی اولیت کو چیلنج دیتا، تو اس وقت بھی عمر ہی کو بطور "منافر" بھیجا جاتا، تاکہ قریش کی طرف سے جواب دیا جائے، اور اس جوابدہی میں جو کچھ کہا جاتا، اس کو قریش مان لیتے[1]

نظامِ فوج جنگ اور فوج کے سلسلے میں ہمارے مآخذ مختلف موروثی عہدوں کا ذکر کرتے ہیں، ان میں "شامیانہ" اور "لگام" کا ہم اوپر ذکر کر چکے ہیں، ان کے علاوہ عقاب، لوا اور حلوان النفر کا ذکر کیا جاسکتا ہے۔

عہدہ دار عقاب کا مطلب جھنڈا لے جانے والے تھا۔ اور کہتے ہیں کہ یہ عہدہ[2] بنی امیہ میں متوارث تھا۔ بظاہر یہ وہ عہدہ دار تھا، جو حالتِ امن میں قومی جھنڈے کا متولی و نگہبان ہوا کرتا تھا، اور ضرورت کے وقت اسکو اپنی نگرانی میں لہراتا تاکہ فوجی اجتماع عمل میں آسکے، ورنہ کسی مہم اور عین معرکۂ کارزار میں علم برداری کے فرائض کسی اور کے بھی سپرد کئے جاسکتے تھے[3]

---

[1] ابن عبد ربہ کی العقد الفرید ۲/۴۴،

[2] " " "

[3] " " "

ہمارے مؤلف[۱] عقاب اور لوا میں فرق کرتے ہیں، اگرچہ دونوں کے معنی جھنڈے ہی کے ہیں۔ اور بیان کیا جاتا ہے کہ ہر ایک ایک علیحدہ قبیلے میں موروثی طور سے چلا آتا تھا، ممکن ہے عقاب سے مراد جنگی قومی جھنڈا ہو، اور لوا، قبائلی جھنڈا ہو جس کا استعمال اس وقت ہوتا ہو، جب کہ قریش کے ساتھ دیگر حلیف قبائل بھی مہم میں شریک ہوں۔

ابن عبد ربہ نے اپنے اس تذکرے کو ایک عجیب وغریب عہدے پر ختم کیا ہے جس کا بیان ہمیں کسی دوسرے مؤلف کے پاس نہیں ملتا:۔

"حلوان النفر (فوجی اجتماع کا معاوضہ) چونکہ (مکے کے) عربوں پر زمانۂ جاہلیت میں کوئی منفرد بادشاہ حکمرانی نہیں کرتا تھا، اس لئے جب کبھی کوئی جنگ ہوتی تو وہاں والے اپنے قبائلی سرداروں میں قرعہ ڈالتے، اور کسی ایک کا انتخاب کرتے چاہے وہ کم سن ہو یا بڑی عمر کا۔ چنانچہ یوم فجار کی لڑائی کے موقع پر بنی ہاشم کی باری تھی، اور قرعے میں حضرت عباس رض نکلے، جو اس وقت بچے تھے۔ چنانچہ لوگوں نے اُن کو ایک ڈھال پر بٹھایا، اور اٹھا لے گئے[۲]"

---

[۱] ابن عبد ربہ کی العقد الفرید ۳/۳۴۵،

[۲] ابن عبد ربہ کی العقد الفرید ۳/۳۱۴،

مگر یہ توضیح کچھ دل کو نہیں لگتی۔ میرا خیال ہے کہ حلوان النفر سے مراد یہ فریضہ تھا، کہ اگر کسی مہم کے موقع پر کوئی شہری اس لڑائی میں حصہ لینے سے قاصر رہتا ہو، تو اس کو اجازت تھی کہ اپنے بدل میں کسی اور شخص کو روانہ کرسکے[۵۱]۔ ممکن ہے کہ اس اجازت اور بدل کا انتخاب اور اس کا معاوضہ ہتھیار اور سامانِ سفر کی فراہمی کی نگرانی حلوان النفر کے عہدہ دار کے فرائض میں داخل ہو، ورنہ اجتماع کے معاوضے اور بادشاہ اور فوج کی سپہ سالاری میں کوئی ربط نظر نہیں آتا۔

یہاں اس بات کا موقع نہیں ہے کہ قریش کے فوجی نظام[۵۲] اور قانونِ جنگ و ناطرفداری کے اصول و نظائر کی تفصیل دی جائے۔ یہاں صرف ایک سرسری اشارہ چند چیزوں کی طرف کیا جاتا ہے: "مرباع" سے مراد مالِ غنیمت کا چوتھائی حصہ ہوتا تھا، جو مہم کے سردار کو ملتا۔ باقی تین چوتھائی عام سپاہیوں میں تقسیم کر دیا جاتا۔ "فضول" سے مراد ناقابلِ تقسیم کسرات ہوتے تھے "نشیطہ" سے مراد وہ مالِ غنیمت تھا، جو دشمن کی شکست اور عام لوٹ سے پہلے حاصل ہو، اور "صفی" سے مراد وہ منتخب چیز، مثلاً

---

۵۱ سیرۃ ابن ہشام وغیرہ میں جنگِ بدر کے سلسلے میں ابولہب کا اپنی جگہ کسی اور کو بھیجنا اور دیگر مواقع پر دیگر نظائر کا پیش آنا مروی ہے۔

۵۲ اس نظام کی چند تفصیلوں کے لئے دیکھئے مسعودی کی التنبیہ والاشراف ص ۲۷۹ تا ۸۰،

کوئی تلوار وغیرہ ہوتی تھی، جو مالِ غنیمت کی تقسیم سے پہلے مہم کا سردار اپنے لئے چن لینے کا مجاز ہوتا تھا، اور "مرباع"، فضول، نشیطہ، اور صفی وہ امتیازات تھے جو کسی قبائلی لوٹ مار کی مہم کے قائد کو حاصل ہوتے تھے[1] راس الحجر الخشنی، القعقاع التیمی، اور زرار بن الخطاب الفہری کا ذکر ابنِ دُرید[2] نے ان لوگوں کی فہرست میں کیا ہے، جنھیں زمانۂ جاہلیت میں مرباع لینے کا حق حاصل ہوتا تھا۔

یہاں لامنس[3] کے ان تمام دلائل کی نقل کی جانی ممکن نہیں، جو اس نے اپنے اس دلچسپ دعوے کی تائید میں پیش کئے ہیں کہ مکے والوں نے حبشی غلاموں اور تنخواہ یاب نوکروں کی ایک مستقل فوج قایم کر رکھی تھی، اس کے مقالے میں کافی حوالے دیئے گئے ہیں لیکن اس قابل مگر بدقسمتی سے بیحد متعصب اور غیر ہمدرد یسوعی (Lammens) پادری کا منشا، اس پوری کاوش سے صرف یہ ثابت کرنا تھا کہ قریش ایک نہایت بزدل قوم تھی، جو لڑائی

---

[1] مرزوقی کی الازمنہ والامکنہ $\frac{2}{24}$

[2] کتاب الاشتقاق ص ۴۴، ۶، ۱۳۵، ۱۸۱، ۳۱،

[3] لامنس کا مضمون "احابیش اور مکہ کا فوجی نظام قرن ہجرت کے وقت فرانسیسی رسالہ ژورنال آزیاتیک ۱۹۱۶ء میں اسی مؤلف کی فرانسیسی یادداشت جز ص ۲۳۷ تا ۲۴۹

سے جی چُراتی تھی لیکن چونکہ اس کے تجارتی مفادات بہت پھیلے ہوئے تھے، اس لئے اپنے مواصلات کی حفاظت کے لئے انھیں قوّت کی ضرورت تھی۔ بنا برآں انھوں نے غلاموں اور تنخواہ یاب لوگوں کی ایک فوج قائم کر کے ہیں تیار کر لی تھی۔ نپولین جیسے فاتح کو ابتدائی مسلمانان مکہ کی عظیم الشان فوجی فتوحات[۱] پر رشک آتا تھا[۲]، تو محض ایک متعصب یسوعی پادری کا خالد ابن الولیدؓ، سعد بن ابی وقاص، اور ابو عبیدہؓ جیسے مکے والوں تک میں کسی بہادری کا نظر نہ آنا شپرہ چشمی کے سوا کیا کہا جا سکتا ہے!

سماجی نظام یونان والے اجنبیوں کو "باربار" یعنی بربریت پسند کہتے تھے، اور یونانی زبان میں دشمن کے لئے جو لفظ پایا جاتا ہے، اس کے لغوی معنی بھی اجنبی ہی کے ہیں[۳]۔ اس کے برخلاف عرب اجنبیوں کا ذکر کرنا چاہتے تو "عجمی" کی سی ضرر اصطلاح استعمال کرتے جس کے لغوی معنی ہیں "گونگا"۔ تاکہ اجنبیوں سے اپنے آپ کو ممتاز کر لیں، چنانچہ لفظ عرب کے معنی

---

[۱] دیکھئے اوپر اس مضمون کی تمہید میں،

[۲] دیکھئے نپولین کی نوشتہ فرانسیسی یادداشت جزیرہ سینٹ ہیلینا۔

[۳] انسائیکلوپیڈیا آف سوشل سائنس کی جلد اوّل کا دیباچہ نیز F. ROTH کا جرمن مضمون لفظ باربار کا مفہوم اور استعمال مطبوعہ نوبرگ ۱۸۱۴ء لاطینی لفظ Hostis (بقیہ)

ہیں فصیح اور قادر الکلام۔ اس کے باوجود عرب میں بھی اور یونان میں بھی ہر جگہ اجنبی آتے رہتے، بلکہ بستے بھی رہتے۔

یونان میں وہ اجنبی جو وہاں آکر مقیم ہو جاتے تھے، شہریوں اور غلاموں کے بین بین ایک خاص طبقہ قایم کرتے تھے۔ ان کو اصطلاحاً ٹیک METIC کہا جاتا تھا[۱]۔ یہ METIC لوگ اور ان کے خاندان ان تمام حقوق سے مستفید ہوتے تھے جو شہریوں کو حاصل تھے البتہ انھیں نہ تو کوئی سرکاری عہدہ مل سکتا، اور نہ وہ شہری انتخاب میں کوئی رائے دے سکتے، اور نہ کسی اراضی کے مالک ہی ہو سکتے ان میں سے ہر ایک کے لئے یہ ضروری ہوتا کہ کسی شہری کو اپنا سرپرست بنائیں، جو ان کے چال چلن کی ذمہ داری لے۔ ان کو سالانہ ٹیکس براہ راست بارہ درہم مرد کے لئے اور چھ درہم غیر شادی شدہ عورت کے لئے محصول بھی دینا پڑتا۔ ان چیزوں کو چھوڑ کر اور باتوں میں انھیں شہریوں کی برابری حاصل ہوتی تھی، چنانچہ وہ اپنی مسکونہ شہری مملکت کی فوج میں شریک ہو کر جنگ کر سکتے تھے، اور اس کی مذہبی پبلک تقریبوں میں حصہ لے سکتے تھے[۲]۔ عرب میں جو اجنبی آکر سکونت گزیں ہو جاتے ان کو

(بقیہ ص ۶) کے معنی بھی شروع میں اجنبی کے تھے پھر اسے عام طور پر دشمن لیا جانے لگا

[۱] ہیالیڈے کی مذکورہ بالا کتاب ص ۱۱۲۴۔

[۲] انسائیکلوپیڈیا آف سوشیل سائنس جلد اول کا دیباچہ فصل شہری مملکت کا تسلط۔

"مولا" کا نام دیا جاتا تھا۔ عرب اور خاص کر مکے والوں کے موالی کے ساتھ یونان کے مقابلہ میں کم سختی کا سلوک ہوتا تھا، چنانچہ ان پر کوئی خصوصی محصول عائد نہیں کئے جاتے تھے۔ ان کو اور ان کے سرپرستوں کو جملہ شہری حقوق حاصل رہتے تھے، مساوات کی حد یہ تھی، کہ اجنبی اور اس کے سرپرست دونوں کے لئے ایک ہی لفظ مولا کا استعمال کیا جاتا تھا۔ البتہ یہ تحدید بداہتہً پائی جاتی تھی کہ کوئی اجنبی متوطن کسی اور نئے اجنبی کو اپنا مولا بنانے کا اور اپنی سرپرستی میں لینے کا مجاز نہ تھا۔ اس پابندی سے قطع نظر ہر اجنبی متوطن اپنے سرپرست کے خاندان کا ایک رکن بن جاتا، اور اُسے وہ سب شہری حقوق حاصل رہتے جو کسی اصلی شہری کو حاصل تھے۔ البتہ کسی نئے اجنبی کو اپنی پناہ میں لینے سے پہلے اُسے خود اپنے سرپرست کی اجازت ضروری ہوتی۔[۱] اصل میں عرب یہ چاہتے تھے کہ اوروں کو اپنا لیں اور عرب بنا ڈالیں۔[۲] اس کے برخلاف یونانیوں کو ان کے فلاسفہ نے کہہ رکھا تھا کہ قدرت ہی کا یہ منشا ہے کہ اجنبی یونانیوں کے غلام بنیں۔[۳] مزید برآں یونان میں:-

"کسی سیاسی وحدت کے ارکان میں اتحاد اتبدا اس لئے ہوتا تھا کہ وہ ہم جد ہوتے تھے۔ اور ہم مذہب ہوتے تھے۔ وہاں کا سماج برادریوں میں

---

[۱] سیرۃ ابن ہشام ص ۱۵۱، تاریخ طبری ص ۳-۲-۱۲۔ [۲] تفصیلات کے لئے دیکھئے حمید اللہ کی فرانسیسی کتاب "اسلامی سیاست خارجہ عہد نبوی اور خلافت راشدہ" میں ۔ [۳] ارسطو کی کتاب سیاسیات ۱/۳ و ۶ جس کا حوالہ لارنس نے اپنی انگریزی کتاب "قانون بین الممالک کے اصول" میں بھی دیا ہے۔

بٹا ہوا تھا یعنی رشتہ دار خاندانوں کے گروہ الگ الگ وحدت بناتے تھے۔ اور یہ تمام برادریاں ایک مزعومہ ہم نسبی کے باعث ایک بزرگ تر اتحاد میں شامل ہو جاتی تھیں جسے قبیلہ کہا جاتا تھا، خون کا رشتہ مذہبی رشتے کے باعث مستحکم تر ہو جاتا تھا۔[1]

مکے کا اندرونی نظام اس سے بہت زیادہ پیچیدہ تھا، کیونکہ وہاں حسب و نسب کو غیر معمولی سماجی اہمیت حاصل تھی، ہر قبیلے میں ہر دس دس آدمیوں پر ایک "عریف" ہوا کرتا، (جس طرح رومانی (DECURION) اور کہتے ہیں کہ ہر سو کا سردار قائد یا نقیب کہلاتا تھا، (جسکا مماثل رومانیں، (CENTURION) ہو سکتا ہے) وہاں قبیلہ، بطن، فخذ، شعب[2] وغیرہ کی شاخ در شاخ تنظیم و تقسیم پائی جاتی تھی، جن کی تفصیل عرب مؤلفین کے حوالے سے وستن فیلڈ نے اپنی جرمن کتاب "...و لہا ئے نسب عرب" کے اشارے کے دیباچے میں بھی دی ہے۔

اسلام سے پہلے مکے والوں میں مذہبی وحدت نہیں پائی جاتی تھی اسی طرح وہاں کوئی مقدس کتاب یعنی تحریری قانون بھی نہیں پایا جاتا جس کی تعمیل سب کر سکیں۔ چنانچہ مکے والوں میں، بت پرست، مشرک ایک سے زیادہ خداؤں کو ماننے والے، خدا کو نہ ماننے والے بلکہ خود لامذہب

---

[1] ہیالیڈے کی مذکورہ بالا کتاب ص ۱۰۸ تا ۹، [2] یہ اصطلاحات جسم انسانی کے مختلف اعضا کے بھی نام ہیں، اور شیخ سعدی نے کیا خوب کہا ہے "بنی آدم اعضائے یک دیگرند"

اور دہریئے بھی پائے جاتے تھے، ان کے علاوہ مجوسی، یہودی یا عیسائی مذہب بھی مختلف لوگوں نے اختیار کر لیا تھا۔ بہرحال وہاں کے عوام تمدن کے اس درجے تک پہنچ چکے تھے، کہ ایک مشترک اور سب سے بڑے خدا کو بھی مانیں، جو چھوٹے چھوٹے قبائلی دیوتاؤں سے بھی بزرگ و برتر ہو، اور اس کو وہ اللہ کے نام سے پکارتے تھے۔

سیاسی شعور بھی اس حد تک ترقی کر گیا تھا کہ ہر شخص مملکتی مفاد کو شخصی مفاد پر ترجیح دینا ضروری سمجھتا تھا، چنانچہ غیر متوقع طور پر مکے والوں کو غزوۂ بدر میں شکست ہوئی تو انھوں نے ایک کارواں کو پورا منافع (جو عین اسی زمانے میں شام سے ابوسفیان کی سرکردگی میں واپس آیا تھا، اور جس میں شہر میں بسنے والے تقریباً ہر قبیلے کا سرمایہ لگا ہوا تھا) جنگی تیاریوں کے چندے میں دے دینا منظور کر لیا۔[۱۵]

مکے والے اپنے نوزائیدہ بچوں کو کسی صحرا میں بدویوں کے ہاں بھیج دیا کرتے تھے، جہاں وہ بدویوں کے ہاتھوں پرورش پاتے تھے، صحرا کی پاک و صاف اور سادہ زندگی میں پلتے تو ان میں بدویوں کی بہت سی خوبیاں آجاتیں، اور شہریوں کی مخلوط آبادی کی بہت سی برائیوں سے وہ بچپن کی تاثر پذیر عمر میں محفوظ رہتے۔ خود آنحضرت صلعم نے بھی اپنی ابتدائی زندگی کے چند سال اسی طرح گزارے تھے

---

[۱۵] سیرۃ ابن ہشام صفحہ ۵۵۵، طبقات ابن سعد ج۲ ص ۷۵ وما بعد۔

یہاں مماثلت کے لئے ان قوانین کی یاد تازہ کرائی جاسکتی ہے، جو مثلاً لائیکرگس نے یونان کے شہر اسپارٹا میں نافذ کئے تھے، اور جو اگرچہ انتہائی وحشیانہ تھے، مگر ان کا منشا بھی نئی نسلوں کی ذہنی اور جسمانی تربیت ہوتا تھا۔

کہتے ہیں کہ یونانی طبیعت کی امتیازی خصوصیت علم کی محبت تھی جس طرح کہ فینیقیہ اور مصر والوں کا امتیازی خاصہ دولت کی محبت تھا (ہندوستان میں بھی لکشمی یعنی روپے کی اب بھی باقاعدہ پوجا ہوتی ہے) اس کے برخلاف قریش یعنی باشندگان مکہ کی امتیازی خصوصیت فنون لطیفہ اور ادبیات کی محبت معلوم ہوتی ہے۔ غالباً یہی فن نوازی تھی کہ عتبہ بن ربیعہ ابن عبدالشمس نے کعبہ میں ایک دارالقواریر شیش محل (CRYSTAL PALACE) تعمیر کیا تھا۔[۱] شعر و شاعری ان کا اوڑھنا بچھونا ہو چلا تھا، چنانچہ بیت، مصرع، اسباب، اور اوتاد، فواصل کسی ڈیرے اور اس کے مختلف اجزا کے بھی نام تھے، اور بیت یعنی شعر اس کے مختلف حصوں کے بھی۔

زندگی کا مقصد یونانی فلسفیوں کی نظر میں دنیاوی آرام تھا۔[۲] شاید ان قرآنی آیتوں کا حوالہ دلچسپی سے پڑھا جائیگا جس میں اسلام سے پہلے کے عربوں کا مقصد زندگی اور خود اسلامی تصور حیات اس خوبی سے

---

[۱] بلاذری کی فتوح البلدان مطبوعہ مصر ص ۶۳ و ۶۴،

[۲] ارسطو کی کتاب سیاسیات ۲ و ۱/۳،

پیش کیا گیا ہے :-

"ان میں سے چند ایسے ہیں جو کہتے ہیں کہ اے ہمارے رب ہم کو
اس دنیا میں بھلائی عطا کر، اُن کو آخرت میں کوئی حصّہ نہ ملے گا۔
لیکن ان میں سے بعض اور ایسے ہیں جو کہتے ہیں کہ اے ہمارے
رب ہم کو اس دنیا میں بھی بھلائی عطا فرما اور آخرت میں بھی بھلائی
اور ہم کو آتشِ دوزخ کے عذاب سے محفوظ رکھ، ان کو ان کی کمائی
کا حصّہ ملے گا، خدا حساب وکتاب لینے میں بہت تیز ہے۔"[1]

یہ ایک پس منظر تھا، اب دوسرے باب میں اسلامی تصورِ مملکت
کے بڑے بڑے خط و خال پیش کئے جائیں گے۔

(رسالہ معارف اعظم گڑھ۔ جنوری و فروری ۱۹۴۲ء)

[1] قرآن مجید ۲/۲۰۰ تا ۲۰۲

دُنیا کا سب سے پہلا تحریری دستور

عہدِ نبوی کی ایک اہم دستاویز

متمدن اقوام ہی نہیں، وحشی باشندوں میں بھی حکمرانی اور عدل گستری کے لئے معینہ قاعدے ہوتے ہیں اور خود رائے سے خود رائے سردار بھی اپنے آپ کو اُن کا پابند پاتا ہے[1]۔ عموماً جب کبھی ایسے قواعد تحریری صورت میں مرتب ہوئے تو انھیں کتاب کا نام دیا گیا (SERIPTIM) اور (BILLE) کے معنی بھی کتاب کے ہیں۔ چنگیز خاں کے "یاسہ[2]" کے معنے بھی کتاب کے ہیں۔ چنانچہ جدید ترکی میں بھی یازمک کا مصدر لکھنے کے معنوں میں ہی برتا جاتا ہے، اور "کتاب اللہ" مسلمانوں کے قرآن کا نام ہے۔

غرض عام قواعد و قوانینِ ملک کم و بیش تحریری صورت میں ہر جگہ ملتے ہیں

---

[1] GRAMMAR OF POLITIES BY H. J. LASKI میں بھی یہی نتیجہ استقراء نکلا ہے

[2] مسالک ابن فضل اللہ العمری، مخطوطۂ پاریس،

لیکن دستورِ مملکت کو عام قوانین سے علیحدہ تحریری صورت میں لانا اس کی نظیر باوجود بڑی تلاش کے مجھے عہدِ نبوئی سے پہلے نہیں مل سکی۔ بے شبہ منوسمرتی (سنہ ۵۰۰ ق م) میں راجہ کے فرائض کا بھی ذکر ہے۔ اور کوتلیا کی آرتھ شاستر (سنہ ۳۰۰ ق م) اور اس کے ہمعصر ارسطو کی کتابوں میں سیاسیات پر مستقل تالیفیں بھی ملتی ہیں۔ ارسطو نے تو اپنی ہمعصر شہری مملکتوں میں سے بشمول ہندوستان[1] (۱۵۸)[2] کے دستور بھی لکھے تھے جن میں سے صرف شہر ایتھنز کا دستور ابھی پچاس سال قبل مصر میں بردی کاغذ (پاپیروس) پر محفوظ مل چکا ہے، اور سنہ ۱۸۹۱ء میں شائع ہو چکا ہے، اور انگریزی اور دیگر زبانوں میں ترجمہ بھی ہو چکا ہے۔ لیکن یہ سب یا تو درسی اور مشورتی کتابوں کی حیثیت رکھتی ہیں یا کسی مقام کے دستور کا تاریخی تذکرہ ہیں۔ کسی مقتدرِ اعلیٰ کی طرف سے نافذ کردہ مستند دستورِ مملکت کی حیثیت ان میں سے کسی کو بھی حاصل نہیں۔

سنہ ۱ھ میں مدینہ منورہ میں ہجرت کر آنے کے پہلے ہی سال رسول کریم صلعم نے ایک نوشتہ مرتب فرمایا جس میں حکمران کے حقوق اور فرائض اور دیگر فوری ضروریات کا تفصیلی ذکر ہے۔ خوش قسمتی سے یہ دستاویز

---

[1] Ariototle on the Athenian Constitution By Kenyon

[2] Encyclopaedia of Social Sciences, Vol I P. 27 نیز P. XV P. XIII

پوری کی پوری اور بلفظہٖ ابنِ اسحاق اور ابو عبیدہ نے اپنی کتابوں میں محفوظ کی ہے، اور آج اسی کا کچھ بیان مقصود ہے۔

اس دستاویز میں تریپن[۲] جملے، یا قانونی الفاظ میں "دفعات" ہیں اور اُس زمانے کی قانونی عبارت اور دستاویز نویسی کا وہ ایک انمول نمونہ ہیں۔ اس کی اہمیت اسلامی مورخوں سے کہیں زیادہ یورپی عیسائیوں نے محسوس کی۔ ولہاوزن، میولر، گریمے، اشپرنگر، وینسنک کائتانی، بول[۱] وغیرہ کے علاوہ ایک انگریزی مورخ نے مختصر تاریخ عالم لکھتے ہوئے بھی اس دستاویز کا تفصیلی ذکر کرنا ضروری خیال کیا ہے۔ یہاں ان جرمن، ولندیزی، اطالوی، انگریزی اور دیگر مؤلفوں کے بیانات کا ذکر غیر ضروری ہے۔ میں صرف اپنے ناچیز خیالات اس کے متعلق عرض کرنے کی اجازت چاہتا ہوں، اور اس کی اہمیت کی طرف اہلِ ملک کی توجہ منعطف کراتا ہوں۔ اس دستاویز کی تفصیلی شرح اور مغربی مؤلفوں کے بیانات کی تنقید کے لئے بڑا وقت چاہیئے۔ جو اس لکچر[۲] میں ممکن نہیں۔

لیکن قبل اس کے کہ اس دستاویز کے مندرجات پر کچھ عرض کیا جائے اس کا تاریخی پس منظر اور ان حالات کا ذکر ضروری ہے جن میں وہ مرتب اور نافذ ہوئی۔

---

[۱] حوالے مضمون کے آخر میں دیئے گئے ہیں۔

[۲] موتمر دائرۃ المعارف العثمانیہ حیدر آباد۔

رسول کریم صلعم نے جب مکہ معظمہ میں اپنے تبلیغی اور اصلاحی کام کا آغاز کیا، اور صدیوں نسلوں کے معتقدات و رواجات کی تبدیلی چاہی تو اہلِ ملک نے ابتداءً حیرت اور پھر نفرت اور آخر کار مخالفت و معاندت کا برتاؤ کیا۔ یہ مشن پہلے ہی دن سے عالمگیر تھی اور معلوم دنیا، خاصکر ایران و روم (نیز نبطیہ) تک اس کی فوری اور بآسانی وسعت کے امکانات نظر آتے تھے اور آنحضرتؐ اپنی تبلیغ میں ظاہر بیں دنیاداروں کو ان ممالک کی فتح کی بشارت دیتے تھے[1] لیکن ایک مفلس اور کمزور قبیلے کی ایک جونیر فرد کی حیثیت میں آپ کی سرداری کا مانا جانا مشکل تھا۔ آں حضرت کی رشتہ داری طائف[2] اور مدینے[3] کے قبائل سے بھی تھی، اسی توقع میں پہلے آپ طائف کے قریب تر علاقے کو تشریف لے گئے، مگر وہاں وطن سے بڑھ کر مشکلیں پیش آئیں۔ آخر حج کے زمانے میں کئی سال تگ و دَو کرنے کے بعد چند مدینے والے ہی آپؐ کے گرویدہ بنے، اور مدینے آنے پر آپ کو اور آپ کے مکی ساتھیوں کو پناہ اور مدد دینے کا بھی وعدہ کیا۔

مکے کی مقامی حالت ناقابل برداشت ہو چکی تھی عام مخالفت سے بڑھ کر

---

[1] ابن ہشام ص ۲۷۸، نیز طبقات ابن سعد احوال قبل الہجرۃ۔

[2] معارف ابن قتیبہ ص ۳۴۳، کتاب المنتقی من دلائل النبوۃ لابی نعیم (مخطوطہ) الفصل العشرون۔

[3] ابن ہشام ص ۱۰۷، ۲۳۳۶، ۳۴۶، طبقات ابن سعد ج ۱ ص ۱۴۴، ۱۴۵، ۱۴۶۔ معارف ابن قتیبہ "احوال عمومتہ" تاریخ طبری ج ۲ ص ۷۷ تا ۷۹ وغیرہ۔

جسمانی اذیت سے بہتوں کی جان کے لالے پڑے ہوئے تھے اس لئے مسلمانان مکہ ہجرت کرکے مدینے جانے لگے۔ مکے والے ڈرے کہ کہیں یہ لوگ باہر جاکر انتقام کی تیاریاں نہ کریں، اس لئے خود حضرتؐ کے مکان کا محاصرہ اور شب خون کی تجویز پختہ کی گئی، مگر قدرت کو کچھ اور منظور تھا۔ آنحضرتؐ بخیر و عافیت مکے سے نکل کر مدینے پہنچ گئے۔ جھنجھلاہٹ میں مکے والوں نے آپ کی[1] اور دوسرے مہاجروں[2] کی املاک و جائداد پر غاصبانہ تسلط جمالیا۔ مدینے کے مسلمانوں اور مکے کے مہاجروں کی مجموعی تعداد چند سو سے زیادہ نہ تھی، اگرچہ مدینے کی آبادی کا اس وقت اندازہ چار پانچ ہزار کیا جاتا ہے جن میں آدھے کے قریب یہودی تھے۔ مکہ اس وقت ایک منظم شہری مملکت کی صورت میں تھا، وہاں فوج، محاصل، عبادت، تعلقات خارجہ، عدل گستری وغیرہ کے کوئی پچیس[25] سرکاری عہدے تھے، جن کا تفصیلی ذکر میں نے حال میں ٹرونڈرم کے موتمر مستشرقین میں پڑھے ہوئے مقالے میں کیا ہے[3]۔

---

[1] بخاری کتاب ۲۴، باب ۴۴، حدیث ۳، یہ مکان بی بی خدیجہؓ سے آنحضرتؐ کو وراثت میں ملا تھا، (مبسوط سرخسی ۱۰/۵۰) [2] ابن ہشام ص ۳۱۹، ۳۴۳ ج ص ۲۱ تا ۲۲، نیز بنی جحش کی جائداد پر ابوسفیان کے قبضے اور فروخت کے لئے محمد بن حبیب کی المنمق (مخطوطہ) ص ۱۵۱، [3] مطبوعہ رسالہ اسلامک کلچر جولائی ۱۹۳۸ء نیز باب گزشتہ "شہری مملکت مکہ"

اس کے برخلاف مدینے میں ابھی مزاج کی کیفیت تھی، اور قبائلی دور دورہ تھا، عرب اوس اور خزرج کے بارہ قبائل میں بٹے ہوئے تھے تو یہودی بنو النضیر و بنو قریظہ وغیرہ کے دس قبائل میں ان میں باہم نسلوں سے لڑائی جھگڑے چلے آرہے تھے، اور کچھ عرب کچھ یہودیوں کے ساتھ حلیف ہو کر باقی عربوں اور ان کے حلیف یہودیوں کے حریف بنے ہوئے تھے۔ ان مسلسل جنگوں سے اب دونوں بھی تنگ آچلے تھے[1] اور گو وہاں کے کچھ لوگ غیر قبائل خاص کر قریش کی جنگی امداد کی تلاش میں تھے[2] لیکن شہر میں امن پسند طبقات کو غلبہ ہو رہا تھا۔ اور ایک کافی بڑی جماعت اس بات کی تیاری کر رہی تھی کہ عبداللہ بن اُبی بن سلول کو بادشاہ بنا دیں حتیٰ کہ بخاری[3] و ابنِ ہشام[4] وغیرہ کے مطابق اس کے تاج شہریاری کی تیاری بھی کاریگروں کے سپرد ہو چکی تھی۔ بے شبہ آنحضرتؐ نے بیعتِ عقبہ میں بارہ قبائل میں بارہ[12] مسلمانوں کو اپنی طرف سے نقیب مقرر کر کے مرکزیت پیدا کرنے کی کوشش فرمائی تھی، مگر اس سے

---

[1] ابن ہشام ص ۲۸۷، طبقات ابن سعد ۱/ص ۱۴۷ مسند ابن حنبل ج ۵ ص ۴۲۷ بخاری کتاب ۶۳ باب ۱، ۲۷، ۴۶، [2] ابن ہشام ص ۲۸۵، ۲۹۰، [3] بخاری کتاب ۶۵ باب ۲۰ [4] سیرت ابنِ ہشام ص ۴۱۲، تاریخ طبری طبع یورپ ص ۱۵۱۱ و ما بعد، نیز قرآن مجید سورہ ۶۳ آیت ۸ کی تفسیر۔

قطع نظر وہاں ہر قبیلے کا الگ راج تھا، اور وہ اپنے اپنے سقیفے یا سائبان میں اپنے امور طے کیا کرتا تھا، کوئی مرکزی شہری نظام نہ تھا۔ تربیت یافتہ مبلغوں کی کوشش سے تین سال کے اندر شہر میں معتد بہ لوگ مسلمان ہو چکے تھے، مگر مذہب ابھی تک خانگی ادارہ تھا۔ اس کی سیاسی حیثیت وہاں کچھ نہ تھی، اور ایک ہی گھر میں مختلف مذاہب کے لوگ رہتے تھے۔ ان حالات میں آنحضرتؐ مدینے آتے ہیں، جہاں اس وقت متعدد فوری ضرورتیں تھیں:۔

(۱) اپنے اور مقامی باشندوں کے حقوق و فرائض کا تعین۔

(۲) مہاجرین مکہ کے توطن اور بسر برد کا انتظام۔

(۳) شہر کے غیر مسلم عربوں اور خاص کر یہودیوں سے سمجھوتہ۔

(۴) شہر کی سیاسی تنظیم اور فوجی مدافعت کا اہتمام۔

(۵) قریش مکہ سے مہاجرین کو پہنچے ہوئے جانی و مالی نقصانات کا بدلہ،

انھیں اغراض کے مدِ نظر آنحضرت صلعم نے ہجرت کر کے مدینے آنے کے چند مہینے بعد ہی[1] ایک دستاویز مرتب فرمائی جسے اسی دستاویز میں کتاب اور صحیفے کے نام سے یاد کیا گیا ہے، اور جسے بظاہر اشخاص متعلقہ سے گفت و شنید کے بعد ہی لکھا گیا ہے۔ یہ یاد رکھنے کے قابل ہے کہ عام قانون ملک کتاب اللہ یا قرآن کی صورت میں جیسے جیسے نافذ یا نازل ہوتا تحریری صورت میں مرتب کر دیا جاتا تھا۔ اور منکسر المزاج احتیاط پسند پیغمبر اسلام صلعم نے

---

[1] ابن سعد ج ۲/۱ ص ۱۹۔ کتاب الاموال لابی عبید ۵۱۸،

اس زمانے میں اپنے ذاتی اقوال و ہدایات کو لکھنے کی عام طور سے ممانعت فرما دی تھی۔ اس کے باوجود زیر بحث دستاویز کا لکھا جانا معنے خیز ہے جسے کتاب اور صحیفے کے اسم ناموں سے یاد کیا گیا ہے جن کے معنے دستور العمل اور فرائض نامے لکھے ہیں۔ اصل میں یہ شہر مدینہ کو پہلی دفعہ "شہری مملکت" قرار دینا اور اس کے انتظام کا دستور مرتب کرنا تھا۔

ہابس، روسو وغیرہ "معاہدہ عمرانی" کے نظریے کے تحت مملکت کا آغاز حاکم و محکوم کے عمرانی معاہدے سے قرار دیتے ہیں۔ اس کی ایک بین اور واقعی مثال ہم کو بیعتِ عقبہ میں ملتی ہے جس میں مدینے والوں نے آنحضرت صلعم کو اپنا سردار مانا، اپنے ملک میں آنے کی دعوت دی اور آپ کے احکام کی تعمیل کا اقرار کیا۔ یہی وجہ ہے کہ زیر بحث دستاویز ایک معاہدے کی شکل نہیں رکھتی بلکہ ایک فرض اور ایک حکم کی صورت میں نافذ کی جاتی ہے۔ چنانچہ سب لوگ جانتے ہیں کہ کتاب کے معنے فرض اور حکم کے بھی ہیں۔ انّ الصلٰوۃ کانت علی المؤمنین کتٰبًا موقوتًا۔ انّ کتاب الابرار لفی علیین۱۵۔ کُتِبَ علیہم القتال وغیرہ میں لفظ "کتاب" اسی معنے میں برتا گیا ہے۔ جرمن لفظ Vorschrift اور فرانسیسی و انگریزی لفظ prescription اطالوی prescrizione

---

۱۵ ابرار کے نامۂ اعمال کا جنت میں جانا بے معنے بات ہوگی۔ میں اس کے معنے یہ لیتا ہوں کہ ابرار کے متعلق طے شدہ حکم یہ ہے کہ وہ علیین میں رہیں گے۔

ہسپانوی (Prescriptum) (بمعنی فرض و حکم) کا مادہ بھی "کتابت" ہی کے معنے رکھتا ہے۔

عرب میں عام طور پر اور مدینے میں خاص طور پر جو مرکز گریزی تھی اُس کا علاج تنظیم پسند اور وحدت خواہ نبی صلعم نے یہ تجویز کیا کہ "ایک حکمراں ایک قانون"۔ ابھی تک زکاۃ اور حج کے مرکز کش احکام نہیں آئے تھے جن سے مرکزی حکومت کو ٹیکس لگانے اور وصول کرنے کا حق مل جاتا، ملک میں بزور ایک نقطے پر لوگوں کو لانے کا اور ہر حصے کے لوگوں کو ایک ہی قبلے کی زیارت کا بعد میں موقع ملا۔ پھر بھی ایمان و اعمال کے سلسلے میں ایک خدا کو ماننے، ایک ہی نبی کے احکام کی اطاعت کرنے اور مل کر ایک ہی سمت نماز پڑھنے کے ادارے وجود میں آچکے تھے۔ اب اس دستور سے اس میں ایک نہایت اہم اور عرب کے لئے انقلابی اصلاح و ترقی یہ ہوئی کہ لوگ اپنے حقوق اپنی بازیادہ سے زیادہ اپنے خاندان کی مدد سے حاصل کرنے کی جگہ انصاف رسانی کو ایک مرکزی اور پبلک ادارہ بنا دیں۔ یہ عہد آفرین کارنامہ اسی دستاویز میں رکارڈ میں لایا گیا ہے جس نے قبائلیت کی افراتفری کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ کر دیا اور ایک وسیع تر ادارے یعنی مملکت کی بنیاد ڈالی۔ اس دستاویز میں آنحضرت صلعم نے عدالتی، تشریعی، فوجی اور تنفیذی اعلیٰ ترین اختیارات اپنے لئے محفوظ فرما لیے مگر ایک نہایت اہم اور قابل ذکر فرق اس اقتدار اور دیگر ممالک کے مستبدانہ شاہی اقتدار میں یہ تھا کہ یہاں

مادیت کو دخل نہ تھا۔ آنحضرت نے سیاست میں اخلاقی عناصر داخل کئے، اصل سرچشمۂ اقتدار خدا کو قرار دیا اور اپنے کو اس کا رسول اور نائب اور نافذ ہی امت کے لئے لائے ہوئے احکام اپنے پر بھی مساوی طور پر واجب التعمیل قرار دیئے۔ اور عہد نبوی میں ذات اقدس کے خلاف دیوانی اور ٹارٹ (ضمان) کے جو مقدمات دائر ہوئے[۵۱] ان نظائر کی موجودگی میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ اسلام نے King can do no wrong (بادشاہ کسی فعل ناجائز کا مرتکب ہو ہی نہیں سکتا) کو مسترد کر دیا۔ اور جب ملک کا قوی ترین شخص قانون کی خلاف ورزی پر عدالتی داروگیر سے محفوظ نہ رہ سکے تو دیگر عہدہ دار اور عام لوگ بھی تعمیل زیادہ توجہ کے ساتھ کرینگے۔ اس دستاویز کے دو نمایاں حصے ہیں:-

حصہ اول میں (۲۵) فقرے ہیں جن کو ولہا وزن نے (۲۳) قرار دیا تھا اور جملہ یورپی مولفوں نے ولہا وزن ہی کے نمبرات برقرار رکھے ہیں، میں نے بھی مجبوراً (۲۳) ہی نمبرات دیئے، البتہ ضمن الف و ب کر کے دو دفعات کو دو حصوں میں بانٹ دیا اور اس طرح ان کے (۲۵) دفعات قرار دیئے تاکہ یورپی مواد سے استفادے میں کسی کو الجھن پیدا نہ ہو۔

---

۵۱ ابن ہشام ص ۴۴۴ - نیز تاریخ ابن الاثیر ذکر احوال مرض موت آنحضرت صلعم۔ و سیرۃ شامی، بہ موقع جہاں چھے آٹھ مقدموں کا ذکر ہے۔

حصہ دوم ۲۴ تا ۴۷ پر مشتمل ہے لیکن ضمنی تقسیم متعدد فقرات ہیں کرنی پڑی، میرے حساب سے یہ حصہ (۲۸) فقرات پر مشتمل ہے اور جملہ دستاویز میں (۵۲) فقرات یا دفعات ہیں۔

پہلے (۲۳) دفعات مہاجرین و انصار کے متعلق قواعد پر مشتمل ہیں اور بقیہ حصہ مدینے کے یہودی قبائل کے حقوق و فرائض سے بحث کرتا ہے، ان دونوں میں ایک جملہ دہرایا گیا ہے کہ آخری عدالت مرافعہ محمد رسول اللہ کی ذات ہوگی۔ مسلمان مہاجرین و انصار رضی اللہ عنہم کی حد تک تو کوئی دشواری نہیں لیکن یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ہجرت کے چند مہینوں بعد ہی ایک نو وارد اجنبی صلعم کو اتنا بڑا اقتدار غیر مسلم طبقات نے دیدینا کس طرح منظور کیا؟ مدنی عربوں کی حد تک یہ جواب ایک حد تک تشفی بخش سمجھا جاسکتا ہے کہ چونکہ وہاں اب تک قبائلی نظام تھا اور قبائلی سرداروں نے اسلام قبول کر لیا تھا اس لئے اپنے بزرگان خاندان کا مذہب قبول نہ کرتے ہوئے بھی ان کے خورد تر رشتہ دار انھیں کی سی کرنے پر مجبور تھے۔ عربی سماج کے باعث وہ خاندان اور قبیلے سے الگ نہ ہو سکتے تھے اور بیرون ملک بھی وہ اپنے باقی رشتہ داروں کی مدد کے بغیر جان و مال کا کوئی امن نہیں پاسکتے تھے۔ دستاویز میں صراحت سے یہ بتایا گیا ہے کہ تمام مدنی قبائل اور مہاجرین مکہ وغیرہ کی مرکزائی ہوئی زبردست قوت سے انصار کے مشرک رشتہ داروں کو متمتع ہونے کا صرف اس شرط سے موقع دیا جاتا ہے کہ وہ سیاسی حیثیت سے مرکزی حکومت کی پالیسی

میں رکاوٹیں نہ ڈالیں۔ چنانچہ حکم دیا گیا ہے کہ عربی قبائل میں جو مشترک یا یہودی المذہب لوگ ہیں وہ مسلمانوں کے تابع اور جنگ میں معاون ہوں اور وہ قریش مکہ کی جان و مال کو نہ تو خود کوئی امان دیں اور نہ اس بات میں آڑے آئیں کہ مسلمان کسی قریشی کی جان و مال پر حملہ کریں۔ دوسرے الفاظ میں ان کو قریشیوں سے حلیفی کو توڑنے، تعلقات کو منقطع کرنے اور مسلمان اور قریشیوں کے تعلقات میں غیر جنبہ دار رہنے کی شرط پر حقوق شہریت عطا کئے گئے اور انھیں اس کو منظور کرنا پڑا۔ ہمیں ایسے بھی بیانات عرب مولفوں کے ہاں ملتے ہیں کہ مدینے کے عرب برادرکشی اور باہمی لڑائیوں سے اکتا گئے تھے اور تنگ آکر اس پر آمادہ ہو چکے تھے کہ کسی اجنبی غیر جانبدار کو حکمراں بناکر آئندہ امن کی زندگی بسر کریں۔[۵۱] یہ عربی غیر مسلموں کا ذکر تھا

یہودیوں کا بھی اسی ابتدائی زمانے میں آنحضرت کے سیاسی اقتدار کو مان لینا قرین قیاس نہیں۔ میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ دستور کا حصۂ دوم، یعنی یہودیوں کا دستورالعمل، جنگ بدر کے بعد کا واقعہ ہے جبکہ ایک زبردست فتح سے مسلمانوں کی دھاک ہر طرف بیٹھ گئی تھی اہل مدینہ نے اپنے سابقہ معاہدات حلیفی جو یہودیوں کے ساتھ تھے منسوخ کر لئے تھے۔ آنحضرت نے آس پاس ینبوع تک کے قبائل مثلاً بنی ضمرہ، جہینہ وغیرہ سے حلیفیاں کر کے مسلمانوں کی قوت کو بے حد مضبوط اور مستحکم بنا دیا تھا۔

---

۵۱ ملاحظہ ہو اوپر صفحہ ۶۹

یہودیوں کے دو بڑے گروہ آپس کے حریف و رقیب تھے۔ ان کا مل کر رہنا اور الگ مستقل رہ کر بچت اور محفوظ رہنا ممکن نہ تھا، اور وہ ہر طرف سے بگاڑ کر کے بے یار و مددگار اور ہر قوی کا شکار بنے ہوئے تھے۔ ان حالات نے انہیں مجبور کیا کہ اپنی مذہبی آزادی، اور اندرونی خود مختاری برقرار رکھتے ہوئے آنحضرتؐ سے ماتحتانہ تعاون کریں اور جیسا کہ عرض کیا گیا میرے خیال میں یہ جنگ بدر کے بعد کا واقعہ ہو سکتا ہے، اس سے پہلے کا ہونا قرین قیاس نہیں۔ اگرچہ پوری دستاویز ایک ہی کل کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کی عبارت و انداز اسلوب سے بھی ایک ہی مرتب کنندہ کا ہونا پایا جاتا ہے اور مسلمان مورخ عام طور سے یہ بیان کرتے ہیں کہ یہ دستاویز ۱ھ کی ابتدا میں مرتب ہوئی لیکن یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ۱ھ میں دستاویز کا حصہ اول مرتب ہوا ہو، اور بقیہ حصہ ۲ھ میں جنگ بدر کے بعد مرتب کر کے حصہ اول کے ساتھ شامل کر دیا گیا ہو۔ اس کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ لسان العرب[۱۵] میں اس دستاویز کا جہاں کہیں ذکر آیا ہے وہاں اس کو دو نام دیے گئے ہیں، ایک جملے میں اسے "کتابہ للمہاجرین والانصار" کہہ کر اسے "دستور العمل مہاجرین وانصار" سے یاد کیا گیا ہے اور اسی سے ذرا نیچے حصہ دوم کے سلسلے میں "ذو قم فی کتاب رسول اللہ صلعم لیہود" یا "دستور العمل یہودیاں" کی اصطلاح برتی گئی ہے

---

۱۵ تحت کلمہ "ربع"

ایک اور زیادہ راست شہادت اس سے ملتی ہے کہ امام ابوداؤد نے اپنی سنن[۵] میں یہودیوں کے اس دستور العمل کو جنگ بدر کے بعد کا قرار دیا ہے۔

جیسا کہ عرض ہوا اس دستور کے دو نمایاں اور ممتاز حصے ہیں ایک اسلامی و عربی قبائل سے متعلق ہے اور دوسرا یہودیوں سے، ہر ایک کی مختصر تحلیل یہاں بے محل نہ ہوگی۔

سب سے پہلے فقرے میں ایک اسلامی سیاسی وحدت کے قیام کا اعلان کیا گیا ہے جس میں مہاجرین مکہ، انصار مدینہ اور وہ لوگ جو ان سب کے تابع و لاحق رہ کر ان کے ہمراہ جنگ میں حصہ لینے پر آمادہ ہوں اور یہ سیاسی وحدت "محمد النبی رسول اللہ" کے احکام کی اطاعت کرے گی۔ (ف ۱)۔ اور اس اسلامی حصے کے سب سے آخری فقرے میں بھی مکرر اسی چیز کو دہرایا گیا ہے کہ منبع اقتدار تو ذات خداوندی ہے لیکن لوگ خدا کے بھیجے ہوئے حضرت محمدؐ کی اطاعت کریں گے اور اپنے جملہ اختلافوں جھگڑوں میں ان سے ہی رجوع ہوں گے اور آن کے فیصلے کو آخری مانیں گے (ف ۲۳)۔ یہ سیاسی وحدت باوجود اندرونی بوقلمونی کے "امت واحدہ" سمجھی جائے گی اور تمام دنیا کے مقابل ایک ممتاز اور مستقل حیثیت رکھے گی، اور جملہ مسلم طبقات کو یکساں حقوق و واجبات حاصل ہوں گے (ف ۲)۔ اور باوجود کمی تعداد و کمزوری و خطرات کے ان میں خود داری اور راہ راست پر

---

[۵] سنن ابی داؤد کتاب ۱۹ باب ۲۱

ہونے کے جذبات پیدا کئے گئے (ف ۲۱ ۱۳)۔ جنگ و صلح کو مرکزی مسئلہ قرار دیا گیا، اور یہ نہیں ہو سکے گا کہ چند صلح یا جنگ کریں اور باقی نہ کریں۔ جنگی خدمت جبری و لازمی ہوگی۔ اور سب اس میں برابر کا حصہ لیں گے، عین حالتِ جنگ میں بھی نوبت نوبت فوجیں لڑیں گی اور آرام پائیں گی، یہ نہیں کہ پورا بار ایک ہی طبقے پر پڑے (ف ۱۷-۱۸)۔ جنگ و صلح تو مرکزی مسئلہ ہوں گے۔ البتہ حسب سابق پناہ دہی کا حق انفرادی طور سے ہر چھوٹے بڑے سب کو حاصل ہوگا اور ادنیٰ ترین شخص کے دیئے ہوئے وعدۂ پناہ کا بھی پوری امت احترام کرے گی (ف ۱۵)۔ اور اس طرح اخوت و مساوات اور آزادی عمل اس سیاسی وحدت میں عملی طور سے جاری و ساری کر دی گئی پناہ دہی کی اس آزادی میں ایک شرط لگائی گئی کہ جو مشرکین عرب اس سیاسی وحدت میں حقوق رعیت حاصل کرنا چاہیں ان کے لئے یہ پابندی ہوگی کہ وہ قریش کی جان و مال کو کسی طرح کی پناہ نہ دیں گے اور نہ اس بات میں آڑے آئیں گے کہ قریش کی جان و مال کو مسلمان اپنے حقوق حربیت کے سلسلے میں نقصان پہنچائیں (ف ۲۰ ب)۔ اس دفعے کے سلسلے میں دو واقعات قابل ذکر ہیں جن کا امام بخاری[۱۵] نے ذکر کیا اور جو دونوں جنگ بدر سے پہلے پیش آئے تھے ان دونوں میں دو بڑی مسلمان شخصیتوں نے بعض قریشی افراد سے دوستانہ تعلقات کی بنا پر ان کی جائداد کی حفاظت کا ذمہ لیا تھا۔ بلے شبہہ

---

۱۵ بخاری کتاب ۴۹ باب ۳ نیز کتاب ۶۴ باب ۲۔

دفعے میں قریش کو پناہ دینے کی ممانعت صرف مشرک رعایا کو کی گئی ہے لیکن قیاس یہ چاہتا ہے کہ مسلمان بھی اس کے پابند تھے اور بلا صراحت وہ اس پر عمل کرتے تھے اسی بنا پر میرا خیال ہے کہ یہ دفعہ ابتدائی دستور میں نہ تھی بعد میں جنگ بدر کے اختتام پر یہودی قبائل سے معاہدے کے وقت یا کسی قریبی موقع پر اس اصل دستور میں اضافہ کی گئی۔ جنگ کے سلسلے میں جملہ مسلمانوں کو ایک دوسرے کا مددگار اور دکھ درد میں حصہ دار رہنے کا حکم دیا گیا (ف ۱۹)۔ عدل گستری کے سلسلے میں آخری عدالت مرافعہ جہاں ذات رسالت پناہی صلعم کو قرار دیا گیا وہیں ہرجے اور خونبہا (ضمان و دیت) کی ادائی کے لئے قدیم نظام ہی کی توثیق و تشریح کی گئی کہ اگر کوئی شخص کسی رقمی ادائی کا مستوجب ہو تو اس کی مدد اس کے سب رشتہ دار کریں گے۔ اسی طرح اگر کوئی شخص دشمن کے ہاتھوں قید ہو جائے اور فدیہ ادا کرنا ہو تو اس کے اہل قبیلہ ہی اس ادائی کے ذمہ دار ہوں گے (ف ۴)۔ اس سلسلے میں ایک طرح سے شہر کی محلہ وار تقسیم کی گئی اور ہر قبیلے کے لوگ دوسروں سے الگ یکجا ہی رہتے تھے، اور ہر محلے میں ایک میر محلہ اور متعدد نائبان میر محلہ اور اجتماع گاہ پائے جاتے تھے جن کو علی الترتیب نقیب، عریف اور سقیفہ کہتے تھے۔ کوئی محلہ وار فنڈ یا خزانے کا پتہ تو نہیں چلتا[۱۵] غالباً حسب

ف ۵ لیکن بنو النضیر کے یہودیوں میں قبیلہ داری بیت المال تھا چنانچہ سیرۃ شامی میں غزوہ سویق کے بیان میں لکھا ہے "سلام بن مشکم وکان (بقیہ صفحہ ۹۰ پر)

ضرورت چندہ ہوتا ہوگا۔ یہ محلہ وار مجلسیں بڑی حد تک خود مختار اور خود اکتفا تھیں۔ انصار کے قبائل تو معین تھے ہی اب ان عدالتی و سماجی اغراض کے لئے جملہ مہاجرین کا بھی ایک قبیلہ قرار دیا گیا (ف ۳) اور یہ قرار دیا گیا کہ اگر کوئی محلہ وار مجلس اپنے کسی اہل محلہ کی ذمہ داریوں کو پورا کرنے کے قابل نہ ہو تو دیگر مجالس بھی ہاتھ بٹانے کی پابند ہوں گی (ف ۱۲) اور یہ بھی صراحت سے بتا دیا گیا کہ اگر کسی قبیلے میں کوئی موالی ہوں یعنی کسی فرد سے قانونی اور معاہداتی بھائی چارہ کر کے اس قبیلے کے رکن بنے ہوں تو ایسے موالی کو اپنے اصل سے اختلاف کا حق نہ ہوگا (ف ۱۲ ب) اس نظام ولاء کے سلسلے میں یہ بھی حکم دیا گیا کہ ایک شخص کے مولا کو کوئی دوسرا شخص بلا اجازت اصل اپنا مولا نہ بنا لے۔ (ایضاً بروایت ابن حنبل)۔ انصاف رسانی کا اختیار افراد سے لے کر جماعت یعنی مرکز کے سپرد کر دیا گیا جو ایک عظیم الشان انقلاب تھا، اور حکم دیا گیا کہ انصافی مسائل میں جانبداری کر لے اور اپنے رشتہ داروں کی پچ کرنے بلکہ خود حقیقی

(بقیہ نوٹ صفحہ ۸۹) سید بنی النضیر فی زمانہ ذلک وصاحب کنزھم ..... یعنی بالکنز المال الذی کانوا یجمعونہ لنوائبہم و ما یعرض لھم "۔ (یعنی سلام بن مشکم اس زمانے میں بنو النضیر کا سردار اور ان کا افسر خزانہ تھا ..... خزانے سے مراد یہاں وہ مال ہے جو وہ اتفاقی حوادث اور ضروریات کے لئے جمع کیا کرتے تھے۔)

سے بیٹے تک کو بچانے کی کوشش کرنے کی کسی کو اجازت نہ ہوگی اور جملہ مسلمان اس بات کی کوشش کریں گے کہ ہر ضرر پہنچانے یا ضرر پہنچانے کی تیاری کرنے والے شخص کو کیفر کردار تک پہنچانے میں پوری طرح ہاتھ بٹائیں (ف ۱۳)۔ قتل عمد کی سزا قصاص مقرر کی گئی البتہ مقتول کے ولی کو اختیار دیا گیا ہے کہ دیت لے کر قصاص سے درگزر کرے۔ اور انصاف رسانی میں مداخلت کی سختی سے ممانعت کی گئی (ف ۲۱)۔ اسلام کی حقانیت جتانے اور اس کا بول بالا کرنے کے لئے مسلمانوں کو مشورہ دیا گیا کہ اگر ان کا کوئی غیر مسلم رشتہ دار کسی مسلمان کے ہاتھوں مارا جائے تو قصاص پر اصرار نہ کریں اور کسی مسلمان کے خلاف کسی غیر مسلم کی مدد نہ کریں (ف ۱۴)۔

اسی طرح کسی قاتل مجرم کو پناہ یا مدد دینے کی ممانعت کی گئی اور کہا گیا کہ جو خدا اور قیامت پر ایمان لایا ہے اور جس نے اس دستاویز کے احکام کی تعمیل کا اقرار کیا ہے، اگر وہ کسی قاتل کو مدد یا پناہ دے تو قیامت کے دن اس پر خدا کی لعنت اور غضب نازل ہوں گے اور اس کی رستگاری کی کوئی صورت نہ ہوگی۔

انصار کے بعض لوگ یہودیت قبول کر چکے تھے، خاص کر بعض بچوں کو اُن کے والدین منت مان کر یہودی بنا دیتے تھے۔ اُن کے متعلق بھی ایک خصوصی دفعہ رکھ دی گئی کہ اگر وہ ماتحتانہ اتحاد عمل پر آمادہ ہوں تو انہیں سب مسلمانوں کے برابر حقوق رعیت حاصل ہوں گے۔ ان کی حفاظت و مدد کی جائے گی اور ان پر کوئی ظلم روا نہیں رکھا جائیگا (ف ۱۶)۔

یہاں تک ان امور کا ذکر ہوا جو حصہ اول میں مندرج ہیں اور جو مدینے کے عربوں سے متعلق ہیں۔ حصہ دوم یہودیوں کے قبائل سے متعلق ہے۔

اوپر اس امر سے بحث ہو چکی ہے کہ آیا یہودیوں کا یہ دستور انصار و مہاجرین کے قواعد کے ساتھ ہی بنایا گیا یا بعد۔ اس حصے کی مختصر تحلیل کے سلسلے میں عرض ہے کہ اس کی پہلی دفعہ مشترک ہے کہ کسی جنگ کی صورت میں اگر مسلمان اور یہودی اتحادِ عمل کریں تو ہر حلیف اپنے مصارفِ جنگ خود برداشت کرے گا اور یہ حکم نہ صرف دفعہ ۲۴ میں بیان ہوا ہے بلکہ دفعہ ۳۷ الف اور دفعہ ۳۸ میں بھی دہرایا گیا ہے اور غالباً دفعہ ۴۵ ب کی مبہم عبارت کا بھی یہی منشا ہے کہ (علی کل اناس حصتہم من جانبہم الذی قبلہم) جس کو ابو عبید نے "وحصتہم من النفقۃ" لکھا ہے۔ اس تکرار کی وجہ غالباً یہی تھی کہ مالی معاملات میں یہودی بہت بدنام تھے ان کی بدمعاملگی کو "لیس علینا فی الامیین سبیل" اور "منہم من ان تامنہ بدینار لا یؤدہ الیک" وغیرہ آیاتِ قرآنی میں بھی طشت از بام کیا گیا ہے۔ جب مصارف برداشت کرنے کی ذمہ داری تھی تو ظاہر ہے کہ انھیں مالِ غنیمت کو پانے کا بھی حق حاصل تھا جیسا کہ ابو عبید نے اپنی شرح میں صراحت بھی کی ہے۔[۵] یہودیوں نے بھی آنحضرت کے سیاسی اقتدار کو مان لیا تھا اور ہر اختلاف میں آنحضرت کے فیصلے کو آخری تسلیم کر لیا تھا، جیسا کہ دفعہ ۴۲ میں نہایت صراحت سے

---

[۵] روض الانف للسہیلی ج ۲ ص ۱۷۔ کتاب الاموال لابی عبید دفعہ ۵۱۵

قرار دیا گیا ہے۔ لیکن یہ عجیب بات ہے کہ ف۲۵ میں "یہودی اپنے مذہب پر اور مسلمان اپنے مذہب پر" کہہ کر دینی آزادی اور رواداری کا اعلان کرنے کے باوجود ف۴۲ میں ابن اسحاق کی روایت میں "محمد رسول اللہ" اور ابو عبید کی روایت میں "محمد النبی" کے الفاظ برتے گئے ہیں اور ف۴۷ میں ابن اسحاق کے ہاں "محمد رسول اللہ" کا کلمہ مکرر آیا ہے گو ابو عبید کی روایت میں یہ جملہ حذف کر دیا گیا ہے۔ اس کے معنے غالباً یہ تو نہیں ہوں گے کہ ان یہود نے آنحضرت کی رسالت یا نبوت مان لی بلکہ ان تاریخی کتابوں کے کسی باادب کاتب نے یہ لفظ بڑھائے ہوں گے (کیوں کہ ابن اسحاق کے ہاں دونوں جگہ آخر میں صلی اللہ علیہ وسلم بھی لکھا ہے جو خود آنحضرت کا اپنے متعلق لکھنا قرین قیاس نہیں ہے) یا یہ کہا جا سکتا ہے کہ "نبی" یا "رسول اللہ" کا لفظ آنحضرت نے خود لکھا تھا اور یہودیوں نے اپنی خطرناک سیاسی و جنگی حالت کے مدنظر اس پر اعتراض کی جرات نہ کی۔ "صلی اللہ علیہ وسلم" کے استعمال کے متعلق سیرۃ ابن ہشام ص ۹۹۲ سطر ۳ سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ خطبے وغیرہ میں آنحضرت اس کا بطور دعا خود بھی اپنے متعلق استعمال فرمایا کرتے تھے۔ اس ذیلی بحث سے قطع نظر اس دستاویز میں دس یہودی قبائل کا فرداً فرداً اور نام بنام ذکر کیا گیا، اور ان کے حقوق کی مساوات تسلیم کی گئی۔ اس کا منشا بظاہر یہ ہے کہ یہودیوں نے ایک جماعت بنا کر اس وفاقی شہری مملکت مدینہ میں شرکت نہیں کی بلکہ ہر قبیلہ ایک علاحدہ وحدت کی حیثیت سے داخل

ہوا۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ اگر مسلمانوں نے چند یہودی قبائل سے جنگ کی یا انہیں مدینے کی سرزمین سے نکل جانے کا حکم دیا تو نہ صرف باقی قبائل خاموش رہے بلکہ بعض مواقع پر انہوں نے مسلمانوں کی جنگی مدد بھی کی اور اس جنگ کے باوجود یہ معاہدہ یا دستور دیگر یہودی قبائل کی حد تک باقی رہا، منسوخ نہیں سمجھا گیا۔ چنانچہ اس دستور میں خونبہا کی ادائی میں اہل قبیلہ اور موالی مشترکہ طور پر ذمہ دار قرار دئے گئے تھے اور بنی قینقاع کے اخراج کے بعد بنوالنضیر سے اسی قرارداد مندرجہ ف۲۵ و ف۳۱ کے تحت آنحضرت نے ایک موقع پر چندہ دینے کا مطالبہ کیا تھا[۵]۔ یہودیوں کو مسلمان رعایا کے ساتھ سیاسی و تمدنی حقوق میں صراحت سے مساوات دی گئی (ف۲۵)، اور یہودیوں کے معاہداتی رشتہ داروں کو جنہیں موالی، بطن اور بطانہ کا نام دیا گیا ہے حقوق اور ذمہ داریوں میں عام اور اصلی یہود کے برابر مان لیا گیا ہے (ف۳۲ ف۳۰ ف۳۴ ف۳۵ ف۳۶)۔ البتہ پناہ گزیں بلا اجازت پناہ دہندہ کسی اور کو پناہ نہیں دے سکتا (ف۴۱)۔ یہودیوں سے اصل میں ایک جنگی حلیفی کی گئی تھی چنانچہ ف۳۷ ف۴۴ اور ف۴۵ میں صراحت سے قرار دیا گیا ہے کہ وہ ان سب سے لڑیں گے جن سے مسلمان لڑیں اور ان سب سے صلح کریں گے جن سے مسلمان صلح کریں اور مدینے کی مدافعت

---

[۵] ابن ہشام ص ۶۵۲ ۔ ابن سعد ج ۲/۱ ص ۴۰ تا ۴۱ ۔ تاریخ طبری طبع یورپ ص ۱۴۴۹ تا ۱۴۵۰۔

میں مشترکہ حصہ لیں گے اور مسلمانوں پر کوئی حملہ آور ہو تو یہودی مسلمانوں کو مدد دیں گے اور یہود پر کوئی حملہ آور ہو تو مسلمان، یہودیوں کو مدد دیں گے، البتہ دینی جنگوں میں جو مسلمان اختیار کریں یہودیوں کو ہاتھ بٹانے کی ذمہ داری نہ ہوگی (ف ۴۵)۔ نیز مسلمان کے ساتھ فوج میں ان کی شرکت آنحضرت کی اجازت پر منحصر رکھی گئی (ف ۳۶ الف)۔ اس دفعے کی عبارت کسی قدر مبہم ہے اور یہ معنے بھی نکلتے ہیں کہ یہودی آنحضرت کی اجازت کے بغیر خود بھی مستقلاً کسی سے جنگ نہیں کر سکتے۔ اگر یہ واقعہ ہے تو آنحضرت کے سیاسی اقتدار کی مزید وسعت ظاہر ہوتی ہے۔ اس اہم قرارداد سے سب سے پہلے اور سب سے زیادہ تکے قریش متاثر ہوئے ہوں گے جو مسلمانوں کے خلاف مدد دے سکنے والے ایک اہم حلیف یعنی یہودیوں کی اعانت سے محروم کر دیے گئے جیسا کہ ف ۴۳ میں قرار دیا گیا ہے کہ یہودی قریش اور قریش کے مددگاروں کو کوئی پناہ نہیں دیں گے، گو بدقسمتی سے عمل اس پر نہ ہوا اور یہودی سردار برابر قریش سے سازش کرتے رہے اور جنگ بدر کی شکست کے بعد اس کا سلسلہ جو شروع ہوا تو بنو قریظہ کی بلا شرط اطاعت تک برابر جاری رہا[1]۔ بہرحال صلح و جنگ کو وفاق کا بلا شرط ایک مرکزی مسئلہ قرار دے دیا گیا، اور جنگ کی کمان آنحضرت کو حاصل

---

[1] البدایہ والنہایہ لابن کثیر ج ۴ ص ۶۔ ابن ہشام ص ۶۸۱ نیز:—
. Jewish Foundation of Islam by Torrey P. 130

ہوگئی جو آنحضرت کی زبردست سیاسی کامیابی تھی۔

سماجی اور اندرونی مسائل میں آنحضرت نے کوئی مداخلت نہیں کی اور فدیہ، دیت اور جوار یا پناہ دہی اور معاہداتی رکنیتِ قبیلہ کے ادارات اور رواجات کو برقرار رکھا گیا (ف ۲۵ ف ۳۱ ف ۴۰)۔ اس فرزانہ سیاست کا نتیجہ یہ نکلا کہ کسی کو ہچکچاہٹ اور گھبراہٹ نہیں ہوئی اور یہودیوں نے خوشی سے اس کو منظور کر لیا کہ آنحضرت اُن کی بھی آخری عدالت مرافعہ کے فرائض انجام دیں (ف ۴۲)۔ نظائر سے معلوم ہوتا ہے کہ یہودیوں کے مقدمات میں آنحضرت ان کے شخصی قانون ہی کے مطابق فیصلے فرمایا کرتے تھے۔ جنگ و صلح کی طرح یہودیوں کی عدل گستری کو بھی (ف ۲۶ میں) صراحت کے ساتھ مرکزی مسئلہ قرار دیا گیا۔ اور انصاف میں رشتہ داری وغیرہ کے باعث دخل دہی کی قطعی ممانعت کی گئی اور قدیم زمانے کے انتقامات اور انتقام کے انتقامات کا لامتناہی سلسلہ یک لخت روک دیا گیا۔ آنحضرت کا یہودیوں پر عدالتی اقتدارِ اعلیٰ بھی مسلمانوں کے لئے بڑی سیاسی فتح تھی۔ یہودیوں نے نہ صرف آنحضرت کو اپنا مقتدرِ اعلیٰ تسلیم کر لیا بلکہ شہر مدینے و مضافات (جوف) کو ایک حرم بھی تسلیم کیا (ف ۳۹)۔ مکہ ایک حرم تھا۔ شہر طائف کی حرمت کو ۹ھ کے معاہدۂ طائف میں بھی تسلیم اور برقرار رکھا گیا (دیکھئے کتاب الاموال لابی عبید ف ۵۰۶)۔ یہودیوں سے ایک نیم عرب شہر کو حرم مقدس منوا لینا بھی آنحضرت صلعم کا ایک سیاسی کارنامہ تھا اور اس طرح ایک چھوٹی سی بستی کو جو بس ایک نخلستان پر

مشتمل تھی شہری مملکت کی صورت میں منظم کیا گیا، اور اس کی قلیل لیکن بوقلموں و کثیر الاجناس آبادی کو ایک لچکدار اور قابلِ عمل دستور کے تحت ایک مرکز پر متحد کیا گیا، اور ان کے تعاون سے شہر مدینہ میں ایک ایسا سیاسی نظام قائم کر کے چلایا گیا کہ وہ بعد میں ایشیا، یوروپ اور افریقہ کے تین براعظموں پر پھیلی ہوئی ایک وسیع اور زبردست شہنشاہیت کا بلا کسی دقت کے صدر مقام بھی بن گیا۔ یوروپ کے لفظ پر آپ حیران نہ ہوں، عہد بنی امیہ سے بہت پہلے حضرت عثمانؓ کے زمانے میں سنہ ۲۷ھ میں مسلمانوں کی فوجیں اندلس میں داخل ہو گئیں اور مزید کمک نہ ملنے کے باوجود وہیں مقیم اور ملک کے ایک حصے پر قابض رہیں تا آں کہ بہت دنوں کے بعد طارق آتا ہے اور اندلس کی فتح کو مکمل کرتا ہے، عہدِ عثمانی کی اس مہم کا ذکر طبری[1] اور گبن[2] نے بھی کیا ہے، اور سب جانتے ہیں کہ عہدِ عثمانی تک مدینہ ہی مرکزِ خلافت تھا۔

اس دستاویز میں ایک جگہ لفظ "دین" بھی برتا گیا ہے۔ اس لفظ میں بیک وقت مذہب اور حکومت دونوں کا مفہوم پایا جاتا ہے اور یہ ایک ایسا اہم امر ہے کہ اس کو پیشِ نظر رکھے بغیر مذہبِ اسلام

---

[1] تاریخ طبری ص ۲۸۱۷۔

[2] Decline and Fall of The Roman Empire, V, p. 555.

اور سیاسیات اسلام کو اچھی طرح نہیں سمجھا جا سکتا۔

یہاں اس دستور کے متن کا ترجمہ بے محل نہ ہوگا۔

اصل متن دستور کے ماخذ

۱۔ سیرۃ ابن ہشام (طبع یوروپ) ص ۳۴۱ تا ۳۴۴

۲۔ سیرۃ ابن اسحاق (ترجمۂ فارسی، مخطوطۂ پارس) ورق ۱۰۱

۳۔ کتاب الاموال مولفہ ابوعبید قاسم بن سلّام (طبع مصر) فقرہ ۵۱۷

۴۔ البدایہ والنہایہ مولفہ ابن کثیر۔ ج ۳ ص ۲۲۴ تا ۲۲۶

۵۔ سیرۃ ابن سید الناس۔ احوال بعد ہجرت کے ضمن میں۔

متن کے اقتباسات کے ماخذ

۱۔ سنن ابی داؤد۔ کتاب ۱۹۔ باب ۲۱۔

۲۔ مسند احمد بن حنبل۔ ج ا ص ۲۷۱۔ ج ۲ ص ۲۰۴۔ ج ۳ ص ۲۴۲۔

۳۔ تاریخ الطبری (طبع یوروپ سلسلۂ اول) ص ۱۲۶۲، ۱۳۵۹۔

۴۔ لغت لسان العرب مولفہ ابن منظور تحت مادہ ہائے "بدء" وسع عقب عقل، فرح، وتغ"۔

۵۔ طبقات ابن سعد ج اقسم دوم ص ۱۷۲۔

اس موضوع پر یورپی زبانوں کے مضامین

1. Wellhausen Gemeindeordnung von Medina, (in:Skizzen und Vorarhbeiten, vol. 4, Nr. 2.)
2. Caetani, Annali dell 'Islam, anno 1, §. 43.
3. Wensinck, Mohammed en de Joden te Medina, pp. 78 et Saq.
4. Buhl, Das Leben Mohammeds, pp. 210-212.
5. Sprenger, Das Leben und die Lehre des Mohammed. vol. 3, pp. 15-18.
6. Grimme, Mohammed, pp. 75-81.
7. Mueller, Der Islam in Morgen- und Abeneland, vol. 1, pp. 15-18.
8. Majid Khaddusi, The Law of War and Peace in Islam p. 84-87.
9. Hamidullah, Administration of Justice in Early Islam Islamic Culture, quartly, Hyderabad. vol. XI pp. 163-72.
10. La Diplomatie musulmane, in loco.

ترجمہ دستور مملکت مدینہ بعہد نبوی ؐ

(کوشش کی گئی کہ ترجمہ واضح ہو اور سمجھنے کے لئے کسی حاشیے
کی ضرورت نہ رہے۔ اور فقرات پر نمبر بھی لگا دئے گئے ہیں تاکہ
حوالے میں سہولت رہے۔ یہ نمبر چونکہ معین ہو چکے ہیں اور جرمنی
ہالینڈ، اٹلی وغیرہ ہر جگہ ایک ہی ہیں اس لئے جہاں مجھے اختلاف
کرنا پڑا وہاں الف، ب کر کے ذیلی تقسیم کی گئی ہے اور بین الاقوامی
نمبروں کو باقی رکھا گیا ہے)

رحم والے اور مہربان خدا کے نام سے۔

ف ۱۔ یہ ایک حکمنامہ ہے نبی اور اللہ کے رسول محمد ﷺ کا قریش اور اہل
یثرب میں سے ایمان اور اسلام لانے والوں اور ان لوگوں کے
مابین جو ان کے تابع ہوں اور ان کے ساتھ شامل ہو جائیں
اور ان کے ہمراہ جنگ میں حصہ لیں۔

ف ۲۔ تمام (دنیا کے) لوگوں کے بالمقابل ان کی ایک علیحدہ سیاسی
وحدت (امت) ہوگی۔

ف ۳۔ قریش سے ہجرت کر کے آنیوالے اپنے محلے کے (ذمہ دار)
ہوں گے اور اپنے خونبہا باہم مل کر دیا کریں گے اور اپنے ہاں
کے قیدی کو خود فدیہ دے کر چھڑائیں گے تاکہ ایمان والوں کا

باہمی برتاؤ نیکی اور انصاف کا ہو۔

ف۴ - اور بنی عوف اپنے محلے کے ذمہ دار ہوں گے اور حسب سابق اپنے خونبہا باہم مل کر دیا کریں گے اور ہر گروہ اپنے ہاں کے قیدی کو خود فدیہ دے کر چھڑائے گا تاکہ ایمان والوں کا باہمی برتاؤ نیکی اور انصاف کا ہو۔

ف۵ - اور بنی الحارث بن خزرج اپنے محلے کے ذمہ دار ہوں گے اور حسب سابق اپنے خونبہا باہم مل کر دیا کریں گے اور ہر گروہ اپنے ہاں کے قیدی کو خود فدیہ دے کر چھڑائے گا تاکہ ایمان والوں کا باہمی برتاؤ نیکی اور انصاف کا ہو۔

ف۶ - اور بنی ساعدہ اپنے محلے کے ذمہ دار ہوں گے اور حسب سابق اپنے خونبہا باہم مل کر دیا کریں گے اور ہر گروہ اپنے ہاں کے قیدی کو خود فدیہ دے کر چھڑائے گا تاکہ ایمان والوں کا باہمی برتاؤ نیکی اور انصاف کا ہو۔

ف۷ - اور بنی جشم اپنے محلے کے ذمہ دار ہوں گے اور حسب سابق اپنے خونبہا باہم مل کر دیا کریں گے اور ہر گروہ اپنے ہاں کے قیدی کو فدیہ دے کر چھڑائے گا تاکہ ایمان والوں کا باہمی برتاؤ نیکی اور انصاف کا ہو۔

ف۸ - اور بنی النجار اپنے محلے کے ذمہ دار ہوں گے اور حسب سابق اپنے خونبہا باہم مل کر دیا کریں گے اور ہر گروہ اپنے ہاں کے

قیدی کو خود فدیہ دے کر چھڑائے گا تاکہ ایمان والوں کا باہمی برتاؤ نیکی اور انصاف کا ہو۔

۹۔ اور بنی عمرو بن عوف اپنے محلے کے ذمہ دار ہوں گے اور حسب سابق اپنے خونبہا باہم مل کر دیا کریں گے اور ہر گروہ اپنے ہاں کے قیدی کو خود فدیہ دے کر چھڑائے گا تاکہ ایمان والوں کا باہمی برتاؤ نیکی اور انصاف کا ہو۔

۱۰۔ اور بنی النبیت اپنے محلے کے ذمہ دار ہوں گے اور حسب سابق اپنے خونبہا باہم مل کر دیا کریں گے اور ہر گروہ اپنے ہاں کے قیدی کو خود فدیہ دے کر چھڑائے گا تاکہ ایمان والوں کا باہمی برتاؤ نیکی اور انصاف کا ہو۔

۱۱۔ اور بنی الأوس اپنے محلے کے ذمہ دار ہوں گے اور حسب سابق اپنے خونبہا باہم مل کر دیا کریں گے اور ہر گروہ اپنے ہاں کے قیدی کو خود فدیہ دے کر چھڑائے گا تاکہ ایمان والوں کا باہمی برتاؤ نیکی اور انصاف کا ہو۔

۱۲۔ الف۔ اور ایمان والے کسی قرض کے بوجھ سے دبے ہوئے کو مدد دیئے بغیر چھوڑ نہ دیں گے تاکہ ایمان والوں کا باہمی برتاؤ نیکی اور انصاف کا ہو۔

۱۲۔ ب اور یہ کہ کوئی مومن کسی دوسرے مومن کے مولا (معاہداتی بھائی) سے خود معاہدۂ برادری نہیں پیدا کرے گا۔

ف ۱۳ - اور متقی ایمان والوں کے ہاتھ ہر اس شخص کے خلاف اٹھیں گے جو
ان میں سرکشی کرے یا استحصال بالجبر کرنا چاہے یا گناہ یا تعدی کا
ارتکاب کرے یا ایمان والوں میں فساد پھیلانا چاہے اور ان کے
ہاتھ سب مل کر ایسے شخص کے خلاف اٹھیں گے خواہ وہ ان میں
سے کسی کا بیٹا ہی کیوں نہ ہو۔

ف ۱۴ - اور کوئی ایمان والا کسی ایمان والے کو کسی کافر کے بدلے قتل نہ
کرے گا اور نہ کسی کافر کی کسی ایمان والے کے خلاف مدد کرے گا۔

ف ۱۵ - اور خدا کا ذمہ ایک ہی ہے۔ ان (مسلمانوں میں) کا ادنا ترین
فرد بھی کسی کو پناہ دے کر سب پر پابندی عاید کر سکے گا۔ اور
ایمان والے باہم بھائی بھائی ہیں (ساری دنیا کے) لوگوں کے مقابل۔

ف ۱۶ - اور یہ کہ یہودیوں میں سے جو ہماری اتباع کرے گا تو اسے
مدد اور مساوات حاصل ہوگی۔ نہ ان پر ظلم کیا جائے گا اور نہ
ان کے خلاف کسی کو مدد دی جائے گی۔

ف ۱۷ - اور ایمان والوں کی صلح ایک ہی ہوگی۔ اللہ کی راہ میں لڑائی
ہو تو کوئی ایمان والا کسی دوسرے ایمان والے کو چھوڑ کر (دشمن سے)
صلح نہیں کرے گا جب تک کہ (یہ صلح) ان سب کے لئے برابر
اور یکساں نہ ہو۔

ف ۱۸ - اور ان تمام ٹکڑیوں کو جو ہمارے ہمراہ جنگ کریں باہم نوبت
بہ نوبت چھٹی دلائی جائے گی۔

ف۱۹۔ اور ایمان والے باہم اس چیز کا انتقام لیں گے جو خدائی راہ میں ان کے خون کو پہنچے۔

ف۲۰۔ الف۔ اور بے شبہ متقی ایمان والے سب سے اچھے اور سب سے سیدھے راستے پر ہیں۔

ف۲۰۔ ب۔ اور یہ کوئی مشرک (غیر مسلم رعیت) قریش کی جان اور مال کو کوئی پناہ نہ دے گا اور نہ اس سلسلے میں کسی مومن کے آڑے آئے گا۔

ف۲۱۔ اور جو شخص کسی مومن کو عمداً قتل کرے اور ثبوت پیش ہو تو اس سے قصاص لیا جائے گا بجز اس کے کہ مقتول کا ولی خونبہا پر راضی ہو جائے۔ اور تمام ایمان والے اس کی تعمیل کے لئے اٹھیں گے اور اس کے سوائے انھیں کوئی اور چیز جائز نہ ہوگی۔

ف۲۲۔ اور کسی ایسے ایمان والے کے لئے جو اس دستور العمل (صحیفہ) کے مندرجات (کی تعمیل) کا اقرار کر چکا اور خدا اور یوم آخرت پر ایمان لاچکا ہو، یہ بات جائز نہ ہوگی کہ کسی قاتل کو مدد یا پناہ دے۔ اور جو اسے مدد یا پناہ دے گا تو قیامت کے دن اس پر خدا کی لعنت اور غضب نازل ہوں گے اور اس سے کوئی رقم یا معاوضہ قبول نہ ہوگا۔

ف۲۳۔ اور یہ کہ جب کبھی تم میں کسی چیز کے متعلق اختلاف ہو تو اسے خدا اور محمدؐ سے رجوع کیا جائے گا۔

ف۲۴ - اور یہودی اس وقت تک مومنین کے ساتھ اخراجات برداشت
کرتے رہیں گے جب تک وہ مل کر جنگ کرتے رہیں۔

ف۲۵ - اور بنی عوف کے یہودی مومنین کے ساتھ، ایک سیاسی وحدت
(یا امت) تسلیم کئے جاتے ہیں یہودیوں کو ان کا دین اور مسلمانوں
کو ان کا دین۔ موالی ہوں کہ اصل - ہاں جو ظلم یا عہد شکنی کا
ارتکاب کرے تو اس کی ذات یا گھرانے کے سوائے کوئی
مصیبت میں نہیں پڑے گا۔

ف۲۶ - اور بنی النجّار کے یہودیوں کو بھی وہی حقوق حاصل ہوں گے
جو بنی عوف کے یہودیوں کو۔

ف۲۷ - اور بنی الحارث کے یہودیوں کو بھی وہی حقوق حاصل ہوں گے
جو بنی عوف کے یہودیوں کو۔

ف۲۸ - اور بنی ساعدہ کے یہودیوں کو بھی وہی حقوق حاصل ہوں گے
جو بنی عوف کے یہودیوں کو۔

ف۲۹ - اور بنی جشم کے یہودیوں کو بھی وہی حقوق حاصل ہوں گے
جو بنی عوف کے یہودیوں کو۔

ف۳۰ - اور بنی الأوس کے یہودیوں کو بھی وہی حقوق حاصل ہوں گے
جو بنی عوف کے یہودیوں کو۔

ف۳۱ - اور بنی ثعلبہ کے یہودیوں کو بھی وہی حقوق حاصل ہوں گے
جو بنی عوف کے یہودیوں کو۔ ہاں جو ظلم یا عہد شکنی کا ارتکاب

کرے تو خود اس کی ذات یا گھرانے کے سوائے کوئی مصیبت
میں نہیں پڑے گا۔

ف۳۲ ۔ اور جَفنہ جو (قبیلہ) ثعلبہ کی ایک شاخ ہے، اُسے بھی وہی
حقوق حاصل ہوں گے جو اصل کو۔

ف۳۳ ۔ اور بنی الشُطَیبہ کو بھی وہی حقوق حاصل ہوں گے جو بنی عوف
کے یہودیوں کو۔ اور وفا شعاری ہو نہ کہ عہد شکنی۔

ف۳۴۔ اور ثعلبہ کے موالی کو بھی وہی حقوق حاصل ہوں گے جو اصل کو۔

ف۳۵ اور یہودیوں (کے قبائل) کی ذیلی شاخوں کو بھی وہی حقوق
حاصل ہوں گے جو اصل کو۔

ف۳۶ الف۔ اور یہ کہ ان میں سے کوئی بھی محمدؐ کی اجازت کے بغیر
(فوجی کارروائی کے لئے) نہیں نکلے گا۔

ف۳۶ ۔ ب ۔ اور کسی مار، زخم کا بدلہ لینے میں کوئی رکاوٹ نہیں
ڈالی جائے گی اور جو خونریزی کرے تو اس کی ذات اور اس
کا گھرانہ ذمہ دار ہوگا ورنہ ظلم ہوگا۔ اور خدا اس کے ساتھ
ہے جو اس (دستور العمل) کی زیادہ سے زیادہ وفا شعارانہ
تعمیل کرے۔

ف۳۷ ۔ الف ۔ اور یہودیوں پر ان کے خرچے کا بار ہوگا اور مسلمانوں
پر ان کے خرچے کا

ف۳۷۔ ب۔ اور جو کوئی اس دستور والوں سے جنگ کرے تو ان

(یہودیوں اور مسلمانوں) میں باہم امداد عمل میں آئے گی - اور ان میں باہم حسنِ مشورہ اور بہی خواہی ہوگی اور وفا شعاری ہوگی نہ کہ عہد شکنی۔

ف۳۸ - اور یہودی اس وقت تک مومنین کے ساتھ اخراجات برداشت کرتے رہیں گے جب تک کہ وہ مل کر جنگ کرتے رہیں۔

ف۳۹ - اور یثرب کا جوف (یعنی میدان جو پہاڑوں سے گھرا ہوا ہو) اس دستور والوں کے لئے ایک حرم (اور مقدس مقام) ہوگا۔

ف۴۰ - پناہ گزیں سے وہی برتاؤ ہوگا جو اصل (پناہ دہندہ) کے ساتھ۔ نہ اس کو ضرر پہنچایا جائے گا اور نہ خود وہ عہد شکنی کرے گا۔

ف۴۱ - اور کسی پناہ گاہ میں وہاں والوں کی اجازت کے بغیر کسی کو پناہ نہیں دی جائے گی (یعنی پناہ دینے کا حق پناہ گزیں کو نہیں)

ف۴۲ - اور یہ کہ اس دستور والوں میں جو کوئی قتل یا جھگڑا رونما ہو جس سے فساد کا ڈر ہو تو اسے خدا اور خدا کے رسول محمدؐ سے (جن پر خدا کی توجہ اور سلامتی ہو) رجوع کیا جائے گا - اور خدا اس شخص کے ساتھ ہے جو اس دستور کے مندرجات کی زیادہ سے زیادہ احتیاط اور زیادہ سے زیادہ وفا شعاری کے ساتھ تعمیل کرے۔

ف۴۳۔ اور قریش کو کوئی پناہ نہیں دی جائے گی اور نہ اس کو جو انھیں مدد دے۔

ف۴۴۔ اور ان (یہودیوں اور مسلمانوں) میں باہم مدد رہی ہوئی اگر کوئی یثرب پر ٹوٹ پڑے۔

ف۴۵۔ الف۔ اور اگر ان کو کسی صلح میں مدعو کیا جائے تو وہ بھی صلح کریں گے اور اس میں شریک رہیں گے اور اگر وہ کسی ایسے ہی امر کے لئے بلائیں تو مومنین کا بھی فریضہ ہوگا کہ ان کے ساتھ ایسا ہی کریں بجز اس کے کہ کوئی دینی جنگ کرے۔

ف۴۵۔ ب۔ ہر گروہ کے حصے میں اسی رخ کی (مدافعت) آئے گی جو اس کے بالمقابل ہو۔

ف۴۶۔ اور (قبیلہ) الاوس کے یہودیوں کو، موالی ہوں کہ اصل، وہی حقوق حاصل ہوں گے جو اس دستور والوں کو۔ اور وہ بھی اس دستور والوں کے ساتھ خالص وفاشعاری کا برتاؤ کریں گے۔ اور وفاشعاری ہوگی نہ کہ عہد شکنی۔ جو جیسا کرے گا ویسا خود ہی بھرے گا۔ اور خدا اس کے ساتھ ہے جو اس دستور کی مندرجات کی زیادہ سے زیادہ صداقت اور زیادہ سے زیادہ وفاشعاری کے ساتھ تعمیل کرے۔

ف۴۷۔ اور یہ کہ یہ حکنامہ کسی ظالم یا عہد شکن کے آڑے نہ آئے گا۔ اور جو جنگ کو نکلے تو بھی امن کا مستحق ہوگا اور جو مدینے میں

بیٹھ رہے تو بھی امن کا مستحق ہوگا ورنہ ظلم اور عہد شکنی ہوگی۔ اور خدا اس کا نگہبان ہے جو وفا شعاری اور احتیاط (سے تعمیلِ عہد) کرے اور اللہ کے رسول محمدؐ بھی جن پر خدا کی توجہ اور سلامتی ہو۔

(مجلۂ طیلسانیین حیدرآباد دکن)
جولائی ۱۹۳۹ء

قرآنی تصورِ مملکت

جزیرہ نمائے عرب اسلام سے پہلے کبھی ایک اقتدار کے تحت متحد نہیں ہوسکا تھا، اور یہ ایک انوکھا اور عجیب وغریب واقعہ تھا کہ پورے ملک نے حضرت محمد صلعم کو متحدہ طور سے اپنا روحانی اور سیاسی سردار تسلیم کرلیا۔ جس ملک میں نراج کا دور دورہ ہو، وہاں دس ہی سال کی کوشش میں ایک مرکزیت اور نظام قائم کردینا رسول کریم صلعم کا عظیم الشان کارنامہ تھا۔ آنحضرت صلعم اپنے آپ کو آسمانی وحی کا تابع قرار دیتے تھے، جو وقتاً فوقتاً آتی تھی، اور جس کا مجموعہ اب قرآن کے نام سے دنیا میں موجود و مشہور ہے۔ اگر کوئی شخص سیرۃ نبویہ کا قریب سے مطالعہ کرے، تو اسے ام المومنین حضرت عائشہ رضہ کے اس قول کی صحت کو باور کرنے میں ذرا بھی دشواری نہ ہوگی، کہ قرآن رسول کریم صلعم کی زندگی کا آئینہ ہے، (کانَ خُلقہ القرآن)۔ اسی لئے یہ معلوم کرنا کہ آنحضرت صلعم کی شریعت میں مملکت کا تصور کیا ہے، بڑی آسانی کے ساتھ قرآن کو دیکھنے سے ممکن ہے (حدیث کے مواد سے استفادہ طویل تر فرصت اور کثیر تر مطالعے کا متقاضی ہے)۔

یہ چیز قابلِ ذکر ہے کہ قرآن مجید میں نہ صرف ازمنۂ سابقہ کے پیغمبروں کے حالات بیان ہوئے ہیں، بلکہ ان کی سیرتوں کو جو قرآن میں ہیں اب بھی ماخذِ قانون تسلیم کیا گیا ہے، بجز اس کے کہ صراحت سے قرآن اسے یا اس کے کسی جزو کو منسوخ قرار دے۔ دوسرے الفاظ میں انبیائے سابقہ کی سنّت مسلمانوں پر اب بھی واجب التعمیل ہے، بجز اس کے کہ اس کے کسی معیّن جزو کے نسخ کا کوئی حکم قرآن مجید میں یا رسول کریم صلعم کے افعال و اقوال میں صراحت سے ملتا ہو۔ ایک آیت ملاحظہ ہو:۔

"اولٰئک الذین اٰتینٰھم الکتٰب والحکم والنبوۃ الآیہ
یہی وہ لوگ ہیں جن کو ہم نے کتاب اور حکمت اور نبوت عطا کی۔ اگر کوئی لوگ اس کو نہ مانیں تو ہم یہ امانت ایسے لوگوں کے سپرد کریں گے، جو اس سے انکار نہ کریں۔ یہی وہ لوگ[۵۹] ہیں، جن کی خدا نے ہدایت کی ہے، اس لئے تو ان کی رہنمائی کی پیروی کر" (قرآن ۶/۸۹ تا ۹۰ نیز دیکھئے ۴۳/۱۳)۔

---

۵۹ اس سے اوپر کی آیتوں میں (۱۸) پیغمبروں کے نام لئے گئے ہیں جن میں نوح، ابراہیم، اسمٰعیل، ہارون، موسیٰ اور عیسیٰ علیہم السلام شامل ہیں، اور انہیں کی پیروی کا حکم دیا گیا ہے۔

امام بخاری اور ترمذی نے ایک حدیث روایت کی ہے، کہ جب کبھی کسی معاملے میں براہ راست آسمانی وحی نہیں آتی، تو رسول کریم صلعم بجائے عام عربی رواجات کے اہلِ کتاب کے طریقوں کی پیروی فرمایا کرتے تھے۔

یہ چیز سیاسی معاملات کی حد تک بھی اسی طرح صادق آسکتی ہے، جس حد تک معاشی و معاشرتی معاملات میں۔

معاشرہٴ انسانی کی تاریخ پر نظر ڈالیں، تو معلوم ہوتا ہے کہ "مملکت" کا قیام بڑے عرصے کے بعد ہوسکا۔ قرآن مجید میں واقعات کی جو ترتیب ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے، کہ سب سے پہلے حضرت آدمؑ پیدا ہوئے، جن کو خدا نے زمین پر نائب یا خلیفہ مقرر کیا۔ وہ نسلِ انسانی کے باپ تھے، اور بزرگ خاندان ہونے میں ان کا کوئی حریف نہیں ہوسکتا تھا۔ ان کی وفات کے بعد کئی نسلوں تک ان کی اولاد میں مختلف قسم کے اختلافات اور برائیاں کم یا زیادہ مقدار میں ساری رہیں، اسی لئے قرآن مجید کے مطابق پیغمبر بھیجے گئے، جو خدا اور عام انسانوں کے مابین واسطے کا کام دیتے تھے۔ وہ انسانوں کو یہ بتاتے تھے، کہ ان کے خالق کی مشیت اور اس کا حکم کیا ہے، اور نیکی کی ترغیب دیتے اور برائی سے روکتے تھے۔ ان پیغمبروں نے خلوص کے ساتھ جو بے غرضانہ نصیحتیں کیں، اور ان کی باتوں کو کچھ لوگوں نے مانا بھی تو اس جماعت کی حیثیت کسی مملکت کی قرار دینی مشکل ہے۔

بظاہر قدیم ترین زمانے میں انبیاء علیہم السلام کی آمد کے باوجود سیاسی نظام اور اقتدار کی ضرورت نہیں پائی جاتی تھی۔ قرآن مجید میں بھی بارہا ذکر ہے۔ کہ ایک قوم کی جگہ دوسری قوم کو سرفرازی عطا ہوئی۔ مگر ایک مملکت کو دوسری مملکت کی جگہ قائم کرنے کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ قرآن مجید میں ان قومی وحدتوں کے غیر سیاسی وجود کے باوجود ان لوگوں کی معاشی اور سماجی سرگرمیوں کو نظر انداز نہیں کیا گیا ہے، لیکن ان چیزوں کا ذکر صرف اس صورت سے ہوا ہے، کہ لوگ ان کو خدا کی نعمتیں سمجھ کر یاد رکھیں، اور خدا کی اطاعت کا فریضہ بجا لائیں۔

بادشاہی کے ذکر کا آغاز قرآن مجید میں حضرت ابراہیمؑ کے زمانے سے ملنے لگتا ہے، جبکہ ایک شخص اپنے ملک کے تمام لوگوں کی جان و مال پر اپنا اقتدار جلاتا ہوا نظر آتا ہے (دیکھئے قرآن مجید پ۳ ع۳ نمرود کا قصہ) حضرت یوسف علیہ السلام کے زمانے سے امور مملکت میں زیادہ ترقی نظر آتی ہے۔ چنانچہ ان کے زمانے کے حالات میں (دیکھئے قرآن مجید پ۱۳ ع۱۳) بادشاہوں اور وزیروں اور مہر کا قید خانوں کا بھی ذکر ملتا ہے، (سورہ یوسف)

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے جو حالات قرآن مجید میں ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل کے ان مقدس رہنما کی تمنا اور خواہش یہ تھی کہ ارض موعود میں ایک مملکت قائم کریں۔ مگر قوم نے ان کے منظاہرے (اور عدم اطاعت احکام الہٰی) سے مایوسی کا سامان کر دیا

آخر ان کی قوم کو چالیس سال تک انتظار کرنے کی ضرورت پیش آئی کہ ایک بالکل نئی نسل پیدا ہو، جس کی بچپن ہی سے ان کی نگرانی میں تعلیم و تربیت ہو، اور پھر اس نئی نسل کی مدد سے وہ ارضِ موعود کو فتح کریں۔ گو اسی اثنا میں حضرت موسیٰؑ نے وفات پائی، اور ان کی چہل سالہ تربیتی اسکیم ان کے بعض فیض یافتوں نے تکمیل کی۔ حضرت موسیٰؑ کے زمانے میں جو فرعون مصر تھا، وہ قرآنی تذکرے کے مطابق ایک خاصا باقاعدہ حکمران تھا۔ جس کا ایک وزیر تھا، اور جس کے مشورے کے لیئے معمرین اور اہلِ الرائے لوگوں کی ایک مجلس بھی پائی جاتی تھی۔ اس مجلس کے اجلاسوں کی جو روئداد قرآن مجید میں ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بے سوچے سمجھے اور عاجلانہ فیصلے نہیں کیا کرتی تھی، بلکہ اس کے مشورے مناسب اور قابلِ عمل ہی ہوتے تھے۔ مثال کے طور پر حضرت موسیٰؑ و ہارونؑ سے انکی جدت طرازیوں کے باعث کیا برتاؤ کرنا چاہیئے؟ جب فرعون نے یہ سوال پیش کیا، تو مجلسِ شوریٰ نے نرمی اور اعتدال کا مشورہ دیا تھا۔ اس زمانے میں عوام الناس تک ایک حد تک سیاسی شعور رکھتے نظر آتے ہیں۔ چنانچہ (قرآن مجید $\frac{۲۸}{۱۹}$) جب ایک شخص نے حضرت موسیٰؑ کو ان کی سخت گیری کے باعث ملامت کرنی چاہی تو اس نے یہ الفاظ کہے تھے کہ۔

ان تریدیا لا ان تکون جبارًا فی الارض الآیہ تُو تو زمین میں

ایک جبار بنیا نا چاہتا ہے، اور اصلاح و فلاح کا کام کرنے والوں میں سے نہیں ہونا چاہتا۔"

حضرت موسیٰؑ کے زمانے میں مجلس دوگانہ یا مرکب بادشاہت کا بھی پتہ چلتا ہے[1] جو بنی اسرائیل میں کار فرما رہی۔

طالوت یعنی بادشاہ ساؤل کا قصہ قرآن مجید میں ایک خصوصی دلچسپی کا حامل ہے۔ بنی اسرائیل کو ان کے دشمن نے شکست دے کر ان کے گھروں سے جلا وطن کر دیا تھا۔ انتقام کی خواہش نے انھیں اس بات پر آمادہ کیا کہ اپنے پیغمبر سے یہ خواہش کریں کہ ان پر ایک بادشاہ نامزد کیا جائے جو اُن کو ساتھ لے کر دشمنوں سے لڑ سکے۔

اِذْقَالُوا لِنَبِیٍّ لَّهُمُ ابْعَثْ لَنَا مَلِكًا نُّقَاتِلْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ الآیۃ یاد کرو جب موسیٰ کے بعد بنی اسرائیل نے اپنے نبی سے کہا کہ ہم پر ایک بادشاہ کو مامور کر تا کہ ہم اللہ کی راہ میں لڑ سکیں اُس (نبی) نے کہا اگر تم لڑنا فرض ہونے کے بعد لڑنے سے انکار کر دو تو؟ انھوں نے کہا یہ کیسے ہو سکتا ہے، کہ ہم اللہ کی راہ میں نہ لڑیں، جب کہ ہمیں ہمارے گھروں اور ہمارے بچوں سے نکال باہر کر دیا گیا ہے! اس کے باوجود جب لڑنا ان پر فرض کیا

---

[1] قرآن مجید ۲۰:۲۹ چنانچہ خود حضرت موسیٰؑ نے اپنے بھائی کے متعلق خدا سے دعا کی تھی کہ وَاَشْرِكْهُ فِیْ اَمْرِیْ (اس کو میرے کام میں شریک بنا)

گیا تو انھوں نے روگردانی کی ۔ بجز چند لوگوں کے ۔ اللہ ظالموں کو خوب جانتا ہے ۔

ان کے پیغمبر نے ان سے کہا: دیکھو اللہ نے تم پر طالوت کو بادشاہ مقرر کیا ہے۔ انھوں نے کہا یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ وہ ہمارا بادشاہ بنے؟ ہم اس سے زیادہ بادشاہت کے مستحق ہیں کیونکہ وہ مالدار نہیں ہے۔ اس (نبی) نے کہا اللہ نے اسی کو تم پر فوقیت دی ہے، اور علم و جسم میں اس کو وافر حصہ دیا ہے۔ اللہ اپنا ملک جس کو چاہتا ہے دیتا ہے ۔ اللہ ہر چیز کو گھیرے ہوئے ہے اور ہر چیز کو جانتا ہے۔"

(قرآن مجید ۲ / ۲۴۶ تا ۲۴۷)

علاوہ اور آیتوں کے اس اقتباس سے بتایا گیا ہے کہ مال و دولت یا حسب و نسب نہیں بلکہ علم و جسم یعنی سیاست دانی اور بہادری بادشاہت کی اولین ضرورتیں ہیں۔ اس اقتباس سے یہ اہم چیز بھی معلوم ہوتی ہے کہ اس زمانے میں یہودیوں نے مذہب اور سیاست کو الگ الگ چیزیں ہونا تسلیم کرایا تھا، اور نبی کے علاوہ بادشاہ کی ضرورت سمجھی گئی تھی۔ بادشاہ فرائض نبوت بجا نہیں لا سکتا تھا۔ اور نہ نبی فرائض بادشاہت۔ البتہ یہ چیز قابل ذکر ہے کہ طالوت یعنی بادشاہ ساؤل کے فوری جانشین حضرت داؤدؑ اور ان کے بعد ان کے بیٹے حضرت سلیمانؑ دونوں بادشاہت اور نبوت ہر دو حیثیتوں کے حامل ہوئے، ان کا کچھ تذکرہ ذیل میں کیا جاتا ہے۔

حضرت داؤدؑ کا قرآنی تذکرہ بیحد اہم ہے کیونکہ اس میں فرائض بادشاہت کا (جن میں عدل گستری سب سے اہم ہے) ذکر کیا گیا ہے:-

(ا) وَقَتَلَ دَاوٗدُ جَالُوْتَ وَاٰتٰىهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ وَالْحِكْمَةَ

اور داؤد نے جالوت کو قتل کیا، پھر خدا نے اس کو بادشاہت اور حکمت عطا کی" (قرآن مجید ۲/۲۵۱)

(ب) وَشَدَدْنَا مُلْكَهٗ وَاٰتَيْنٰهُ الْحِكْمَةَ وَفَصْلَ الْخِطَابِ"

ہم نے اس کی حکومت کو مضبوط بنا دیا، اور اس کو حکمت اور فیصلہ کرنے والی زبان عطا کی" (ایضاً ۳۸/۲۰)

(ج) يٰدَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِيْفَةً فِى الْاَرْضِ فَاحْكُمْ بَيْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ" الخ اے داؤد! بیشک ہم نے تجھ کو زمین پر ایک نائب مقرر کیا ہے۔ اس لئے لوگوں میں حق کے ساتھ فیصلے کیا کر۔ اور خواہشات کی پیروی نہ کرو ورنہ وہ تجھے خدا کی راہ سے بھٹکا دیں گے۔ اور جو کوئی خدا کی راہ سے بھٹکے تو اس کا انجام برا ہوتا ہے۔ کیونکہ قیامت کے حساب کتاب کو اس نے بھلا دیا ہے۔ (قرآن مجید ۳۸/۲۶)

حضرت سلیمانؑ کے سلسلے میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ "اور سلیمان داؤد کا وارث بنا"[۱]، اگرچہ بیٹا اپنے باپ کا جانشین ہوا تھا، لیکن اس

---

[۱] قرآن مجید ۲۷/۱۶

قرآنی تذکرے کا منشا یہ بالکل نہیں معلوم ہوتا کہ بیٹا بطورِ حق کے بادشاہ بنا ہو بلکہ یہ محض خدا کی عنایت تھی کہ باپ کی جگہ بیٹے کو بھی حکومت ملی ورنہ اقتدار کا اصلی سرچشمہ خدا ہی کی مشیئت ہے۔ وہ جسے چاہے نوازے۔

حکمرانی کے کل پرزوں کی حرکت کا سب سے دلچسپ منظر قرآن مجید میں ملکۂ سبا کے تذکرے میں ملتا ہے، چنانچہ :-

قَالَتْ يٰٓاَيُّهَا الْمَلَؤُا اَفْتُوْنِيْ فِيْٓ اَمْرِيْ مَا كُنْتُ قَاطِعَةً اَمْرًا حَتّٰى تَشْهَدُوْنِ الآیہ اُس (ملکہ) نے کہا اے سردار و مجھے میرے اس معاملے میں مشورہ دو، میں تمہاری موجودگی کے بغیر کوئی قطعی فیصلہ نہیں کرتی۔ انھوں نے کہا ہم بڑے طاقتور اور بہادر لوگ ہیں۔ حکم دینا تیرا کام ہے۔ اس لیے تو سوچ کر فیصلہ کر۔ اُس (ملکہ) نے کہا جب کبھی بادشاہ کسی شہر میں داخل ہوتے ہیں تو اُسے تباہ کر دیتے ہیں اور وہاں کے معززین کو ذلیل بنا دیتے ہیں۔ اور وہ ایسا ہی کریں گے۔ البتہ میں اُن (حضرت سلیمانؑ کے ملک والوں) کو ایک تحفہ بھیجوں گی، اور دیکھوں گی کہ سفیر کیا واپس لاتے ہیں؟ چنانچہ جب سفیر سلیمانؑ کے پاس پہنچے، تو انھوں نے فرمایا کہ تم مجھے مال کے ذریعے سے کچھ مدد دینی چاہتے ہو، جب کہ وہ چیز جو خدا نے مجھے دے رکھی ہے، وہ اس سے کہیں بہتر ہے، جو اس نے

تمھیں دی ہے ؟ تمھیں تو اپنے تحفے ہی پر ناز ہے - ان کے
پاس واپس جاؤ - ہم بیشک ان کے پاس ایسی فوجیں لے کر
آئیں گے جنکا وہ مقابلہ نہیں کر سکیں گے ، اور ہم ان کو وہاں سے
ذلیل کر کے نکال دینگے - اور وہ پست ہو جائیں گے"۔

(قرآن مجید ۲۷/۳۲ تا ۳۷)

ہر زمانے میں اس امر کی ضرورت تسلیم کی جاتی رہی ہے، کہ ملت کی رہنمائی کے لئے ایک قوانین کا مجموعہ بھی موجود ہو - قرآن مجید میں اکثر اس کا ذکر آیا ہے کہ پیغمبروں کو کتابیں یا صحیفے دیئے گئے - کتاب کے لفظی معنی حکم دینے کے بھی آتے ہیں - اور صحیفے سے مراد دستورالعمل ہوتا ہے - حضرت موسیٰ کے سلسلے میں خاص طور سے اس کا ذکر ہوا ہے کہ جونہی وہ فرعون کی سرزمین سے نکل کر باہر آگئے ، تو خدا نے حضرت موسیٰ کو احکام لکھی ہوئی تختیاں (الواح) عطا کیں، جن کی تفصیل بنی اسرائیل پر فرض قرار دی گئی -

ظالم بادشاہوں کے ظالمانہ اور نامناسب افعال کی قرآن مجید میں بار بار برائی کی گئی ہے، (دیکھئے قرآن مجید ۱۸/۷۹، ۲۸/۴ وغیرہ) - ایک چیز جو قرآنی تذکروں میں خاص طور سے قابل ذکر معلوم ہوتی ہے ، وہ یہ ہے کہ مملکت سے زیادہ حکمرانِ مملکت کو نمایاں کیا گیا ہے - بلکہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ مملکت کا ذکر محض ضمناً آیا ہے ، اور سیاسی وحدت میں بادشاہ کا ذکر ہی سب سے نمایاں ہے - کیونکہ قدیم زمانوں میں بھی

صورت حال تھی۔

اسلامی مملکت | اب تک ہم نے اپنی تحقیقات کو زمانہ قدیم کی مملکت تک محدود رکھا تھا۔ اس کے معنے یہ نہیں، کہ آنحضرت صلعم نے جو اسلامی مملکت قائم کی تھی۔ اس کے لئے کوئی خصوصی احکام قرآن مجید میں نہیں دیئے گئے۔ ہمارے تذکرے کا منشا یہ تھا کہ چونکہ انبیائے سلف کی سنت بھی مسلمانوں کے لئے واجب التعمیل قرار دی گئی ہے۔ اس لئے ان کے زمانے کے احکام کا مستند تذکرہ نہ صرف اسلامی مملکتی تصور کے لئے ایک پس منظر کا کام دیتا ہے، بلکہ واقعتہً وہ احکام اسلامی قانون کا اساسی و انتظامی کا جز بن جاتے ہیں۔ وہ احکام جو قرآن مجید میں نبی کریم صلعم کو خاص طور پر دیئے گئے ہیں، ان کا اب موضوع وار تذکرہ کیا جاتا ہے۔

سب سے پہلی یہ چیز ہے کہ اقتدار اعلیٰ کے ربانی ماخذ کو کہیں بھی نظر انداز نہیں کیا گیا ہے، اور قیامت کے حساب وکتاب پر بار بار زور دیا گیا ہے تاکہ بادشاہ میں کسی دنیوی ذمہ داری کے نہ ہونے کے باعث استبداد نہ پیدا ہو جائے۔ اگرچہ قرآن مجید میں علاقے یا زمین کا ذکر بعض وقت حکمرانی کے ساتھ آیا ہے۔ لیکن وہ بڑی حد تک ضمنی ہے۔ بنیادی نہیں مثلاً :-

(۲) قُلِ اللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِی الْمُلْكَ مَنْ تَشَآءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَآءُ الآیہ

کہہ۔ اے خدا۔ ملک کے مالک! تو ہی جس کو چاہتا ہے، ملک

دیتا ہے، اور جس سے چاہتا ہے ملک واپس لے لیتا ہے جس
کو چاہتا ہے تو عزت دیتا ہے، اور جس کو چاہتا ہے تو ہی ذلیل
کرتا ہے، بھلائی تیرے ہی ہاتھ میں ہے، تو ہر چیز پر قدرت رکھتا
ہے۔ (قرآن مجید ۳/۲۶)

(ب) هُوَ الَّذِي جَعَلَكُمْ خَلَائِفَ الْأَرْضِ وَرَفَعَ بَعْضَكُمْ فَوْقَ بَعْضٍ الآیہ
وہی ہے، جس نے تم کو زمین میں نائب مقرر کیا اور تم میں سے
چند کو دوسروں پر رتبے میں فوقیت دی تاکہ تمہیں اس چیز کے
ذریعے سے آزمائے، جو اس نے تمہیں دی ہے۔
(ایضاً ۶/۱۶۵)

(ج) وَلَقَدْ مَكَّنَّاكُمْ فِي الْأَرْضِ وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِيهَا مَعَايِشَ قَلِيلًا مَّا تَشْكُرُونَ۔ ہم نے تم کو زمین میں اقتدار عطا کیا اور تمہارے
لئے وہاں روزی مہیا کی تاکہ تم کچھ تو شکرگزار رہو۔ (ایضاً ۷/۱۰)

جامعہ روما کے پروفیسر نالینو کو یہ تسلیم کرنے میں کوئی ہچکچاہٹ نہیں
معلوم ہوتی کہ اسلامی حکمران کی تخت نشینی کے وقت جو بیعت لی جاتی
ہے، وہ ایک طرح سے معاہدۂ معاشری کہلا سکتا ہے۔ چنانچہ وہ
لکھتا ہے کہ:۔

"کسی شخص کو خلافت کا رتبہ عطا کرنا فقہا کے نزدیک ایک معاہدہ
ہوتا ہے، جس کا ایک فریق وہ شخص ہوتا ہے، جو اس عہدے
کو قبول کرے، اور دوسرا فریق جماعت اسلامی ہوتی ہے

یہ معاہدہ اس وقت تک مکمل نہیں ہوتا، جب تک کہ بیعت یعنی اظہار وفاداری امت کے اصحاب حل و عقد کی طرف سے نہ عمل میں آجائے[۱]

لہٰذا بیعت کے معنی خود ایک معاہدے کے ہوتے ہیں، اور اصطلاحاً اس سے مراد یہ ہوتی ہے کہ وفاداری اور اطاعت کی ایک طرف سے پیشکش کی جائے اور دوسرے فریق کی طرف سے اُسے قبول کیا جائے۔ (دیکھئے قرآن مجید ۴۸/۱۰ ، ۶۰/۱۲) دوسرے الفاظ میں حکمران کا اقتدار چاہے مشیت خاصہ سے پیدا نہ ہوتا ہو، لیکن اسی پر مبنی ہوتا اور اسی کا محتاج ضرور رہتا ہے۔ اور فقہاء کا تصور یہ ہے کہ مشیت عامہ ہی مشیت الٰہی کا مظاہرہ ہوتا ہے۔ "ید اللہ علی الجماعۃ".

رسول کریم صلعم کے متعلق مسلمانوں میں یہ چیز جزو عقیدہ ہے، کہ پیغمبر معصوم ہوتے ہیں۔ اور اگرچہ خلفاء پیغمبروں کے سیاسی جانشین سمجھے گئے لیکن معصومیت کا یہ اعزاز ان کے لئے کبھی تسلیم نہیں کیا گیا۔ یہی وجہ ہے کہ بعض دیگر قوموں میں "بادشاہ کوئی غلطی نہیں کرسکتا" کا جو سیاسی نظریہ بالکلیہ پایا جاتا ہے، وہ مسلمانوں میں کبھی جگہ نہ پا سکا۔ اس کے برخلاف مسلمانوں کو اسی پر ناز ہے کہ نہ صرف عام حکمران بلکہ خود

---

[۱] فرانسیسی رسالہ موسومہ "خلافت کی عام نوعیت" اور سلاطین عثمانیہ کے دعوائے خلافت پر تبصرہ، مطبوعہ روما ص (۱۱)

پیغمبر صلعم بھی حقوق العباد کے معاملے میں انھیں عام قوانین کے پابند ہیں جن کے عام مسلمان، اور یہ کہ رسول اللہ صلعم نے بھی ضرورت پر خود اپنی ذات کے خلاف مقدمات سنے اور منصفانہ فیصلہ کیا۔[۵] پیغمبروں کی معصومیت کا منشا اسلامی علم کلام میں صرف اتنا یہ کیا جاتا ہے کہ وحی کی تبلیغ اور خدا کے احکام پہنچانے میں ان سے کوئی غلطی یا سہو سرزد نہیں ہو سکتا، اس کے علاوہ دیگر معاملات میں پیغمبر کی حیثیت بھی ایک انسان ہی کی ہوتی ہے - اور احادیث میں متعدد مرتبہ بیان ہوا ہے، کہ رسول کریم صلعم نے فرمایا کہ "دنیاوی معاملات میں میں بھی تمھاری ہی طرح ایک انسان ہوں - سیاسی حیثیت سے رسول کریم صلعم جماعت اسلامی کے ایک فرد تھے، اور ان قوانین کے جن کو آپ نافذ کرتے تھے، خود بھی پوری طرح پابند تھے - مثال کے طور پر مال غنیمت میں آپ کا بھی اتنا ہی حصہ ہوتا جتنا فوج کے کسی عام سپاہی کا -

غرض جملہ مخلوقات کی طرح کرۂ ارض اور انسانی بستی کا بھی اصل مالک اور بادشاہ خدا ہی کی ذات ہے، اور وہی صلاحیتوں کو دیکھ کر کسی انسان کو اپنی نیابت سے سرفراز کرتا ہے - اور پھر دیکھتا ہے، کہ وہ عمل کیسا کرتا ہے (اِنَّ الْاَرْضَ یَرِثُهَا عِبَادِیَ الصّٰلِحُوْنَ، اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَۃً لِنَنْظُرَ کَیْفَ تَعْمَلُوْنَ اِنَّ الْاَرْضَ لِلّٰہِ یُوْرِثُهَا مَنْ یَّشَاءُ مِنْ عِبَادِہٖ وغیرہ) خدا

---

[۵] سیرۃ ابن ہشام ص ۴۴۴، کامل ابن الاثیر ج ۲ ص ۱۴۱ نیز سیرۃ شامی میں آٹھ دس ایسے واقعے درج ہیں۔

کا خلیفہ برحق تو نبی ہوتا ہے جس کا براہ راست وحی سے تقرر ہوتا ہے، اور وحی الٰہی سے اس کی رہنمائی ہوتی ہے۔ اس کے باوجود بھی سرورِ کائنات صلعم اپنی اطاعت اور پیروی کی بیعت لیتے رہے۔ نبی کے دنیا سے پردہ فرمانے پر احکامِ شریعت سے واقفوں کو واقف کرانے کی حد تک مشہور اسلامی مقولہ بلکہ شاید حدیث شریف ہے کہ العلماء ورثة الانبیاء لیکن سلطنت رانی اور سیاست مدن کے لئے ماوردی، ابن خلدون وغیرہ کے الفاظ میں "اصحاب حل وعقد" کسی کا انتخاب کر لیتے ہیں اور یہ انتخاب بمصداق حدیث شریف یدُ اللہ علی الجماعۃ منشاء ربانی کا اظہار اور باعث خیر و برکت ہوتا ہے۔ اور یہی اصحاب حل وعقد انتخاب و بیعت کے بعد بھی حکمران کی حکمرانی میں مرجع کا کام دیتے ہیں، اور ضرورت ہو تو اسے معزول بھی کر سکتے ہیں۱؎۔ حکمران کے حق اجتہاد کے حدود، مصالح ملکی اور نظم و نسق میں شوریٰ کا موقف، اصحاب حل وعقد کی دستوری حیثیت وغیرہ پر تفصیل سے بحث یہاں ممکن نہ ہوگی، البتہ اس سوال کا جواب شاید ضروری ہے کہ اصل دنیوی اقتدار کے استعمال کا حق کس کو حاصل ہوتا ہے۔ اس کا جواب حضرت امام اعظمؒ کے الفاظ میں:-

إنّ نواحی دار الاسلام تحت — اسلامی سرزمین کے جملہ حصے اسلامی

۱؎ دیکھئے آگے باب "نظامِ تعلیم"

۲؎ بدائع الصنائع للکاسانی ج ۷، صفحہ ۱۴

بید امام المسلمین وبیدہ بید جماعۃ المسلمین،	بادشاہ کے اقتدار میں ہوتے ہیں اور اس کا اقتدار مسلمانوں کی جماعت ہی کا اقتدار ہوتا ہے۔
(مبسوط سرخسی ج ۱۰ صفحہ ۹۳)	

امام ابو حنیفہؒ کے دونوں شاگردوں امام ابو یوسفؒ اور امام محمد شیبانیؒ نے مزید وضاحت سے کہا ہے کہ کسی ملک کے اسلامی یا غیر اسلامی ہونے کا اعتبار یہ ہے کہ وہاں غلبہ اور محافظ قوت کس قوم کو حاصل ہے، تعداد سے بحث نہیں "لانہما الدار اینما تنسب الی اہلہا الثبوت یدہم القاہرۃ علیہا وقیام ولایتہم [illegible] (ابو بکر محمد شمس الدین سرخسی مخطوطہ استانبول دار [illegible] نمبر [illegible]) اور حنفی علماء متفق ہیں کہ اسلامی مملکت کا انتظام امام پوری امت مسلمہ کے نائب کے طور پر کرتا ہے، چنانچہ شارح شیبانیؒ کے الفاظ ہیں "الامام [illegible] الجماعۃ من المسلمین فی استیفاء [illegible]" (مبسوط سرخسی ج ۹ صفحہ [illegible]) یعنی اس حق کے نفاذ میں امام کی حیثیت امت مسلمہ کے قائم مقام کی ہوتی ہے۔

بہرحال یہ اسلامی تصور اقتدار اعلیٰ ہے کہ مقتدر اعلیٰ خدا اور خلاق کی ذات کبریائی ہے اور حکمرانی شریعت کو حاصل ہوتی ہے اور خلیفۃ اللہ فی الارض یا شریعت کے نفاذ کے افسر کا انتخاب بھی خدا ہی کرتا ہے اور اس بارے میں خدا کی مشیت کا اظہار "ید اللہ علی الجماعۃ" اور "لا تجتمع امتی علی الضلالۃ" وغیرہ احادیث شریفہ کے مصداق اور عہد خلافت راشدہ کے نظائر کے مطابق اصحاب حل و عقد کی بیعت کے ذریعے ہوتا

قدیم زمانوں میں جب انسانی تمدن نے زیادہ ترقی نہ کی تھی۔ اور تقسیم کار کی اتنی زیادہ ضرورت پیش نہ آئی تھی تو کسی ملک میں مرکزی حکومت کے اختیارات یا تو عدل گستری کے متعلق ہوتے تھے، (جس میں دشمن سے جنگ بھی شامل ہے۔ اور فقہ کی کتابوں میں باب الجہاد کا ذکر حدود و تعزیری سزاؤں کے سلسلے ہی میں ملتا ہے) یا قومی معبود کی پرستش۔ عبادت کے متعلق۔ دیگر سلطنتی نظم ونسق کے مسائل اٹھتے ہی نہ تھے، بلکہ وہ عوام کے انفرادی معاملات سمجھے جاتے تھے۔ اور عبادت ہی نہیں عدل گستری اور جنگ بھی مذہبی مراسم کی تابع تھی۔ تمدن کی ترقی کے ساتھ ساتھ کشوری اور مذہبی فرائض میں دوری پیدا ہوتی جاتی تھی، چنانچہ رومیوں نے لیں (Jus کا دنیاوی قانون) کو ہمہ گیر فاس (Fas) یا مذہبی قانون) سے ایک الگ چیز کے طور پر ایجاد کیا۔ یہودیوں نے "قالوا لنبی لهم ابعث لنا ملکا نقاتل فی سبیل اللہ۔ (قرآن ۲۴۶) اپنے نبی سے کہا کہ ہمارے لئے ایک بادشاہ مقرر کر جس کے ساتھ ہم خدا کی راہ میں جنگ کر سکیں۔ کہا، اور اس طرح نبوت و بادشاہت، یا مذہب و سیاست کو جدا کر دیا۔ حضرت عیسیٰؑ کی طرف بھی یہ قول انجیل میں منسوب ملتا ہے، کہ قیصر کی چیزیں قیصر کو دیدو، اور کلیسا کی کلیسا کو" بدھ مذہبوں اور ہندوؤں کے ہاں بھی ترک دنیا انسانیت کا کمال قرار پایا۔

غرض قدیم اہل مذہب نے دنیائے ناپائیدار کو دل لگانے کے

قابل چیز نہ سمجھا لیکن اس میں وہ بنیادی مسائل نظر انداز ہو کر خامی پیدا
ہو گئی، ایک ٹولی کے چند فرشتہ صفت انسانوں کے سوا باقی جو لاکھوں
کروڑوں عامۃ الناس تھے، ان کے معاملات مادیت پسندانہ ہو گئے اور
دوسرے سیاست کی اخلاقی بنیاد نہ رہی، اور یہ کہا جا سکتا ہے کہ سابقہ
تمام مذاہب اکائیوں یا دہائیوں میں ختم ہو جانے والے فرشتہ صفت
انسانوں کے لئے ہوتے تھے، اور اسلام ناز کر سکتا ہے، کہ وہ امتیوں
اور اوسط درجے کے انسانوں کے لئے ایک قابل عمل دستور لایا۔ یہ ظاہر ہے
کہ دنیا میں ایسوں ہی کی بہت بڑی اکثریت ہوتی ہے۔ انسان نما فرشتے اور انسان
نما شیطان دونوں کی تعداد علیحدہ بہت محدود ہی ہوتی ہے۔

مذہب یعنی دین کے اگر وسیع معنے لئے جائیں تو اس میں پورا تمدن انسانی
اور دنیا و آخرت کے جملہ مسائل شریک ہو جاتے ہیں۔ اور اگر محدود
معنوں میں اس اصطلاح کا استعمال کیا جائے تو وسیع معنے لینے والوں سے
اختلاف محض ایک لفظی بحث رہ جاتا ہے جس طرح فنی اور علمی ضرورتوں
سے اب خود تفسیر، حدیث، فقہ اور کلام ایک چیز نہیں سمجھے جا سکتے، اسی
طرح انسانی تمدن کی تمام شاخوں کو ایک ہی علم قرار دینا بدرجہ اولیٰ کم
سہولت بخش ہو گا۔ اسی لئے میں مذہب اور سیاست کو یہاں دو بالکل الگ
چیزیں لیتا ہوں۔ اس معنے کے لحاظ سے مذہب خدا اور بندے کے تعلقات کا
نام ہے، اور سیاست بندے اور بندے کے معاملات کا، ان دونوں کو
ایک کہنے والا گویا ہاتھ اور پاؤں کو ایک کہتا ہے، لیکن جس طرح ایک زندہ

اور تندرست انسان میں ہاتھ اور پاؤں دونوں ہی ایک مشترک اور مرکزی قوت مثلاً عقل یا ارادے کے تابع ہوتے ہیں، بالکل اسی طرح دین اسلام نے مذہب اور سیاست کو ایک مشترک دستور العمل کے تابع کر دیا جو قرآن یا ربانی کلام تھا۔ اور دونوں ہی کی رہنمائی کے لئے احکام کا ماخذ ایک ہی قرار دے کر سیاست میں اخلاقی اساس اور اخلاق میں حقیقت پسندی باقی رکھی کوئی شخص ہاتھوں کے بل تھوڑی دور ضرور چل سکتا ہے، اور پاؤں سے برا بھلا کچھ لکھ بھی ضرور سکتا ہے۔ اسی طرح عبادت کو سیاست اور سیاست کو عبادت بنا کر انسان چند روز گزارا ضرور سکتا ہے۔ لیکن یہ غیر فطری عمل نہ سہولت بخش ہوگا اور نہ مفید۔

یہی وجہ ہے کہ ہمارے ایک بزرگ سیرت نگار ہندوستان کے الفاظ میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دنیا میں دین اور دنیا دونوں کی برکتیں لے کر آئے، آپ نے صرف آسمانی بادشاہت کی خوشخبری نہیں سنائی بلکہ آسمانی بادشاہی کے ساتھ دنیا کی بادشاہی کی بھی بشارت دی تاکہ دنیا میں خدا کی بندگی بے خوف وخطر کی جا سکے۔ اور خدا کی بادشاہی دنیا میں قائم ہو۔

وَعَدَ اللّٰہُ الَّذِیْنَ آمَنُوْا مِنْکُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَیَسْتَخْلِفَنَّھُمْ فِی الْاَرْضِ الآیۃ

خدا نے ان سے جو ایمان لائے اور اچھے عمل کئے، یہ وعدہ کیا، کہ وہ ان کو زمین میں حاکم بنائے گا جیسا کہ ان کو حاکم بنایا تھا"

جو ان سے پہلے تھے) اور آن کے لئے ان کے اس دین کو جو اللہ نے اُن کے واسطے پسند کیا ہے، جما دیگا " (قرآن ۵/۳)

قرآن نے مطلبی اور سب سے اچھی دعا انسانوں کے لئے یہ بتائی ہے:-

رَبَّنَا اٰتِنَا فِی الدُّنیا حَسَنَۃً وَّ فِی الْاٰخِرَۃِ حَسَنَۃً وَّقِنَا عَذَابَ النَّار - اے ہمارے رب! ہم کو دنیا میں بھی بھلائی دے، اور آخرت میں بھی بھلائی دے، اور ہم کو (دوزخ کی) آگ کے عذاب سے بچا " (قرآن ۲/۲۰۱)

اور ایک جگہ فرمایا :-

" لِلَّذِیْنَ اَحْسَنُوْا فِیْ ھٰذِہِ الدُّنْیَا حَسَنَۃٌ وَلَدَارُ الْاٰخِرَۃِ خَیْرٌ وَلَنِعْمَ دَارُ الْمُتَّقِیْنَ" اور جنھوں نے نیک کام کئے ان کے لئے اس دنیا میں بھلائی ہے، اور آخرت کا گھر سب سے اچھا ہے اور پرہیزگاروں کا گھر کیسا اچھا ہے! (قرآن ۱۶/۳۰)

جن لوگوں نے خدا کی راہ میں اپنی جانوں کی بازی لگا دی ان کو بشارت ہے :-

فَاٰتٰھُمُ اللّٰہُ ثَوَابَ الدُّنْیَا وَحُسْنَ ثَوَابِ الْاٰخِرَۃِ وَاللّٰہُ یُحِبُّ الْمُحْسِنِیْنَ" تو اللہ نے ان کو دنیا کا ثواب اور آخرت کا بھلا ثواب عنایت کیا، اور اللہ نیکی کرنے والوں کو چاہتا ہے، (قرآن ۳/۱۴۸)

دنیا کا ثواب فتح و نصرت، ناموری و عزت، مال و دولت اور

حکومت و سلطنت ہے۔ جنھوں نے خدا کی راہ میں اپنا گھر بار چھوڑا، اور خوشی خوشی ہر طرح کی تکلیف جھیلی، ان کو دونوں جہاں کی نعمتیں بخشیں:۔

وَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا فِي اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا ظُلِمُوْا الآیہ اور جنھوں نے (اللہ کے لئے) ستائے جانے کے بعد گھر چھوڑا، اللہ ان کو دنیا میں اچھا ٹھکانا دیگا، اور بیشک آخرت کا اجر سب سے بڑا ہے۔

(قرآن ۱۶/۱۴)

——— (اور اولیاء و اتقیاء یعنی فرشتہ صفت مسلمانوں کو ترک دنیا کی ہدایت نہ کی، بلکہ دنیا داری اور دین داری دونوں کے ملاپ کا حکم دیا):۔

اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ الآیہ

وہ ایسے لوگ ہیں، کہ اگر ہم ان کو زمین میں جما دیں تو وہ نماز کھڑی کریں، اور زکات دیں، اور اچھے کاموں کو کہیں اور برے کاموں سے روکیں۔ اور ہر کام کا انجام خدا کے ہاتھ میں ہے۔

(قرآن ۲۲/۱۷)

ان آیتوں سے یہ اشارہ بھی نکلا، کہ مسلمانوں کے ہاتھوں میں خدا کے قانون کے اجراء کی طاقت ہونی چاہیئے۔ اور یہ اشارہ بھی کہ دین و دنیا کا امتزاج یا ملاپ ہی انسان کو انسان بناتا ہے اور "احسن تقویم" کا مظاہر ہو سکتا ہے، ورنہ وہ یا تو فرشتہ ہو جائےگا، یا شیطان اور ان دونوں اصناف سے جدا ایک خاص مخلوق یعنی انسان کی تخلیق کا مقصد فوت ہو جائیگا۔ مثلاً اگر چند بنیادی دینی احکام کی پابندی کریں اور دنیا داری بقدر ضرورت

دنیا سے استفادہ کرتے رہیں تو خود انسانوں میں بھی ذوقی و اخلاقی بے اعتدالی کم ہو جائے گی ورنہ یہی بے اعتدالی اختلال اور خونریز کشمکش کا باعث بنتی رہتی ہے۔

ایسی آیتیں قرآن مجید میں بکثرت ملتی ہیں جن میں یہ بتایا گیا ہے کہ خدا نے اپنی ہر مخلوق انسان کی خدمت یا استفادے کے لئے پیدا کی ہے اور انسان اپنے خالق کی عبادت کے لئے پیدا کیا گیا ہے مگر اس کی تفصیل یہاں طولِ بحث سمجھی جائے گی۔

بیعت | حکمران کی اطاعت کو جیسی کچھ اہمیت حاصل ہے، ظاہر ہے۔ قرآن مجید میں بھی اس پر کچھ کم زور نہیں دیا گیا ہے، مثلاً:-

(۱) یاایھا الذین آمنوا أطیعوا اللہ وأطیعوا الرسول واولی الامر منکم الآیہ اے ایمان والو اطاعت کرو اللہ کی اور رسول کی، اور ان لوگوں کی جو تم میں سے افسران حکومت ہوں، اگر تم میں کسی معاملے میں آپس میں جھگڑا ہو تو اُسے اللہ اور رسول سے رجوع کرو اگر تمھیں خدا اور یوم آخرت پر سچا ایمان ہو۔ یہی بہتر اور مآل کار اچھا طریقہ ہے۔ (قرآن مجید ۴/۵۹)

(ب) اذا جاءھم أمر من الامن أو الخوف اذاعوا بہ الآیہ اگر امن یا خوف کی ان کو کوئی خبر ملتی ہے، تو اسے مشہور کر دیتے ہیں۔ بہتر ہوتا کہ وہ اس کی اطلاع رسول کو اور اپنے افسروں کو دیتے تو سمجھ دار لوگ اُس کو سمجھ جاتے۔ (قرآن مجید ۴/۸۳)

یہ تو افسروں کی اطاعت کا ذکر تھا۔ جناب رسالت مآب صلعم کی شخصی اطاعت پر تو اس سے بھی زیادہ مواقع پر زور دیا گیا ہے۔ کہیں صرف حکم ہے، تو کہیں اس کے فوائد بتا کر ترغیب دی گئی ہے۔ رسول کی اطاعت اور پیروی کے ان احکام کا یہ ناگزیر نتیجہ تھا، کہ بعد کے زمانے میں آپ کے ہر قول اور فعل کا تذکرہ محفوظ کرنے کی انتہائی عظیم الشان کوششیں اہل علم کی جانب سے عمل میں لائی گئیں۔ ایسی بعض آیات حسب ذیل ہیں:۔

(۱) مَآ اٰتٰکُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْہُ وَمَا نَھٰکُمْ عَنْہُ فَانْتَھُوْا....

جو کچھ رسول تمہیں دے اُسے لے لو، اور جس سے منع کرے اُس سے رک جاؤ۔ (قرآن مجید [illegible])

(ب) لَقَدْ کَانَ لَکُمْ فِیْ رَسُوْلِ اللّٰہِ اُسْوَۃٌ حَسَنَۃٌ بیشک اللہ کے رسول میں تمہارے لئے ایک اُسوۂ حسنہ پایا جاتا ہے۔

(قرآن مجید [illegible])

(ج) یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ وَلَا تَوَلَّوْا عَنْہُ وَاَنْتُمْ تَسْمَعُوْنَ الآیہ اے ایمان والو اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو، اور جب وہ کچھ کہتا ہو سن کر روگردانی نہ کرو...

.... اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو، اور آپس میں جھگڑو نہیں، تاکہ تم کمزور نہ پڑ جاؤ، اور تمہاری ہوا نہ اکھڑ جائے۔[1] اس کے بعد [illegible] اللہ علیہ [illegible]

---

[1] ایک بحری محاورہ ہے، بادبانوں سے ہوا نکل جائے تو مانع (بقیہ صفحہ ۱۳۳ پر)

کام لینے والوں کے ساتھ ہوتا ہے۔ (قرآن مجید ۳۰:۴۶)

(د) وَمَا يَنطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحَىٰ، وہ (یعنی رسول خدا) اپنی خواہش سے کچھ نہیں کہتا، بلکہ وہ وحی ہی ہوتی ہے۔

(قرآن مجید ۵۳:۳)

آرنلڈ نے اپنی کتاب خلافت میں بالکل ٹھیک رائے ظاہر کی ہے، کہ جب اس طرح رعیت کے فریضہ اطاعت پر زور دیا گیا، مگر اس کے ساتھ ہی حکمران کے لازمی فرائض کا اتنا ذکر نہیں ہوا تو اس سے اسلامی حکمران جابر اور استبداد پسند نہیں بن گیا، کیونکہ حشر و نشر اور حساب و کتاب کا عقیدہ نیز حکمران کا بھی قانون اسلامی کے ماتحت ہونا اس پر گرفت رکھنے کے لیے کافی ثابت ہوئے۔ اس کے یہ معنے نہیں کہ حکمران کے فرائض پر قرآن مجید نے زور نہ دیا ہو۔

(۲) فَلِذَٰلِكَ فَادْعُ وَاسْتَقِمْ كَمَا أُمِرْتَ وَلَا تَتَّبِعْ أَهْوَاءَهُمْ ۖ الآیہ
اس کے لئے بلا اور (اے محمد) استقامت سے رہ جیسا کہ تجھے حکم دیا گیا ہے، اور ان کی خواہشات کی پیروی نہ کر، بلکہ کہہ ا..
میں ایمان لاتا ہوں ہر اس کتاب پر جو اللہ نے اتاری ہے، اور مجھے حکم دیا گیا ہے، کہ تم میں انصاف کرتا رہوں۔ اللہ ہمارا

(بقیہ نوٹ صفحہ ۱۳۳) سبے بس ہو جاتا ہے، اس محاورہ سے معلوم ہو سکتا ہے کہ قدیم عربوں کو سمندر سے کتنا لگاؤ تھا۔

اور تمہارا آقا ہے، ہم کو ہمارے کام اور تم کو تمہارے کام، ہم میں
اور تم میں کوئی حجت نہیں، اللہ ہمیں یکجا کرے گا، اور ہمیں اسی کی
طرف جانا ہے۔ (قرآن مجید ۴۲/۱۵)

(ب) فَلَنَسْـَٔلَنَّ الَّذِيْنَ اُرْسِلَ اِلَيْهِمْ وَلَنَسْـَٔلَنَّ الْمُرْسَلِيْنَ
تب ہم یقیناً ان لوگوں سے دریافت کریں گے، جن کے پاس
ہمارا پیغمبر بھیجا گیا تھا، اور ہم پیغمبروں سے بھی پوچھیں گے۔

(قرآن مجید ۷/۶)

متعدد آیتوں میں اس پر زور دیا گیا ہے، کہ اجتماعی اور حکومتی مفاد
کو انفرادی مفاد پر ترجیح دی جائے، مثلاً قرآن مجید (۸/۲۷ تا ۸/۲۸ و ۹/۲۴)۔

(۱) يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَخُوْنُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ الآیہ اے ایمان
والو اللہ اور اس کے رسول سے خیانت نہ کرو، اور نہ جان بوجھ کر
اپنی باہمی امانتوں میں خیانت کرو۔

(ب) وَاعْلَمُوْۤا اَنَّمَاۤ اَمْوَالُكُمْ وَاَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ الآیہ اور یہ جان لو
کہ تمہارے مال اور تمہاری اولاد ایک آزمائش ہے، اور خدا ہی کے
پاس اجر عظیم پایا جاتا ہے۔

مذکورہ بالا آیتوں سے یہ واضح ہوتا ہے، کہ ذاتی مفاد کے لئے یا بیوی بچوں کی خاطر بھی ہمیں کوئی ایسا کام نہیں کرنا چاہیئے، جو نامناسب ہو، اور عالم آخرت کے حساب و کتاب کے لئے ہمیں اپنے ہر فعل میں اس کا لحاظ رکھنا چاہیئے۔

ضمناً اس چیز کی طرف بھی اشارہ کیا جاسکتا ہے کہ "حُبِّ ملی" اسلام میں ایک نیم مذہبی، نیم سیاسی وحدت کے تصور پر مبنی ہے، جغرافی یا لسانی وطنی یا نسلی وحدت سے اُسے کوئی سروکار نہیں، چنانچہ:-

(ا) یَا اَیُّھَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنَاکُمْ مِّنْ ذَکَرٍ وَّ اُنْثٰی وَجَعَلْنَاکُمْ شُعُوْبًا وَّ قَبَائِلَ لِتَعَارَفُوْا الآیہ (اے انسانو ہم نے تم کو مرد اور عورتیں بنایا، اور تمھیں قوموں اور قبیلوں میں تقسیم کیا، تاکہ تم پہچانے جاسکو، لیکن اصل میں تم میں سے سب سے زیادہ بزرگ خدا کے پاس وہی ہوتا ہے، جو تم میں سب سے زیادہ متقی ہو علم اور خبر خدا ہی کو حاصل ہوتی ہے- (قرآن مجید $\frac{49}{13}$)

(ب) اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَۃٌ، ایمان والے سب آپس میں بھائی بھائی ہیں- (ایضاً $\frac{49}{10}$)

(ج) وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰہِ جَمِیْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا وَاذْکُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰہِ عَلَیْکُمْ اِذْ کُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَیْنَ قُلُوْبِکُمْ الآیہ- اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھامے رہو اور تفرقہ نہ کرو، اور اللہ کی اس نعمت کو یاد کرو کہ تم آپس میں دشمن تھے، اور (ایمان لانے کے باعث) اس نے تمھارے دلوں میں الفت ڈال دی، اور اس کی عنایت سے تم بھائی بھائی بن گئے، تم تو آگ کے گڑھے کے کنارے کھڑے تھے، اور اسی نے تم کو بچایا- اس طرح اللہ اپنی آیتیں تم سے بیان کرتا ہے، تاکہ تم ہدایت پاسکو، اور تم سے ایک ایسی قوم

پیدا ہو جو بھلائی کی طرف بلائے، اچھی بات کا حکم دے، اور بری بات سے روکے۔ ایسے ہی لوگ کامیاب ہوں گے۔

(قرآن مجید ۳/۱۰۴)

یہ بیان کرنے کی شاید ہی کچھ ضرورت ہو کہ ایمان اور عمل صالح کی قیمت کے سوا اسلام حسب و نسب کی کسی برتری کو قطعاً تسلیم نہیں کرتا، انبیاء کی اولاد تک "عمل غیر صالح"[۱۱۰] کے باعث عذاب میں گرفتار ہوئی۔

عدل گستری | یہ حکمران کا اولین فریضہ ہے کہ اُسے ناطرفدار ہونا چاہیئے، اور انصاف کے ساتھ حسب موقع و ضرورت رحم بھی کرنا چاہیئے، (دیکھئے قرآن مجید ۴/۵۸، ۸۵، ۱۳۵ و ۵/۸ و ۱۶/۹۰)

غیر مسلم ذمی رعایا کو عدالتی خود مختاری دینے کا قرآن مجید میں حکم ہے، جہاں ان کے ساتھ ان کے شخصی قوانین کے مطابق فیصلے انجام پائیں گے۔ اگر غیر مسلم رعایا اسلامی عدالت میں اپنی مرضی سے مقدمہ یا مرافعہ پیش کرے، تو اس کے ساتھ بھی انصاف کیا جانا چاہیئے (دیکھئے قرآن مجید ۵/۴۲ تا ۵۰) اس بارے میں مزید تفصیل ایک علیحدہ مضمون کی متقاضی ہے[۱۱۱]، البتہ اتنا اور اشارہ

---

۱۱۰ قرآن مجید ۱۱/۴۶

۱۱۱ "عدل گستری ابتدائے اسلام میں" کے عنوان سے جو مضمون مجلہ عثمانیہ حیدرآباد مارچ ۱۹۳۳ء میں چھپا اس کے حوالے فرانسیسی ترجمہ میں نے بھی دیئے ہیں۔ یہ ایک آئندہ باب میں ملے گا۔ مگر غیر مسلم رعایا کی حیثیت اسلامی مملکت میں تفصیل طلب ہے۔ شاید بزم مذاکرہ اس کا موقع دے۔

کیا جا سکتا ہے، کہ قیامت کی جزائے اعمال، حساب و کتاب، چشم دید گواہ، تحریری شہادت، کراماً کاتبین کی ڈائری وغیرہ کی جو تفصیل قرآن میں آئی ہو وہ عہد نبوی کے مروجہ امور ہوں گے، جن کے ذریعہ سے عالم آخرت کا خاکہ سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے۔

<u>شورائیت</u> | قرآن مجید میں حکم ہے کہ حکمران اپنے فیصلے مشورہ لے کر کیا کریں۔ چنانچہ:-

(ا) وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ فَإِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ الآیۃ اور ان سے معاملات میں مشورہ کر پھر جب تو عزم کر لے تو خدا پر توکل کر، بیشک خدا توکل کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔

(قرآن مجید ۳/۱۵۹)

(ب) فَمَا أُوتِيتُم مِّن شَيْءٍ فَمَتَاعُ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَمَا عِندَ اللَّهِ خَيْرٌ وَأَبْقَىٰ الآیۃ جو کچھ تمہیں دیا گیا وہ دنیاوی زندگی کا ایک حقیر متاع ہے، اور بس، ورنہ خدا کے پاس جو چیز ہے، وہ بہتر اور زیادہ پائدار ہے۔ یہ ان لوگوں کو ملے گی، جو اپنے رب پر ایمان لاتے اور اس پر توکل کرتے ہیں، اور جن کے معاملات باہمی مشورہ سے طے ہوتے ہیں، اور جو اس چیز کو خرچ (خیرات) کرتے ہیں، جو ہم نے ان کو عطا کی۔

(الشوریٰ ۴۲/۳۶ تا ۳۸)

(ج) طَاعَةٌ وَقَوْلٌ مَّعْرُوفٌ فَإِذَا عَزَمَ الْأَمْرُ فَلَوْ صَدَقُوا اللَّهَ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ (مشیروں وغیرہ کے لئے فیصلے کے بعد) اطاعت

اور فیصلے کے مطابق قول معروف ہونا چاہیئے اور پھر جب کسی
کام کا عزم کر لیا جائے، تو اگر وہ لوگ خدا سے اپنے کئے ہوئے
وعدے کو پورا کریں تو انہیں کے لئے اچھا ہے (قرآن مجید [illegible])

غرض اگر مشورہ لینے کی ایک طرف پابندی عائد کی گئی ہے، تو دوسری طرف مشورہ کے بعد جو بھی چیز قرار پا جائے اس کی تعمیل کرنا بلا لحاظ اس کے کہ وہ اپنی رائے اور مشورے کے مطابق تھی یا مخالف، ضروری قرار دیا گیا ہے۔ ساتھ ہی اس کا بھی ذکر کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ آخری ذمہ داری چونکہ حکمران پر ہوتی ہے، اس لئے اس کو مشورے کے متعلق حق تنسیخ دیا گیا ہے جیسا کہ قرآن مجید [illegible] میں بیان کیا گیا ہے۔

قانون سازی قرآن مجید نے نبی کریم صلعم کے ہر قول و فعل کو اُسوۂ حسنہ اور قانون کی حیثیت دی ہے، (دیکھئے قرآن مجید [illegible] و [illegible] وغیرہ) اس حکم کے باعث اسلامی فقہاء یا قانون سازوں کا کام آسان تر ہو گیا، کیونکہ ایک طرف تو جن چیزوں کا ذکر قرآن مجید میں نہ تھا، ان کے لئے حدیث نبوی میں کافی مواد مل گیا، اور دوسری طرف یہ بھی دیکھا گیا، کہ خود رسول کریم صلعم نے نہ صرف یہ کہ قیاس اور استنباط سے کام لیا، بلکہ اس کی صراحت کے ساتھ اجازت بھی دی تھی، جیسا کہ معاذ بن جبل رضؓ گورنر یمن کے تقرر نامے وغیرہ میں مذکور ہے۔ اگرچہ قرآن اور حدیث کی قیاس کے ذریعے سے تنسیخ نہیں ہو سکتی، لیکن قیاس اور تعبیر کی اجازت سے علماء و فقہاء کو انفرادی رائے سے کام لینے کی خاصی گنجائش مل گئی، حتیٰ کہ یہاں تک تسلیم کیا گیا، کہ مجتہد سے غلطی ہو سکے

کے امکان کے باوجود اس کو اس کام سے نہیں روکا جا سکتا۔ چنانچہ ایک حدیث میں مذکور ہے، کہ "اجتہاد کرنے والا خطا بھی کر سکتا ہے، صواب کو بھی پہنچ سکتا ہے، اور صحیح فیصلے کی صورت میں اسے دو ثواب ملیں گے اور خطا کی صورت میں ایک ثواب[۱۵]" اس طرح اس کا بھی موقع نکل آیا کہ ایک مجتہد کے بعد دوسرا مجتہد بھی اجتہاد کرے، اور کسی بہتر نتیجے پر پہنچنے کے باعث سابقہ مجتہد کا فیصلہ منسوخ قرار پائے۔ اور خود اجماع کے متعلق بھی فقہاء نے ایسی ہی سہولت تسلیم کی ہے۔ جب تک ان اجازتوں سے فائدہ اٹھایا جاتا رہا، اسلامی قانون میں زمانے کا ساتھ دینے کی گنجائش رہی، اور وہ ترقی کرتا رہا، اور جب سے قدیم فقہاء کے فیصلوں کے خلاف اجتہاد کا دروازہ چند لوگوں نے بند کر دیا، تو اس سے قانونِ اسلامی کو بے حد نقصان پہنچا، لیکن یہ مسئلہ یہاں دائرۂ بحث سے خارج ہے۔

جہان بانی کے قواعد | قرآن مجید میں اندرونی اور بیرونی سیاست کے قواعد خاصی تفصیل سے ملتے ہیں، جن سے حالتِ امن و صلح و غیر جانبداری میں حکمران کی رہنمائی مقصود تھی۔ رسولِ کریم صلعم نے خود ایک مملکت قائم کی، اور اس ملک میں جہاں ہمیشہ سے نراج سا چلا آرہا تھا، ایک مرکزیت اور ایک تنظیم پیدا کی، اور عربوں کو خانہ جنگیوں کے ذریعے سے اپنی توانائیوں کو ضائع کرنے سے روک کر انھیں اپنے زمانے میں دنیا کی سب سے بڑی فاتح اور نوآبادکار

---

[۱۵] رسالۂ امام شافعی صفحہ ۶۸ وغیرہ

قوم بنا دیا، اور ان کے ذہنوں سے احساسِ کمتری کو کلی طور پر دور کرکے ان میں وہ صحت مند جذبہ بھر دیا، جسے احساسِ برتری یا احساسِ خودشناسی کہا جا سکتا ہے، اور جو کسی ترقی پذیر قوم کے لئے اس قدر ضروری ہوتا ہے۔ چنانچہ ایک [illegible] دلانے والی چیز کو وہ اپنا مشن اور مقصدِ حیات باور کرنے لگے:-

(۱) کنتم خیر امۃ اخرجت للناس تامرون بالمعروف و تنہون عن المنکر۔ تم وہ بہترین قوم ہو، جو انسانوں کے لئے پیدا کی گئی کہ تم اچھی بات کا حکم دیتے ہو، اور بری بات سے روکتے ہو۔ (قرآن مجید پ۴ ۳/۱۱۰)۔

(۲) اذن للذین یقاتلون بانہم ظلموا الآیہ۔ ان لوگوں کو جن سے لڑا جا رہا تھا (برابر کا جواب دینے کی) اجازت دیدی گئی کیونکہ ان پر ظلم کیا گیا تھا ...... یہ وہ لوگ ہیں کہ اگر ہم ان کو زمین میں اقتدار عطا کریں، تو وہ خدا کی عبادت کو قائم کریں، اور زکوٰۃ دیں، اچھی بات کا حکم دیں، اور بری بات سے روکا دیں۔ (قرآن مجید پ۱۷ ۲۲/۴۱)

(۳) قاتلوھم حتی لا تکون فتنۃ ویکون الدین کلہ للہ۔ ان سے اس وقت تک لڑتے رہو، تا آنکہ فتنہ باقی نہ رہے، اور خدا ہی کا دین چھا جائے۔ (ایضاً ۸/۳۹)

(۴) وما ارسلناک الا کافۃ للناس بشیرا و نذیرا الآیہ

(اے محمدؐ) ہم نے تجھے صرف اس لئے بھیجا ہے کہ تمام لوگوں
کے لئے بشیر و نذیر بنے، گو اکثر لوگ اسے نہیں جانتے۔

(قرآن مجید [illegible])

غالباً یہی وہ ایقان یا احساس فرض تھا، جس نے انھیں دنیا میں حکومت الٰہیہ قائم کرنے کی غرض سے اپنی ہر چیز کو قربان کر دینے کے لئے آمادہ کر دیا۔ جہاد کا جو حکم مذکورہ بالا اور دیگر آیات قرآنی میں ملتا ہے، اس کا منشا یہ بالکل نہ تھا، کہ دوسروں کی جان او لوٹی جائے، بلکہ اس کا مقصد صرف یہ تھا، کہ وہ ایک مقدس ترین اور بڑا ایثار طلب فریضہ تھا، کہ اپنی جان جوکھوں میں ڈال کر دوسروں کی رہنمائی کریں، اور ان کو سیدھا راستہ دکھائیں۔ یہ بار جو محض خدا کی راہ میں تھا اسے انھوں نے ہنسی خوشی برداشت کیا۔

قانون بین الممالک کے قابلِ تفصیلی احکام بھی قرآن مجید میں ملتے ہیں، جن پر مختلف مقالے بھی لکھے جاتے رہے ہیں[١٧]۔ یہاں ان کی تفصیل کی گنجائش نہیں، صرف اس قدر اشارہ کافی ہے کہ قرآن مجید میں اتفاقی جنگ ([illegible]) معاہدات کی تعمیل ([illegible]) مدافعت ([illegible]، [illegible] تا [illegible])

---

[١٧] چنانچہ اسلامک کلچر حیدرآباد میں جنوری ۱۹۴۱ء و مابعد کے پرچوں میں میرا کئی سو صفحوں کا ایک طویل مقالہ چھپا ہے۔ اس کی کتابیات میں سابقہ اہل علم کی کوششوں کی بھی تفصیل ہے۔

ہمدردانہ جنگ (۸/۴۲)، فریقِ ثانی کی طرف سے معاہدہ شکنی کا خوف (۸/۵۸)،
مذہبی رواداری (۲/۲۵۶، ۶/۱۰۸، ۲۲/۴۰)، غیر مسلم رعایا سے برتاؤ (۹/۲۹)،
قیدیوں سے برتاؤ (۴۷/۴، ۸/۶۷ تا ۷۱)، پناہ جوئیوں کو امن دینا (۹/۶)، مفتوحہ
اراضی کا انتظام (۵۹/۷)، صلح کرنا (۸/۶۱)، غیر جانبداری (۴/۸۸ تا ۹۱، ۱۱/۸۵ تا ۱۲)،
(۴۹/۹ تا ۱۰) وغیرہ وغیرہ امور کا اصولی ذکر ملتا ہے۔

<u>قومی دولت</u> کَیْ لَا یَکُوْنَ دُوْلَۃً بَیْنَ الْاَغْنِیَآءِ مِنْکُمْ، "تاکہ وہ تم میں سے
صرف مالداروں میں گردش نہ کرتی رہے" (قرآن مجید ۵۹/۷)

دولت عامہ کے متعلق یہ اسلامی اصول کا خلاصہ ہے، جو قرآن مجید نے پیش کیا ہے۔ اسلامی معاشیات کے پیشِ نظر یہ چیز رہی ہے کہ دولت کی ملک کے ہر طبقے میں تقسیم عمل میں آئے، اور وہ یکجا اکٹھی نہ ہو، بلکہ گردش کرتی رہے۔ معیار سے زائد دولت پر لازمی محصول (زکوٰۃ)، زکاۃ، وصیت کرنے کے اختیارات کی تحدید اور کسی شخص کی جائداد سے اس کی وفات پر اس کے قریبی رشتہ داروں کو لازمی طور سے حصہ ملنا، نیز غرباء اور محتاجوں کے لئے حکومت کی آمدنی میں لازمی طور سے حصہ مقرر کیا جانا، یہ اور اس کے مماثل قاعدے قرآن مجید نے مقرر کئے ہیں، جن سے تقسیم و گردشِ دولت کا مقصد پورا ہوتا ہے۔ اور ساتھ ہی انفرادی ملکیت پر کوئی قید عائد نہ ہونے سے ہر شخص کو اپنے قوائے فطری سے زیادہ سے زیادہ کام لینے کی ترغیب ہوتی رہتی ہے۔ اور سود کی ممانعت اور قرضہائے حسنہ کا انتظام جو قرآن مجید نے کیا ہے (۲/۲۷۵)، (نوٹ صفحہ ۱۴۳ پر ملاحظہ ہو)

وہ اسلامی قواعدِ معاشیات کو ایک مکمل نظام کی حیثیت دیدیتے ہیں، جو نہ تو سرمایہ داری ہے اور نہ اشتراکیت، بلکہ اس میں ان دونوں کی خوبیاں ہیں، اور ساتھ ہی دونوں کی برائیوں سے اس نظام کو محفوظ رکھنے کا انتظام کر دیا گیا ہے۔

اخلاقِ عامہ | جیسا کہ اوپر واضح کیا گیا، میرے نزدیک مذہب اور سیاست دونوں ایک دوسرے سے ممتاز عمل ہیں، ان کو ایک سمجھنا غلطی ہے۔ مذہب انسان اور خالق کے تعلق کا نام ہے، اور سیاست بندوں کے باہمی تعلقات کے لئے برسرِکار ہوتی ہے۔ لیکن اگر ان دونوں میں کوئی رابطہ اور حلقۂ اتصال نہ پیدا کیا جائے، تو انسانیت کو لامحدود نقصان پہنچ جاتا ہے۔ اسلام نے اس کا ایک حل تلاش کر لیا، اور اس کو کامیابی سے عمل میں لاکر بھی دکھا دیا۔ اور وہ یہ تھا کہ اگرچہ مذہب اور سیاست دونوں کے دائرہ ہائے عمل بالکل جدا جدا ہیں، لیکن دونوں کے قواعد کا ماخذ واساس ایک ہی چیز کو قرار دیا گیا۔ چنانچہ مسلمانوں کا مذہب اور مسلمانوں کی سیاست دونوں کی رہنمائی قرآن و حدیث، اصولِ انصاف و استحسان، اور ہم آہنگیٔ ضمیر سے ہوتی ہے۔

(بقیہ نوٹ صفحہ ۱۴۲) سے آیت "والغارمین" کی طرف اشارہ ہے جو علاوہ فقراء و مساکین کے ہیں۔ نیز حضرت عمرؓ کے زمانے سے بیت المال کا قرضۂ حسنہ دیا کرنا معلوم ہے۔ مزید تفصیل کے لئے میرا مضمون "انجمن ہائے قرضہ ہائے حسنہ" مطبوعہ مجلہ طیلسانیین حیدرآباد ۱۹۴۳ء۔

سیاسی اصطلاحات | اسلامی ادارہ ہائے سیاست نے اپنی بہت سی اصطلاحیں
قرآن مجید ہی سے لی ہیں، چنانچہ امّت اور ملّت سے سیاسی جماعت مراد
ہوتی ہے۔ خلیفہ اور امام اس جماعت کے سردار کا نام ہوتا ہے، (دیکھئے
قرآن مجید ۲/۱۴۳ نیز سیرۃ ابن ہشام ص ۳۴۱ میں رسول کریم صلعم نے شہر مدینہ
کے لئے ہجرت کے بعد جو دستور مملکت نافذ فرمایا تھا، اور جس کا پورا متن خوش
قسمتی سے ہم تک پہنچ چکا ہے، اس کی دفعہ (۲) میں بھی انہی اصطلاحات
کو استعمال کیا گیا ہے۔ لفظ خلیفہ کے لئے دیکھئے قرآن مجید ۲/۳۰ اور لفظ امام
کے لئے ۲/۱۲۴۔

جانشینی | لفظ خلیفہ کے ساتھ ہم جانشینی کے خاردار مسئلے سے دوچار ہو جاتے
ہیں۔ یہی وہ مسئلہ ہے جس نے تیرہ سو سال سے مسلمانوں کو دو بڑی متخاصم
جماعتوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ جو اسلام رسول کریم صلعم اپنی امت کے لئے لائے
تھے، اور جس کی آپ عمر بھر تبلیغ کرتے رہے، اس کے بنیادی اصولوں میں
کہیں بھی اس کا ذکر نہیں ہے، کہ آپ کی جانشینی کے لئے کیا اصول ہو،
اور اس اصول کا ماننا اس سے بھی کم ایک جزو عقیدہ اور بن سکتا ہے، لیکن
بدقسمتی سے اس کے بالکل برعکس صورت حال پیدا ہو گئی، اور ہر دو فریقوں
کے ہاں غلو رکھنے والے خیالات بھی پھیلاتے رہے۔ حالیہ زمانے میں ایک حل
جو اس کے لئے سوچا گیا ہے وہ سنجیدہ غور کا مستحق ہے، وہ یہ کہ سُنّی اور
شیعہ دونوں اس امر پر متفق ہیں کہ تاریخی واقعے کی حیثیت سے جناب رسالت
مآب صلعم کے بعد حضرت علیؓ پہلے خلیفہ نہیں ہو سکے۔ اسی طرح شیعہ اور سُنّی

دونوں ہی اس پر متفق ہیں کہ روحانی امور میں حضرت علیؓ جناب رسالت مآب صلعم کے خلیفۂ بلا فصل[۹۵] ہیں، چنانچہ چشتیہ، قادریہ، سہروردیہ وغیرہ اور خود نقشبندیوں کی ایک شاخ، غرض قریب قریب تمام ہی صوفی سلسلے اسی کو مانتے ہیں[۹۶]۔ اب رہا یہ امر کہ حضرت علیؓ کو سیاسی جانشینی کا بھی استحقاق تھا یا نہیں، یہ ایک خالص علمی مسئلہ رہ جاتا ہے، جس کو آئے دن کی روز مرہ سیاسی زندگی پر اب تیرہ سو سال بعد اثر انداز کرنے کی کوئی ضرورت نہیں رہتی۔

جس طرح ایک نبی کے بعد دوسرے نبی کے آنے تک اول الذکر ہی کی شریعت باقی رہتی ہے، اسی پر قیاس کر کے یہ کہا جا سکتا ہے کہ ایک حکمران کی وفات کے باوجود اس کے جانشین کے انتخاب تک اول الذکر ہی کا اقتدار جاری رہتا ہے، اور اسی کے مقرر کردہ افسر اپنے فرائض منصبی انجام دیتے رہنے کے پابند ہیں، چنانچہ:-

كَانَ اَبُوحنيفة يقول اذا مات الخليفة فالقاضى على قضائه	امام ابوحنیفہ فرماتے تھے، اگر خلیفے کا انتقال ہو جائے، تو قاضی اپنی

---

۹۵ "خلیفہ بلا فصل" کے معنی گویا یہ ہوئے کہ جس نے براہ راست آنحضرت صلعم سے فیض پایا ہو۔ اس معنے کے لحاظ سے تمام اکابر صحابہ خلفائے بلا فصل تھے۔

۹۶ اور یوں بھی عالم مادی میں "دو شاہ اندر اقلیمے نہ گنجند" صحیح ہو تو ہو، عالم روحانی میں ایک سے زیادہ خلیفۂ بلا فصل ہونے میں کوئی مانع نہیں۔

والوالی علی ولایتہ حتی یغیرلہ	قضاءت پر اور والی اپنی حکومت
القائم بعدہ ، (مناقب ابی حنیفہ	پر باقی رہتا ہے ، جب تک خلیفہ کا
للموفق ج ا صفحہ ۵۸)	جانشین اسے بدل نہ دے ،

اس مسئلے کو قاتلِ حضرت عمرؓ کے بعض بے گناہ ہم وطنوں کی شہادت اور ان شہدا کی عدم دار وگیر کے افسوسناک تاریخی واقعے کے باعث تھوڑی سی اہمیت تھی ، اس لئے اس کا بھی ذکر کر دیا گیا ۔

خاتمۂ کلام | ظاہر ہے کہ دشمن کے اعتراف سے بڑھ کر ناطرفدارانہ اور وقیع شہادت کوئی اور ہو نہیں سکتی ۔ اس لئے مذکورۂ بالا اصول اور نظریات پر عمل کے متعلق ہم اجنبیوں کے بیانات نقل کرتے ہیں :-

خلافت راشدہ کے آغاز پر مسلمانوں کے ہاتھوں حکومت الٰہیہ کی جس توسیع کا آغاز ہوا ، اس کا اولین ہدف عیسائیوں کی بیزنطینی سلطنت بنی ۔ اس جنگی کارروائی کو شروع ہو کر پندرہ سال بھی نہیں گزرے تھے کہ (حضرت عمرؓ کے آخری زمانے یا حضرت عثمانؓ کے ابتدائی زمانے میں) ایک نسطوری پادری نے جو تاثرات سپرد کاغذ کئے تھے وہ اتفاق سے محفوظ ہیں :-

"یہ طائی (یعنی عرب) جن کو خدا نے آج کل حکومت عطا کی ہے، وہ ہمارے بھی مالک بن گئے ہیں ۔ لیکن وہ عیسائی مذہب سے مطلق برسرپیکار نہیں بلکہ اس کے برخلاف وہ ہمارے دین کی حفاظت کرتے ہیں ، ہمارے پادریوں اور مقدس لوگوں کا احترام کرتے ہیں اور ہمارے گرجاؤں اور کلیساؤں کو جاگیریں عطا کرتے ہیں"[۱] (نوٹ صفحہ ۱۴۷ پر)

اسی طرح کی ایک اور شہادت زمانۂ حال کے ایک متعصب رومن کیتھلک پادری نے "کلیسائی تاریخ و جغرافیہ کے قاموس" میں یوں دی ہے :-

"مسلمان عربوں کو یعقوبی (جاکوبائٹ) عیسائیوں نے بھی اپنے نجات دہندوں کی حیثیت سے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ مسلمانوں کی سب سے اہم جدت جس کا یعقوبی عیسائیوں نے دلی خوشی سے استقبال کیا، یہ تھی کہ ہر مذہب کے پیروؤں کو ایک خود مختار وحدت قرار دیا جائے اور اسی مذہب کے روحانی سرداروں کو ایک بڑی تعداد میں دنیاوی اور عدالتی اقتدارات عطا کئے جائیں[۱۰]"

یہ تو نورِ نبوت سے براہ راست منور ہونے والے عہد خلافت راشدہ کا ذکر تھا۔ اس کے صدیوں بعد کے دنیا دارانہ دور کے متعلق روسی مستشرق پروفیسر بارتولڈ لکھتا ہے :-

---

بقیہ گزشتہ

[۹] پادری السمانی کی Assemani, Bibl. Orient., III, 2, p. XCVI

نیز دخویے کی De Goeje, Mémoire sur la conquête de la Syrie, 2me éd., p. 106.

[۱۰] فرانسیسی قاموس Dict. d'Hist. et Géographie ecclésiastique, s.v. "Antioche" par Karalevski.

حروب صلیبیہ کے زمانے میں ، ایک روسی مورخ کلیسا کے مطابق "پادری اور عوام سب ہی کی یہ خواہش تھی کہ مسلمانوں کا جوا ان کے کندھوں پر واپس آجائے بہ نسبت اس کے کہ لاطینیوں کا تسلط برقرار رہے۔[۵۱]

اسی طرح یونانی ادبیات کا مشہور مورخ کرومباخر تسلیم کرتا ہے :-

وہ قسطنطنیہ کے سقوط کے عین ماقبل زمانے میں بیزنطینیوں کو لاطینی اہل مغرب سے کچھ اتنی شدید نفرت پیدا ہو گئی تھی وہ اسلام سے نفرت پر غالب آ گئی تھی اور بہ کثرت تالیفوں میں نہ صرف یہ سوال اٹھایا جانے لگا کہ ، کیا مسلمانوں کے ہاتھوں میں پڑنا لاطینیوں کے ہاتھوں میں پڑنے سے بہتر نہ ہوگا ، بلکہ اس سوال کا اثبات میں جواب دیا جاتا رہا ہے[۵۲]

ایک اور مولف کے دلچسپ اشارے پر اس ذکر کو ختم کیا جاتا ہے ۔ پروفیسر واکر نے قانون بین الممالک کی تاریخ لکھتے ہوئے یہ ملاحظہ پیش کیا ہے

---

۵۱ جامعۂ کلکتہ کا شائع شدہ روسی سے ترجمہ (Barthold, Mussalman Culture, p. 22.

۵۲ جرمن تالیف Krumbacher, Geschichte der byzantinischen Literature, p. 49-50.

کہ متمدن اور مہذب سلطنتوں پر وحشیوں کا دھاوا بول دینا اور غالب آکر سلطنت و حکومت کے مالک بن جانا،

معاشرۂ انسانی کی تاریخ کا ایک عارضی واقعہ ہے لیکن جرمنوں، تاتاریوں وغیرہ وحشیوں کے برخلاف عجیب بات یہ ہے کہ عرب کے بدو جب یک بیک اپنے صحرائی براعظم سے بیرون میں امنڈ لے گئے (یعنی خلافت راشدہ میں) تو ان عربی فتوحات کو عام تصور کے وحشی فتوحات میں کسی طرح شامل نہیں کیا جاسکتا کیونکہ ان "وحشی بدوؤں" میں پہلے ہی دن سے ان کے مفتوحوں سے بھی بڑھ کر تہذیب اور اخلاق حسنہ نظر آتے ہیں۔[۱]

ہم اصول بھی دیکھ چکے اور اس کا اطلاق بھی لیکن یہ محض سرسری خاکہ ہے جو نقش اولین سے بڑھ کر نہیں۔ ضرورت ہے کہ زیادہ قابل اہل علم اس موضوع پر توجہ فرمائیں۔

وآخر دعوانا أن الحمد لله رب العٰلمین۔

(معارف اعظم گڑھ، دسمبر ۱۹۴۱ء)

---

[۱] Walker, A History of the Law of Nations, vol. 1, p. 73:-

"Their success represents no barbarian conquest .. far higher civilization (than that of the Byzantine Empire in Asia and Africa)".

اسلامی عدل گستری اپنے آغاز میں

یہ مقالہ انجمن طیلسانین (گریجویٹس) جامعہ عثمانیہ کی تیسری سالانہ کانفرنس میں پڑھا گیا تھا اس کا ترجمہ اگرچہ رسالہ اسلامک کلچر (حیدرآباد) میں چھپ رہا ہے لیکن اس اصل میں اس کے بعد متعدد چیزیں بڑھائی گئی ہیں۔ (ا ح م)

حیدرآباد کی مجلس وضع قوانین[1] کے ضابطے اور عدالت عالیہ کے متعدد فیصلوں میں تسلیم کیا گیا ہے کہ ممالک محروسہ سرکار عالی (حیدرآباد) کا ان لکھا یا غیر موضوعہ قانون شریعت اسلام ہے اسی بنا پر، موجودہ حیدرآباد کی عدل گستری کے اصول کو بہتر طور سے سمجھنے کے لئے، ہمیں اسلامی عدل گستری کی ابتدائی تاریخ کا مطالعہ ناگزیر ہے۔

اسلام پہلے عرب سے شروع ہوا۔ عرب اپنی جاہلیت کے

---

[1] سنہ ۱۸۹۴ء میں قائم شدہ اور دیسی ریاستوں میں سب سے پہلی (دیکھئے اخبار ہندو مدراس مورخہ ۱۱ فروری سنہ ۱۹۳۶ء ضمیمہ سلور جوبلی صفحہ ۵۔ مضمون راجہ کرشنا چار، سابق معتمد مجلس وضع قوانین و مشیر قانون حیدرآباد)

زمانے میں بھی عدل گستری کو جو اہمیت دیتے تھے اس کی شاہد ویلہاوزن کے الفاظ[۵۱] ہیں ۔ خود ان کی زبان سے ہے جس میں "حکومت کرنے" اور "مقدمے کا فیصلہ کرنے" کے لئے ایک ہی لفظ (حکم) پایا جاتا ہے ۔ دوسرے الفاظ میں حکومت کا اگر واحد نہیں تو سب سے بڑا مقصد اور فریضہ عدل گستری سمجھا جاتا تھا ۔

[۵۲] یاداود انا جعلناک خلیفۃ فی الارض فاحکم بین الناس بالحق[۵۳]

اے داؤد ہم نے تجھے زمین میں نائب بنایا ہے اس لئے لوگوں میں حق طور سے فیصلہ کیا کر ۔

سے معلوم ہوتا ہے کہ قدیم سے دیگر ممالک میں بھی عدل گستری کی اہمیت برابر تسلیم کی جاتی رہی ہے ۔ اسلام نے بھی اس کی اہمیت کو گھٹانے کی کوئی کوشش نہیں کی بلکہ اسے انسانیت کا عین اقتضا اور "خدا کی نیابت" کا پہلا فریضہ قرار دیا ۔ چنانچہ یہ حکم دیا گیا کہ حق رسانی میں مدد دینے کے لئے بن بلائے بھی آگے بڑھنا اور اپنے معلومات کی حد تک سچ سچ گواہی دینا ہر شہری کے لئے ضروری ہے[۵۴]۔

---

۵۱ Ein Gemeinwesen ohne Obrigkeit.

Regieren heisst richten حکومت کرنے کے معنی ہی ہیں انصاف کرنا

۵۳ قرآن مجید ۲۶:۳۸ (یہ ایک ابتدائی مکی سورت ہے)

۵۴ قرآن مجید ۲ : ۲ و ۲۸۳ ؛ ۳ ، ۱۴۰ ؛ ۳ ، ۲۸۲ ، ۲۲ ؛ ۳۰ ، ۵۰ ، ۲۱۵

وغیرہ وغیرہ

قدیم عربوں کے پاس عدلیہ اور تنفیذیہ کے ادارے تو تھے لیکن تشریعیہ (یعنی ادارۂ قانون سازی) نہ تھا۔ یہ کمی اسلام نے آکر پوری کی جیسا کہ آگے بتایا جائے گا۔ عرب میں عدلیہ اور تنفیذیہ اگرچہ تھے لیکن بہت ہی ابتدائی حالت میں ان میں اسلام نے، جس کی تحریک سنہ ۱۳ ق ھ / ۶۱۱ ع میں شہر مکہ میں شروع ہوئی۔ رفتہ رفتہ اسلامی جماعت کے اغراض اور ضروریات کے لیے اصلاح و ترمیم کی اگرچہ بعض قدیم چیزیں جو بری نہ تھیں برقرار رہیں۔ خود رسول کریم کا ارشاد ہے کہ "اسلام میں زمانۂ جاہلیت کی اچھی چیزوں پر عمل کیا جائے گا"[1]

اسلام سے پہلے عرب میں جو عدالتی نظام تھا اس کے سلسلے میں سب سے پہلے اس ادارے کا ذکر کیا جا سکتا ہے جو خاص شہر مکہ میں قائم کیا گیا تھا۔ جس دور میں اس کا آغاز ہوا مگر اس وقت کی زیادہ تفصیلیں ہم کو معلوم نہیں ہیں۔ حرب فجار کے بعد اس ادارے کو دوبارہ زندہ کیا گیا اور اس کی طرف گیری کے ابتدائی جلسے میں اس ہونہار نوعمر نے باوجود کمسنی کے بڑے ذوق و شوق سے حصہ لیا تھا جسے کچھ دنوں بعد دنیا پیغمبر اسلام کے محترم نام سے جاننے لگی۔ اس "حلف الفضول" میں ایک رضاکار جماعت تشکیل ہوئی جس کا مقصد حدود شہر میں ہر مظلوم کی

---

[1] "یعمل فی الاسلام بخصائل الجاہلیۃ" (مسند ابن حنبل ج ۲ ص ۴۲۵)

حاشیہ اگلے صفحہ پر

خواہ وہ شہری ہو یا کہ اجنبی ۔ مدد کرنا اور اس وقت تک چین نہ لینا تھا جب تک کہ ظالم حق رسانی نہ کرے[۵۱] نبوت کے ملنے کے بعد بھی آنحضرت اس جماعت کے کام میں فاعلانہ[۵۲] حصہ لیتے اور اس پر فخر کرتے تھے۔

تاریخ بتاتی ہے کہ اس "حلف الفضول" کی دہائی سے بڑے بڑے سرکش گھبراتے تھے۔ اور اس رضاکار جماعت نے جس نیک کام کا بیڑا اٹھایا تھا اسے وہ عہد بنی امیہ کی ابتدا تک انجام دیتی رہی۔ نئے ارکان کے بھرتی نہ کئے جانے کے باعث ابتدائی ارکان کے مرجانے پر یہ ادارہ آخر برخاست ہوگیا۔

یہ تو غیر معمولی اور خصوصی طریقہ تھا۔ معمولی اور عام طور سے انصاف رسانی اور فیصلہ یابی کے ملک میں تین مسلمہ طریقے تھے:

(۱) سب سے پہلے قبیلہ داری پنچ تھے۔ جب باہمی گفت و شنید

---

۵۱ سیرۃ ابن ہشام ص ۸۵ تا ۸۶، روض الانف للسہیلی ج ۱ ص ۹۰ تا ۹۴، طبقات ابن سعد ج ۱/۱ ص ۸۲۔ مسند احمد ابن حنبل ج ۱ ص ۱۹۰۔ نیز محمد بن حبیب کی کتاب المحبر اور کتاب المنمق، بر مواقع

۵۲ علاوہ اس قول کے (دیکھئے حوالہ بالا) کہ اگر مجھے اس کی دہائی دے کر بلایا جائے تو میں اب بھی مدد کو دوڑوں یہاں اراشی شخص کے واقعے کا حوالہ دیا جا سکتا ہے جس کا ابن ہشام میں صفحہ ۲۵۷ تا ۲۵۸ پر ذکر کیا گیا ہے۔

سے معاملہ طے نہ ہوتا تو مستغیث اور ملزم یا مدعی اور مدعا علیہ ان قبیلہ واری پنچوں کے سامنے حاضر ہوتے جن کا فیصلہ قطعی ہوتا۔ اور بہت سی صورتوں میں جرم کو اصطلاحی الفاظ میں "دفن" کر دیا جاتا اور پھر اسی بنیاد پر انتقام طلبی جائز نہ ہوتی[۵۱]

(۲) اگر اندرونی طور سے یوں فیصلہ نہ ہو سکتا اور خاص کر اگر کسی قبیلے کی الگ الگ شاخوں سے تعلق رکھنے والے افراد میں جھگڑا ہوتا تو کاہنوں سے رجوع کیا جاتا۔ "کاہن"[۵۲] عبرانی زبان میں اور یہودیوں کے ہاں عبادت گاہوں کے منتظم کو کہتے ہیں۔ ابتداؤً لوگ ان مذہبی پیشواؤں کی غیر جانبداری اور بے لاگ فیصلوں کی توقع میں ان سے رجوع کرتے ہوں گے۔ یہ عرب کاہن بھی یونانی مندروں کے پجاریوں کی طرح عموماً ذومعنی اور مسجع و مقفا عبارت میں اپنی رائے کا اظہار کرتے تھے۔ غالباً یہ صحیح نہیں کہ عرب کے کاہن سب کے سب یہودی رہے ہوں۔ بہرحال عرب میں کچھ لوگ غیب دانی کے مدعی پائے جاتے تھے۔ ان کو کاہن کہا جاتا تھا۔ مشکل مقدموں میں ان سے رجوع کیا جاتا اور پرانے قصوں کے مطابق بعض وقت وہ فریقین سے ایک لفظ بھی سننے بغیر صحیح صحیح فیصلہ گنگنانا شروع کر دیتے[۵۳] ان فیصلوں کی عدم تعمیل پر کسی قوت تنفیذیہ کے

---

۵۱ صبح الاعشی للقلقشندی ج ۱۲ ص ۳۵۲۔

۵۲ یہ ایک عبرانی لفظ کا معرب ہے۔

۵۳ مثلاً دیکھئے صبح الاعشی ج ۱ ص ۳۹۸ تا ۹۹۔

تدارک کی عدم موجودگی کے باوجود ان لوگوں کے توہمات ہی تہدید کا کام دیتے۔ انسائیکلوپیڈیا آف اسلام میں لفظ "کاہن" کے تحت لکھا ہے کہ "اپنی خانگی حیثیت میں کاہن خاص کر جھگڑوں اور ہر طرح کے قانونی مسائل میں فیصلہ کنندوں کا کام دیتے۔ غرض "کاہن" اور "حکم" کے تصورات باہم بہت قریبی تعلق رکھتے ہیں (الحطیہ نظم ۱۷ بیت ۶ "نیز الابشیہی مطبوعہ قاہرہ سنہ ۱۲۹۲ھ ج ۲ ص ۶۳) ان کے فیصلوں کو ایک طرح خدائی فیصلہ سمجھا جاتا جن کے خلاف کوئی مرافعہ نہ ہو سکتا"[۵۱] کہتے ہیں کہ لوگ رنگین لباس نہیں پہنا کرتے تھے۔ (الکاہن لایلبس المصبغ)[۵۲]

زمزم کا چشمہ دریافت کرنے کے بعد اس کی ملکیت کا تصفیہ کرانے کے لئے عبدالمطلب اور دیگر مکے والے ایک کاہن ہی کے پاس گئے تھے۔ عبدالمطلب نے اپنے ایک بیٹے کی قربانی کی منت مانی تھی۔ اس سے چھٹکارا پانے کی تدبیر معلوم کرنے کے لئے بھی ایک کاہنہ عورت ہی سے رجوع کیا گیا تھا۔ اس قسم کی نظیریں بکثرت عربوں کی تاریخ جاہلیت میں مل سکتی ہیں۔

---

[۵۱] انسائیکلوپیڈیا آف اسلام، تحت "کاہن" نیز سیرۃ ابن ہشام ص ۳۶؎ بیان جاحظ ۱/۱۱۳۔

[۵۲] اصل "تیاں کی فرانسیسی" تالیف " ممالک اسلامیہ کی "تاریخ نظام عدلیہ" جلد اول ص ۲۵۳ (غالباً بحوالہ جاحظ - حوالہ واضح نہیں ہے)

(۳) تیسرا اور شاید سب سے اہم ادارہ "تحکیم" کا تھا۔ عامر بن الظرب العدوانی کے پاس عربستان کی ہر جگہ سے تحکیم کے لئے مقدمے اس کی عمر بھر آتے تھے[51]۔ قبیلۂ تمیم کے سرداروں کا موروثی طور پر یہ عرب کا حکم ہوا کرنا عربیات کا سرطا نسب علم جانتا ہے (مثلاً فرزدق جلد ۲ ص ۱۲۷)۔ بازار عکاظ میں تو کثرت کار کے باعث دو سردار مقرر ہونے لگ گئے تھے جن میں سے ایک خالص عدالتی کام کے لئے مخصوص تھا (نقائض جریر و فرزدق ص ۴۳۸) یہ سردار سال میں ایک بار کسی بڑے میلے مثلاً عکاظ میں جاتے اور اس جگہ دیوانی اور فوجداری ہر قسم کے مقدمات کو سن کر فیصلہ کرتے۔ لوگ ان "عدالتوں" کے اجلاس کے انتظار میں رہتے اور دور دور سے آتے (نقائض جریر ص ۱۳۹) - علاوہ اور مسائل کے قرض کے مقدمات کی بھی یہاں نظیر ملتی ہے (کتاب الاغانی ۱۴/۱۳۲) یہاں جنگ جدال کا خوف اور تحکیم کے پس پشت پورے میلے کی اخلاقی قوت تھا یہ کام دیتی۔ ان موروثی حکاموں میں سے چند کا ذکر ابو عبیدہ وغیرہ نے کیا ہے[52] اور ابن قتیبہ نے لکھا ہے کہ

سلہ البدایۃ والنہایۃ لابن کثیر ج ۲ ص ۲۱۶ - سیرۃ ابن ہشام ص ۷۵ تا ۷۶
الاشتقاق لابن درید ص ۱۶۲: "تحاکموا الیہ حتی خرف وھو الذی قرعت
لہ العصا" نیز اغانی ۳/۸۹ (طبع جدید)

سلہ نقائض جریر و فرزدق ص ۱۰۵، ۱۳۹، ۲۸۴ وغیرہ - نیز کتاب الازمنۃ
والامکنۃ للمرزوقی ج ۲ ص ۲۶۳ تا ۲۶۴ - اشتقاق ابن درید ص ۱۴۲
(ہرم بن قطبہ کے متعلق کہ عامر بن الطفیل اور علقمہ بن علاثہ نے اسی سے رجوع کیا تھا)
(نوٹ ۲ ص ۱۵۱ پر)

غیلان بن سلمہ ثقفی کی عادت تھی کہ ایک دن اپنے ذاتی معاملات پر توجہ کرتا، ایک دن شعر شاعری کے علمی جلسوں میں حصہ لیتا اور ایک دن "حکم" بن کر جھگڑے چکاتا۔ قبیلہ واری حکم بھی ہوتے تھے۔ چنانچہ خود شہری حکومت مکہ کے دس اداروں میں سے ایک حکم کا بھی تھا۔ موقتی طور پر بھی کسی کو حکم بنایا جا سکتا تھا چنانچہ قصی اور قضاعہ کی جنگ میں بنی کنانہ کے ایک فرد شداخ کو حکم بنایا گیا تھا[۵۲] زمانہ جاہلیت کے ان حکموں میں ایک نے مقدمے کی سماعت اور فیصلے کی غرض سے اپنے لئے لکڑی کا ایک تخت انشستگاہ کے طور پر بنایا تھا جس پر سائبان یا چھتر کے طور پر لکڑی ہی کا ایک قبہ تھا۔ اسی لئے اس کو ذوالاعواد (لکڑیوں والا) کہنے لگے[۵۳] لیکن یہ خصوصی صورت ہے ورنہ عام طور پر یہ حکم کمبل اوڑھے، عمامہ باندھے اور شاید کسی درخت کے تنے سے ٹیکہ لگائے فیصلہ صادر کیا کرتے تھے[۵۴]

(بقیہ صفحہ ۱۵۶ کا) ۵۱ کتاب المعارف بر موقع۔ نیز مرزوقی حصہ ۲ صفحہ ۷۹ تا ۸۰

۵۲ عقد الفرید لابن عبدربہ ج ۳ ص ۲۲۵ تا ۲۲۶۔ نیز ابن حبیب کی کتاب المحبر کا باب "قریش کے حکم"

۵۳ ابن کثیر کتاب مذکور ج ۲ ص ۲۰۷۔ ابن ہشام صفحہ ۷۹ تا ۸۰۔ (نجران کے ایک عیسائی سردار کی عدالتی مرجعیت کے لئے اشتقاق ابن درید صفحہ ۲۱۸)

۵۴ ابن حبیب کی کتاب المحبر (مطبوعہ حیدرآباد) صفحہ ۱۳۴۔ نیز تاریخ یعقوبی جلد اول، حکام العرب۔

(بقیہ نوٹ ۵۴ صفحہ ۱۵۸ پر)

"منافرت، مفاخرت، میراث، چشموں کی ملکیت، خونی مقدمات" غرض ہر قسم کے مسائل میں ان حَکموں سے رجوع کیا جاتا تھا[۵۱] عرب میں بنو الدیان کا ایک قبیلہ ہی تھا۔ ان کے جدِ اعلیٰ کو بھی عدل گستری سے ضرور کوئی تعلق رہا ہوگا۔

یہ تو اس زمانے کا ذکر ہے جب عرب میں اسلام شروع ہونے کو تھا یہ نظام بھی کچھ ترقی یافتہ نہیں کہا جا سکتا لیکن خود اس حالت تک پہنچنے کے لئے بھی عرب میں کم و بیش وہی ارتقا عمل میں آیا ہوگا جو اور ملکوں میں۔ یعنی

(بقیہ ص ۱۵۷ کا) ۵۰ مزید تفصیلوں کے لئے دیکھئے Emil Tyan, Histoire de l'Organisation judiciaire en pays d'Islam, Paris, 1938, vol. 1, in loco.
درختِ تحکیم کے لئے نقائض جریر و فرزدق ص ۴۴۳۔ حکم کی ادنی پوشاک کے لئے بیان جاحظ (۳/۹۴) الحکم لایفارق الوبر)۔ "السید المعتم" اور "العمائم تیجان العرب" سے بھی استنباط کیا جا سکتا ہے۔

۵۱ تاریخ یعقوبی جلد (۱) ص ۲۹۹
خونی مقدمات کی مزید نظیروں کے لئے دیکھئے اشتقاق ابن درید ص ۲۶۶، معارف ابن قتیبہ ص ۵۹ اغانی ۳/۱۹۔
مالی معاملات کے نظائر کے لئے نویری کی نہایۃ الأرب ۳/۱۲۹ معارف ابن قتیبہ ص ۹۳، ۹۶ سیرۃ ابن ہشام ص ۴۴

(بقیہ ص ۱۵۹ پر)

فطری احساس مدافعت نے شروع میں خود انتقامی کی سجھائی ہوگی جس میں ملزم ورنہ اس کے قریبی رشتہ دار بیٹے بھائی وغیرہ سے بھی بدلہ لیا جاتا تھا۔ (اس سلسلے میں جنگ تغلب کی نظیر سے کون واقف نہیں) اس کے بعد اندرونِ قبیلہ جرم یا تعدی پر، داخلی امن قائم رکھنے، جھگڑا چکانے، ظالم کو سزا دینے اور مظلوم کی فریاد رسی کرنے کے لئے خود قبیلہ اپنے سرداروں یا انصاف کے لئے مقرر شدہ خصوصی افسروں کے ذریعے سے دخل دہی کرکے عدل گستری کرنے لگا ہوگا۔ یہ شروع میں "آنکھ کے بدلے آنکھ" سے کم نہ ہوتا ہوگا لیکن رفتہ رفتہ جب بعض صورتوں میں ضرر کی مالی یا رقمی قدر وقیمت کی

(الفقیہ ص۱۵۱کا) آبرو، مفاخرہ وغیرہ کے لئے نویری ۳/۳۴۲، اغانی ۴/۱۶۱، مستطرف ابشیہی ۲/۲۴، بیان جاحظ ۲/۱۱۔ نیز عبدالمطلب کی مفاخرت اور جیت کے لئے محمد بن حبیب کی کتاب المحبر ص۱۷۳ اور کتاب المنمق بہ موقع۔

ایسی بھی نظیریں ملتی ہیں کہ لوگوں نے حکم بنائے جانے سے انکار کیا ہو اور یکے بعد دیگرے متعدد لوگوں سے درخواست کے بعد بالآخر کسی نے قبول کیا ہو مثلاً اغانی ۵/۱۲، نقائض جریر ص۱۳۹، اشتقاق ابن درید ص۱۶۲

عورتیں بھی حکم بنتی رہی ہیں۔ عامر بن الظرب کی بیٹی "من حکیمات العرب" کہلاتی تھی۔ عورتیں کاہنہ بھی ہوتیں جیسا کہ اوپر مذکور ہوا۔

یہاں کے اکثر حوالوں کے لئے میں امیل تیاں کی مذکورہ فرانسیسی تالیف کا ممنون ہوں)۔

جانے لگی اور بالآخر متعین بھی ہوگئی تو ملزم کے سماجی درجے، عمر اور جنس کے لحاظ سے فرق بہرحال باقی اور جاری رہا ہوگا۔ چنانچہ اس کی نظیریں عام طور سے ملتی ہیں کہ کسی طاقتور قبیلے کے فرد کا خونبہا معمولی قبیلے کے فرد سے مثلاً دگنا ہوتا (ابن ہشام ص ۸۰۲ تا ص) یا آزاد فرد کا قاتل غلام ہوتا تو غلام سے قصاص لینا ناکافی سمجھا جاتا اور غلام کے مالک یا کسی اور آزاد رشتہ دار کا سر مانگا جاتا۔ یا کوئی آزاد کسی غلام کو قتل کرتا تو قاتل کا قصاص گوارا نہ کیا جاتا بلکہ کوئی کم تر معاوضہ دیا جاتا۔ یہی حال عورت کا بھی تھا۔ اور اسی قاعدے کو قرآن نے اسلامی دور میں منسوخ کیا۔

"الحر بالحر والعبد بالعبد والانثیٰ بالانثیٰ" (۲ : ۱۷۸)

آزاد کے بدلے آزاد، غلام کے بدلے غلام اور عورت کے بدلے عورت ہی قتل کیے جائیں (نہ کم نہ زیادہ)

یہ سب سزائیں تو اس وقت دی جاسکتی تھیں جب ملزم قبیلے کی دسترس میں ہوتا۔ اگر ملزم فرار ہوجاتا تو یہ محدود وسائل والے، خانہ بدوش، بعض صورتوں میں خاص کر بین القبائل جرم کے موقع پر، ملزم کو "طرد" یعنی جماعت سے باہر کر دیتے اور وہ اپنے قبیلے کی ہر قسم کی اخلاقی و مادی مدد سے محروم ہوکر اپنی حفاظت خود ہی تنہا کرنے پر مجبور ہو جاتا اور اکثر بے بسی و بے کسی سے غربت میں جان دیتا۔ ممکن ہوتا تو وہ دور دراز کے کسی اجنبی قبیلے میں جاکر پناہ گزیں ہوتا اور انہیں سے بھائی چارہ کر کے انہیں کا ایک فرد بن جاتا۔ ایسے لوگ دخیل، مولا

اور حلیف کے مختلف ناموں سے موسوم ہوتے اور یہ اس زمانے کا طریقۂ توطن Law and mode of domicile and naturalisation. تھا[لہ]

اب تک صرف تاریخی پس منظر پیش کیا گیا۔ اس کے بعد، جیسا کہ بیان ہوا، سنہ ٦١٠ء سے اسلام شروع ہوا۔ اس کے آغاز اور ترقی سے یہاں بحث نہیں۔ البتہ یہ ظاہر ہے کہ آنحضرت صلعم کی ذات ہجرت سے پہلے اور بعد، زندگی بھر، اپنے پیرؤوں کے لئے انتہائی عدالت کا کام دیتی رہی۔ لیکن ایک واقعی مملکت کی بنیاد ہجرت کے بعد ہی پڑی۔ ہجرت کرکے مدینہ آتے ہی آنحضرت نے فوراً اپنے عدالتی حقوق و فرائض کا تعین فرما دیا تھا[۹۲] اور ہماری خوش قسمتی

لہ یاد رہے کہ دخیل، مولا اور حلیف افراد کا یہ طبقہ (جسے دیگر اصلی افرادِ قبیلہ سے عام حقوق کچھ کم حاصل ہوتے مثلاً وہ کسی اجنبی کو اپنی پناہ میں نہ دے سکتا جیسا کہ ابن ہشام نے سیرۃ رسول اللہ کے ص۲۵۱ پر بیان کیا ہے) صرف ان فرار شدہ پناہ گزینوں ہی پر مشتمل نہ تھا بلکہ اس میں آزاد شدہ غلام، غیر قبائل بلکہ غیر عرب کے عام افراد بھی باہمی رضامندی سے شریک ہوتے تھے۔ اور یہ رواج اسلام نے بھی بہت کچھ باقی رکھا اور غیر کو عرب بنانے میں اس سے عرب مسلمانوں نے بڑی مدد لی۔

۹۲ ابن ہشام ص ۳۴۱ تا ۳۴۴۔ کتاب الاموال لابی عبید فقرہ ۵۱۸، ص ۲۰۲ تا ۲۰۵۔ ابن کثیر ج ۳ ص ۲۲۴ تا ۲۲۶۔ نیز ابن سید الناس وغیرہ۔

ہے یہ دلچسپ اور اہم دستاویز بجنسہ و بلفظہ ہم تک نقل ہوتی آئی ہے[۵۸]
اسے سب سے پہلی اسلامی مملکت کا دستور اور آئین کہا جا سکتا ہے۔
(دیکھئے اوپر، باب متعلقہ "دنیا کا سب سے پہلا تحریری دستور")

اس تاریخی دستاویز کے دو حصے ہیں۔ فقرہ ۱ تا ۲۳ میں مہاجرین اور انصار کی عدالتوں کا ذکر ہے اور فقرہ ۲۴ تا ۴۷ میں ان قواعد کا ذکر ہے جو مضافات مدینہ میں بسنے والے حلیف یہودی قبائل اور بستیوں سے متعلق تھے۔ ان ہر دو حصوں کے عدالتی فقرات کی تحلیل یہاں بے محل نہ ہوگی:-

حسب سابق ہر قبیلۂ انصار اپنے افراد کے مواخذہ جات کا اجتماعی طور سے ذمہ دار ہوگا۔ اگر کوئی فرد دشمن کے ہاتھوں گرفتار ہو تو اس قیدی کے قبیلے کے سب افراد مل کر فدیہ ادا کریں گے (ف ۴ تا ۱۱)
اس سلسلے میں انصار کے قبائل تو معین تھے لیکن مہاجرین مکہ

---

۵۸ البن، روسو وغیرہ کے "معاہدۂ عمرانی" میں بادشاہت اور مملکت کا آغاز بیعت کے ذریعے سے ہوا ہونا قیاس کیا گیا ہے۔ بیعت عقبہ اور زیر ذکر معاہدے کی روشنی میں کہا جا سکتا ہے کہ چاہے اور بستیوں میں بھی یہی طریقہ رہا ہو یا نہ ہو، اسلام میں واقعی یہی ہوا۔ کوئی تعجب نہیں جو ان اہل یورپ کے قیاس کا ماخذ یہی اسلامی بیعتیں رہی ہوں۔

سب مل کر ایک قبیلہ تصور کیے جائیں گے۔ (ف ۱۲)
انصاف رسانی منفرد کے ہاتھ میں نہیں رہیگی بلکہ وہ پوری جماعت مسلمانان کا فریضہ سمجھی جائے گی اور اس میں کسی رشتہ داری اور قرابت کے باعث پاس و لحاظ نہیں کیا جائے گا (ف ۱۳) اور کسی قاتل یا مجرم کو کوئی شخص پناہ نہیں دے سکے گا (ف ۲۲)
کسی مسلمان کا قتلِ عمد سزائے موت کا مستوجب ہوگا البتہ مقتول کے ولی مسلمان ہوں تو انھیں چاہیئے[1] کہ قاتل کے مسلمان ہونے کی صورت میں قصاص کا مطالبہ نہ کریں (ف ۱۴)
ہر قسم کے جھگڑے کے لئے آنحضرت کا فیصلہ قطعی اور آخری ہوگا[2] (ف ۲۴)
اسی طرح یہودیوں سے جو دفعات متعلق ہیں ان میں بیان کیا گیا ہے کہ:-

---

[1] ملاحظہ ہو یہ کہا گیا کہ "انھیں چاہیئے کہ مطالبہ نہ کریں" اور یہ نہیں کہا گیا کہ "وہ مطالبہ نہیں کر سکتے" اس پر طویل اور اہم بحث کہ غیر مسلم ذمی کے قصاص میں مسلمان کو قتل کیا جا سکتا ہے اور خود فعل نبوی بھی ابن رشد کی بدایۃ المجتہد میں "کتاب القصاص" میں مذکور ہے۔ حنفی مذہب بھی یہی ہے اور مذکورہ ممانعت حربیوں سے متعلق کی جاتی ہے۔

[2] اس کے ساتھ ملاحظہ ہو قرآن مجید (۳۳ : ۳۶) "وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَلَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ اَمْرًا اَنْ یَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِیَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ

(بقیہ صفحہ ۱۶۴)

فدیہ، دیت، ولاء اور جوار کے ادارے حسب سابق برقرار رہیں گے (ف ۲۵، ۳۱، ۳۵، ۴۰) مگر کوئی شخص قریش اور ان کے مددگاروں کو اپنے جوار یعنی پناہ میں لینے کا مجاز نہ ہوگا (ف ۴۳)۔

عدل گستری ایک مفاد عامہ کا معاملہ ہے اور کوئی شخص خود اپنے رشتہ داروں کی بھی پاسداری نہ کر سکے گا (ف ۲۶ ب ۳۱)

آنحضرت ہر قسم کے جھگڑوں میں آخری فیصلہ کریں گے (ف ۴۲)

دیگر جزئی تفصیلوں کو یہاں نظر انداز کیا جا سکتا ہے۹ل گو اس عظیم الشان

(بقیہ صفحہ ۱۶۳) وَمَن یَعصِ اللّٰہَ وَرَسُولَہٗ فَقَد ضَلَّ ضَلٰلاً مُّبِینًا (یہ سورۂ احزاب کی آیت ہے جو مدنی ہے)۔ قبیلہ واری افراتفری کی جگہ مرکزیت پیدا کرنے کے لئے علاوہ ایک خاص شخص کو ہمہ گیر حکمران تسلیم کرنے کے مرکزی حکومت کو زکات (جائدادی ٹکس) دینا اور مرکزی حکومت کی جبری فوجی خدمت (بذریعہ جہاد) اور مرکزی حکومت کے تمام قوانین کی تعمیل تین اہم اصول اختیار کیے گئے تھے۔ نتیجے کی کامیابی کسی تذکرے کی محتاج نہیں۔

۹ل اس دستاویز کی غیر معمولی اہمیت کے باعث متعدد مولفوں نے اس سے خصوصی بحث کی ہے جس کی تفصیل اوپر متعلقہ باب میں دی جا چکی ہے اس لئے یہاں حذف کی جاتی ہے۔

اور انقلابی اصلاح کی جانب خصوصی دوبارہ اشارہ کرنا بے محل نہ ہوگا کہ انفرادی انتقام جوئی کی جگہ مرکزی عدل گستری کا ادارہ وجود میں آگیا اور یہ اختیار افراد ہی نہیں قبائل سے بھی چھین کر حکمران وقت کے سپرد کیا گیا جو تفتیش اور غیر جانبداری کا پابند تھا۔

اس موقع پر یہ بیان کرنا بے محل نہ ہوگا کہ کم از کم اہل کتاب غیر مسلموں کے مقدموں میں آنحضرت صلعم ان کے شخصی قانون ہی کے مطابق فیصلہ فرماتے تھے۔ چنانچہ یہودیوں کے دو مقدموں کا اکثر مورخوں نے ذکر کیا ہے جن میں توریت پر عمل کرایا گیا[۱۹]۔ قرآن مجید میں اس مسئلے سے کافی طویل بحث کی گئی ہے اور حکم دیا گیا ہے کہ یہودی توریت پر

---

[۱۹] پہلے مقدمے کے لئے دیکھئے بخاری ۱/۲۷۱ - ۵۱۱۹۵ - ابن ہشام ص ۳۹۳ تا ۹۵ - ابوداؤد ج ۲ ص ۱۵۲ - التنبیہ للمسعودی ص ۲۴۷ - دوسرے مقدمے کے لئے تفسیر طبری ج ۶، ص ۴۴ تا ۵۰ - نیز بخاری، مسلم، ابوداؤد، ابن ماجہ، نسائی، دارمی، احمد بن حنبل وغیرہ جن کے صفحوں کے حوالے ونسنک کی مفتاح کنوز السنہ میں لفظ قصاص کے تحت مل جائیں گے۔ (بقیہ صفحہ ۱۶۶ پر)

عمل کریں تو نصرانی انجیل پر اور مسلمان قرآن پر اور یہ کہ خدا ہی نے ہر ایک کو الگ الگ شریعتیں دی ہیں ورنہ اگر وہ چاہتا تو سب کو ایک ہی "امت" بنا دیتا۔[۹۵]
آنحضرت کا یہ طرز عمل بعد میں مستقل قانون بن گیا کہ غیر مسلم رعایا اور مستامنوں سے ان کا شخصی قانون ہی متعلق ہو اور اس غرض کے لئے خصوصی عدالتیں بنائی جائیں۔ چنانچہ خلافت راشدہ میں اس چیز نے خاصی ترقی کر لی تھی اور ان کی عدالتوں کے حکام بھی ہم ملت ہی مقرر ہوتے تھے۔ ممکن ہے اس میں یہ مصلحت

(بقیہ نوٹ ص۱۶۵) اول الذکر مقدمے میں مسلمان مولفوں نے اس الزام کو دہرایا ہے کہ یہودیوں نے توریت کی تحریف کی ہے۔ اور لکھا ہے کہ زنا پر رجم کی سزا کا حکم یہودیوں نے چھپا دیا تھا۔ اس کا ثبوت اب دیگر ذرائع سے بھی ملتا ہے۔ چنانچہ ایک یہودی مستشرقیاتی پروفیسر(تارے کی تالیف جوش فاونڈیشن آف اسلام) ہی نے یہ ناقابل تردید ثبوت ڈھونڈ نکالا ہے کہ ایک زانیہ کے گرفتار ہو کر آنے پر حواریوں نے حضرت عیسی سے پوچھا توریت میں تو اس کی سزا رجم ہے اب آپ کیا حکم دیتے ہیں (دیکھئے انجیل یوحنا ۵/۸) توریت کے موجودہ اڈیشن اس حکم رجم سے یکسر خالی ہیں۔
نجران کے عیسائیوں سے آنحضرت نے جو معاہدہ کیا تھا (اور جس کا متن ابن سعد وغیرہ میں ہے) اس میں بھی ان کی داخلی عدالتی خود مختاری برقرار رکھی گئی تھی۔

۹۵ قرآن مجید ۵: ۴۲ تا ۵۰

بھی پوشیدہ ہو کہ سخت ترشخصی قانون والی "ملتیں" ہمسایہ و ہم شہری مسلمانوں کی "الحنیفیۃ السمحاد" کی سہولتوں کو دیکھ دیکھ کر اپنے سکون کے لمحوں میں اس کو قبول کرنے کی خاموش ترغیبیں پاتے رہیں۔ بہر حال ایک ابتدائی اور فوری اور بہت اہم فائدہ اسلامی مملکت کو اس سے یہ پہنچا کہ جدید مفتوحہ علاقے میں اقلیتوں کی ـــــ جن پر وہاں کی سابق حکومت سخت مظالم توڑا کرتی تھی ـــــ پرخلوص "تائید حاصل ہو گئی جس سے اس کو اپنی تازہ فتح کے مستحکم اور مکمل کرنے میں کافی مدد ملی۔ چنانچہ مشہور پادری کار الفسکی لکھتا ہے :-

"علاوہ یہودیوں کے جن پر بہت سخت مظالم ہو رہے تھے ...... یعقوبی عیسائیوں نے بھی عربوں کو اپنے نجات دہندوں کی حیثیت سے ہاتھوں ہاتھ لیا ..... مسلمانوں کی سب سے اہم جدت جس کا یعقوبی عیسائیوں نے دلی خوشی سے استقبال کیا، یہ تھی کہ ہر مذہب کے پیروؤں کو ایک خود مختار وحدت قرار دیا جائے اور اسی مذہب کے روحانی سرداروں کو ایک بڑی تعداد میں دنیاوی اور عدالتی اقتدارات عطا کئے جائیں[۱]"

---

[۱] کار الفسکی کا مضمون فرانسیسی انسائیکلوپیڈیا "قاموس تاریخ و جغرافیۂ کلیسا" عنوان انطالیہ، عمود ۵۹۲، ۵۹۴۔

ایک اور غیر مسلم شہادت جو ہمعصر ہونے کے باعث خاص اہمیت رکھتی ہے، قابل ذکر ہے۔ چنانچہ شام کی فتح کے صرف پندرہ سال بعد حضرت عمر کے زمانے میں ایک نسطوری پادری نے ایک دوست کے نام جو خط لکھا تھا وہ موجود ہے اور اس میں لکھا ہے :-

"یہ طائی (یعنی عرب) جن کو خدا نے آج کل حکومت عطا کی ہے ہمارے بھی مالک بن گئے ہیں، لیکن وہ عیسائی مذہب سے مطلق برسرِ پیکار نہیں۔ اس کے برخلاف وہ ہمارے دین کی حفاظت کرتے ہیں، ہمارے پادریوں اور قدیسوں کا احترام کرتے ہیں اور ہمارے گرجوں اور کلیساؤں کو جاگیریں عطا کرتے ہیں سلہ"

یہ یاد رہے کہ کم از کم انصار کے قبائل کی حد تک آنحضرت صلعم نے ہجرت سے پہلے ہی بیعت عقبہ میں ہر ایک کا ایک ایک نقیب مقرر کر دیا تھا جو اپنے قبیلے کی نمائندگی کرتا اور اندرونی نظام اور باقاعدگی کا ذمہ دار تھا۔ اگر کسی معاملے میں نقیب کا فیصلہ تشفی کا سامان نہ کرتا تو معاملہ آنحضرت کے پاس آتا۔ نقیب کے تحت ہر دس آدمیوں کا ایک افسر

سلہ Assemani Bibl. Orient., III, 2, p. XCVI.

نیز دخویہ کی فرانسیسی "یادداشت فتوح الشام" ص ١٦

ہوتا تھا جسے عریف[۵۱] کہتے تھے۔ اس نظام سے وقت ضرورت استصواب عامہ (PLEBISCITE) میں بھی مدد لی جاتی تھی[۵۲]

مدینے کی حد تک آنحضرت پورا عدالتی کام خود انجام دیتے تھے۔ لیکن جب اسلامی عملداری میں وسعت ہوکر انتظامی کام بڑھ گیا تو مدینے میں آنحضرت نے چند مفتی (یعنی قاضی)[۵۳] مقرر فرما دیے تھے[۵۴] جن کے فیصلوں کے خلاف آنحضرت کے پاس مرافعہ بھی ہوتا تھا[۵۵]۔ مدینے میں مستقل قاضیوں کے علاوہ کسی خاص شخص کو کسی خاص مقدمے کی سماعت کے لئے موقتی قاضی[۵۶] بنایا جایا کرنے کی بھی عہد نبوی میں متعدد نظیریں ملتی ہیں

---

۵۱ یہ رومانی ڈے کو ریون سے مشابہ معلوم ہوتا ہے۔ اور نقیب سنٹوریون کے مماثل کہا جا سکتا ہے۔ عہد نبوی میں دس کا افسر عریف کہلاتا تھا۔ تاریخ طبری ص۱۷۲۲۔

۵۲ سیرت نبوی کی کسی کتاب میں جنگ ہوازن کے قیدیوں کی رہائی کا واقعہ ملاحظہ ہو۔ اس وقت نقیبوں اور عریفوں سے مدد لی گئی تھی

۵۳ قد کان القاضی فی الصدر الاول یسمی مفتیا (المبسوط للسرخسی ج ۱۶ ص ۱۰۹)

۵۴ التراتیب الاداریہ للکتانی ج ۱ ص ۲۵ بحوالہ ابن الجوزی

۵۵ ایضاً بحوالہ موطا

۵۶ مثلاً مبسوط سرخسی جلد ۱۶ ص ۶۸ میں ہے کہ "ایک مرتبہ آنحضرت نے (بقیہ ص ۱۷۰ پر)

نیز ان کے آنحضرت کے پاس مرافعوں کی بھی[۹۱]۔ یہ تو ظاہر ہی ہے کہ دارالحکومت کے باہر صوبوں اور ضلعوں میں بھی علیحدہ عدالتی افسروں کی ضرورت تھی۔ اور معلوم ہوتا ہے کہ صوبہ دار عامل (گورنر) بھی بہ یک وقت سپہ سالار اور افسر مال (تحصیلدار) اور قاضی و محتسب (نگرانِ اخلاق و مال تجارت وغیرہ) ہوتے تھے۔ ان کی کارروائیوں اور فیصلوں کے خلاف بھی آنحضرت کے پاس مرافعے آیا کرتے تھے[۹۲]۔ ان قاضیوں کو مستقر کی جانب روانگی کے وقت جو ہدایتیں دی جاتی تھیں ان میں سے چند کو تاریخ نے محفوظ رکھا ہے۔ حضرت معاذ بن جبل عہد نبوی کے عدالتی حلقے میں جو نمایاں حیثیت رکھتے ہیں وہ محتاج بیان نہیں۔ ان کے حالات سے عام کیفیت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ ابن عبدالبر نے لکھا ہے:-

"معاذ بن جبل ... ولاہ رسول اللہ صلعم قاضیا الی الجند" — معاذ بن جبل ... کو آنحضرت نے قاضی بنا کر جند (جو یمن میں ہے)

(بقیہ نوٹ صفحہ ۱۶۹) حضرت عمرو بن العاص سے فرمایا کہ ان دونوں کا قضیہ چکا دو۔ کہا کہ کیا آپ کی موجودگی میں میں فیصلہ کروں؟ فرمایا کہ ہاں۔ تو کہا کہ کس صورت پر؟ فرمایا کہ اس طور پر کہ اگر اجتہاد کرو اور صحیح چیز پہنچو تو دس نیکیوں کا ثواب ہوگا اور اگر خطا کر جاؤ تو ایک نیکی شمار ہوگی۔"

۹۱ مسند احمد بن حنبل ج ۲ ص ۱۸۷ - ج ۴ ص ۲۰۵ - ج ۵ ص ۲۶ -

۹۲ مثلاً الاستیعاب نمبر ۱۴۵۵

یعلم الناس القرآن و شرائع	بھیجا تاکہ لوگوں کو قرآن اور احکام
الاسلام و یقضی بینھم و	اسلام سکھائیں اور ان کے مقدمو
جعل الیہ قبض الصدقات	کا فیصلہ کریں اور یمن کے تحصیلداروں
من العمال الذین بالیمن ؎۵۹	سے جمع شدہ محاصل سرکاری
	اپنی تحویل میں لیں ۔

جب معاذ بن جبل یمن روانہ ہونے لگے تو آنحضرت نے آخری باریابی کے موقع پر ان سے جو گفتگو فرمائی وہ بھی اسلامی عدل گستری اور قانونیات کی تاریخ میں بڑی اہمیت رکھتی ہے ۔

ان رسول اللہ صلعم بعث	آنحضرت نے معاذ کو یمن بھیجا تو
معاذا الی الیمن فقال کیف	پوچھا کس طرح فیصلے کروگے ؟
تقضی ؟ قال بما فی کتاب	کہا اسی کے مطابق جو اللہ کی
اللہ ۔ قال فان لم یکن فی	کتاب (قرآن) میں ہو ۔ فرمایا
کتاب اللہ ؟ قال فبسنۃ	اگر کتاب اللہ میں نہ ہو ؟ کہا تو
رسول اللہ ۔ قال فان لم یکن	رسول اللہ کی سنت کے موافق ۔
فی سنۃ رسول اللہ ؟ قال	فرمایا اگر رسول اللہ کی سنت
اجتھد برائی ۔ قال الحمد للہ	میں نہ ملے ؟ کہا تو میں اپنی رائے
الذی وفق رسول رسول	سے اجتہاد کروں گا ۔ فرمایا خدا

؎۵۹ مثلاً الاستیعاب نمبر ۱۰۰۱

الله لما یحب رسول الله ![٩١] کا شکر ہے جس نے اپنے رسول
کے فرستادے کو ایسی بات کی
توفیق دی جس سے اللہ کا رسول
راضی ہے "

قاضیوں کو یہ بات اچھی طرح سمجھا دی جاتی تھی کہ دی ہوئی ہدایتوں کے خلاف وہ جو کام کریں گے وہ کالعدم سمجھا جائے گا۔[٩٢]

جب عمرو بن حزم یمن کے گورنر بنا کر بھیجے گئے تھے تو ان کو آنحضرت نے ایک تحریری ہدایت نامہ دیا تھا۔ یہ اسلامی تاریخ انتظام مملکت میں ہمیشہ یادگار رہے گا۔ اس طویل اور ہمہ گیر دستاویز میں انہیں انصاف رسانی اور بے لاگ عدل کا حکم دیا گیا ہے اور ظلم و ستم سے باز رہنے کی تاکید کی گئی ہے۔[٩٣] عمرو بن حزم کے لئے لکھے ہوئے ہدایت نامے میں تفصیل سے یہ بھی بتایا گیا ہے کہ جسمانی ضرر رسانی کی کس کس صورت میں متضرر کو کیا ہرجہ دلایا جائے گا۔[٩٤]

---

٩١ ترمذی ١٣ : ٣ - ابوداؤد کتاب الاقضیہ ٢٣ : ١١ - اعلام الموقعین لابن القیم جلد ١ ص ٢٠٢ - طبقات ابن سعد ج ٢ / ٢ ص ١٠٧ تا ١٠٨ -

٩٢ "من عمل عملا لیس علیہ امرنا فھورد" (مسلم ٣٠ : ١٧ تا ١٨) من استعملناہ علی عمل فلیأت بقلیلہ وکثیرہ فما اوتی منہ اخذ وما نہی عنہ انتہی"
(ابوداؤد ٢٣ : ٥)

٩٣ متن کے لئے دیکھئے ابن ہشام ص ٩٦١ تا ٩٦٢ طبری ص ١٧٢٧ تا ١٧٢٩ -

٩٤ موطا باب العقول - نیز سنن نسائی بر موقع -

اس قسم کا ایک قانون آنحضرت کے حکم سے حضرت ابوشاہ کو بھی لکھ کر دیا گیا تھا[۵۱]
بدلے اور انتقام کا تصور حمورابی کے زمانے میں یہ تھا کہ کسی کی بیٹی یا
بیٹے کے قتل پر قاتل کی بھی بیٹی یا بیٹے کو قتل کیا جائے اور اصل قاتل
محفوظ رہے[۵۲]۔ قانون حمورابی کے بعد اس کے قانون قصاص اعضا کا کچھ
حصہ[۵۳] قانون حضرت موسیٰ (توریت) میں بھی ملتا ہے جس میں آنکھ کے عوض
آنکھ اور کان کے عوض کان کا طریقہ قائم کیا گیا تھا[۵۴]۔ مگر یہ عہد اسلام کی،
آنحضرت صلعم کے زمانے کی ترقی ہے کہ عمد، مشابہ عمد اور خطا میں فرق کیا
جانے لگا[۵۵]۔ اور نیت سب سے پہلے دیکھی جانے لگی[۵۶]۔ اس کے علاوہ

---

۵۱ بخاری باب کتاب العلم

۵۲ قانون حمورابی دفعات ۱۱۶، ۲۱۰، ۲۳۰ (یہ بابل کا بادشاہ تھا اس کا قانون
ایک کتبے پر ملا ہے۔)

۵۳ ایضاً دفعات ۱۹۶، ۱۹۷، ۲۰۰۔

۵۴ تائید کے لئے قرآن مجید ۵: ۴۵ نیز C. Edwards, Hammurabi
Code, p. IX, 111-143

Stanley A. Cook, The Moses and the Code of
Hammurapi, in loco (reviewed in, OLZ, Berlin
1904, by J. Kohler.)

۵۵ خطبہ حجۃ الوداع میں بھی اس کا ذکر ہے۔

۵۶ حدیث:- انما الاعمال بالنیات، صحاح ستہ میں

بہت سی صورتوں میں ضمان یعنی تارٹ مقرر کر دیا گیا اور ہر جے کا معاوضہ بجائے مساوی انتقام کے رقمی یا مادی صورت میں دلایا جانے لگا[۵۱] - اور سخت قانونی انصاف کی جگہ استحسان یا نصفت کو عدالتیں روا رکھنے لگیں[۵۲] مطلب یہ ہے کہ انصاف کے ساتھ رحم کو بالکل نظر انداز نہیں کر دیا جا سکتا - اور حالات و واقعات کے لحاظ سے بر موقع مناسب رعایت بھی کی جا سکتی ہے - اور ذمہ داری کو "شخصی" قرار دیا گیا ، نیابتی نہیں کہ ایک کا بار دوسرے پر لاد دیا جائے[۵۳] اس طرح شبہے کا فائدہ ملزم کو دینا اور غلطی سے سزا دینے کی جگہ غلطی سے رہا کرنا اصول قرار دیا گیا[۵۴]

ایک نئی "جدت" یہ کی گئی کہ انسانوں کے سوا باقی سب مخلوقات

---

۵۱ موطا وغیرہ میں باب العقول ملاحظہ ہو -

۵۲ ان اللہ یامر بالعدل والاحسان (قرآن مجید ۵ - ۴۵) نیز استحسان و استصلاح کا ذکر اصول فقہ کی کس کتاب میں -

۵۳ قرآن مجید (لا تزر وازرۃ وزر اخری) ۶ : ۱۶۴ ، ۱۷ : ۱۵ ، ۳۵ : ۱۸ ، ۳۹ : ۷ ، ۵۳ : ۳۸ -

۵۴ حدیث "ادرؤا الحدود بالشبہات" (بدایۃ المجتہد لابن رشد "کتاب القصاص") نیز "ادرؤا الحدود عن المسلمین ما استطعتم فان کان لہ مخرج فخلوا سبیلہ فان الامام ان یخطئ فی العفو خیر من ان یخطئ فی العقوبۃ" (ترمذی ۱/۵) -

کو ذمہ داری سے بری کر دیا گیا ورنہ اب تک عرب میں کوئی گڑھا اور کوئی جانور بھی کسی آدمی کے ضرر اور ہلاکت کا باعث ہوتا تو ذمہ داری سے بری نہ ہوتا۔[51] چنانچہ امام ابو یوسف نے بیان کیا ہے کہ :-

كان اهل الجاهلية اذا	زمانہ جاہلیت میں اگر کوئی گڑھے
عطب الرجل في القليب	میں گر کر مر جاتا تو وہ گڑھا اس کا
جعلوا القليب عقله واذا	خون بہا قرار دیا جاتا (اور ہلاک
قتلته دابة جعلوها عقله و	شدہ شخص کے وارثوں کی ملک
اذا قتله معدن جعلوه عقله	قرار پاتا) اگر کوئی جانور کسی کو قتل
فسأل سائل رسول الله صلعم	کرتا تو وہی اس کا خون بہا قرار
فقال العجماء جبار والمعدن	دیا جاتا۔ اور اگر کوئی کسی کان
جبار والبئر جبار[52]	میں ہلاک ہوتا تو وہ کان اس کا

---

۵۱ انگلستان میں ابھی گذشتہ انیسویں صدی کے وسط تک کسی گاڑی یا کسی درخت اور کسی دوسرے غیر جاندار "قاتل" کو بھی قانوناً سزائے قتل دی جاتی تھی دیکھئے - ہاب ہاؤز کی انگریزی "اخلاق ارتقا کی حالت میں" باب "قانون و انصاف" - اس طرح جاہلیت عرب ہی کا زیادہ معقولیت پسند رہا ہونا معلوم ہوتا ہے۔

۵۲ کتاب الخراج ص ۱۳۔

خوں بہا قرار دی جاتی۔ کسی
نے اس بارے میں آنحضرت
سے پوچھا تو آپ نے فرمایا کہ
بے زبان جانور اور کان اور
کوئیں کی ضرر رسانی سے کوئی
ذمہ داری نہیں پیدا ہوتی۔

ابھی بیان ہوا کہ مختلف صوبوں پر جو عامل اور قاضی بھیجے جاتے تھے انہیں خاص احکام اور ہدایتیں دی جاتی تھیں۔ مرکزِ حکومتِ مدینہ میں عدالت ابتدائی ہر قبیلے کے عریف اور نقیب ہوتے یا مفتی اور قاضی۔ عدالت مرافعہ اور عدالت انتہائی خود جناب رسالت مآب کی ذات تھی۔ "مرافعہ" اور "استصواب" آنحضرت کے پاس بعض وقت اضلاع اور صوبہ جات سے بھی ہوتا۔[1] "تصحیح" کی بھی متعدد نظیریں تاریخ نے اس عہد کے متعلق محفوظ کی ہیں اور جب کبھی آنحضرت صلعم کو کسی افسر کے غلط فیصلے یا طرز عمل کا پتہ چلتا تو آپ (بصیغۂ تصحیح) دخل دیتے فرما کر تلافی اور تدارک فرماتے۔ حضرت خالد بن الولید اور واقعہ بنی جذیمہ اس کی ایک انتہائی مثال ہے۔ تصحیح اور اور مرافعے کا نظام حضرت عمر کے زمانے میں ایک بہت ہی ترقی یافتہ ادارہ بن گیا تھا اور انھوں نے حج کے موقع کو ایک عدالتی اور انتظامی تنقیح کا مقام بھی قرار دے دیا تھا۔ چنانچہ جملہ صوبہ دار اور حکام عدالت اس وقت مکہ معظمہ آتے اور حضرت عمر ان کے خلاف دعوے اور مقدمے، خود سنتے

[1] (بقیہ صفحہ ۲۵۱ کے حاشیہ پر)

اور حق رسانی کرتے ۔ اگر سرکاری افسروں سے کوئی لغزش ہوئی ہوتی تو بڑی سختی سے دارو گیر کرتے ۔

جیسا کہ ایک حدیث میں بیان کیا گیا ہے ، ثبوت مانگے بغیر اگر ہر دعوے کو صحیح مان لیا جایا کرے تو لوگوں کی جان و مال محفوظ نہ رہیں[۵۱] اسی لئے امور تنقیح طلب اور شہادت پیش شدہ کی جانچ[۵۲] کے لئے آنحضرت صلعم کے بہت سے اصولی اور ذیلی احکام حدیث میں ملتے ہیں ۔ ان میں سے چند کا یہاں ذکر کیا جاتا ہے ۔

انصاف رسانی کے لئے قاضی کو چاہیئے کہ صرف روداد پر فیصلہ کرے اور اپنے خانگی معلومات کو دخل نہ دے[۵۳] ایسا حکم نہ ہوتا تو ظاہر ہے کہ قاضیوں کو بد دیانتی کی ہمیشہ زبردست ترغیب ہوتی رہتی ۔ ناحق فریق کی جادو بیانی کے سلسلے میں ایک دلچسپ حدیث قابل ذکر ہے ،

---

۵۱ مسند ابن حنبل ج ۱ ص ۳۴۳ ، ۳۶۳

۵۲ ورنہ قدیم عرب میں ملزم کا کھوج لگانے کے لئے "روحانی" قوتوں سے مدد لی جاتی اور فال ، قرعہ ، جادو ، ٹوٹکے ، دیو بانی ، ہاتفی ، جیسے غیر یقینی ذرائع برت میں آتے یا غیب دانی کے مدعی عراف ، کاہنوں وغیرہ کی من گھڑت باتوں پر عمل کیا جاتا ۔

۵۳ اس مسئلے پر ایک مختصر بحث اور حضرت ابوبکر و عمر کے اقوال و اعمال کے لئے دیکھئے الطرق الحکمیہ لابن القیم ص ۴۸ تا ۷۶ ۔

جو صحاح ستہ[۵] میں آنحضرت سے مروی ہے :-

"انما انا بشر و انکم تختصمون الی ولعل بعضکم ان یکون الحن بحجتہ من بعض فاقضی لہ نحو ما اسمع منہ فمن قضیت لہ بشئ من حق اخیہ فلا یاخذ منہ شیا فانما اقطع لہ قطعۃ من النار"۔

"بے شبہ میں صرف ایک انسان ہوں - تم میرے پاس جھگڑتے آتے ہو اور یہ ممکن ہے کہ کوئی شخص دلیل بہ نسبت دوسرے کے زیادہ چرب زبانی کے ساتھ پیش کرے اور میں جو کچھ سنوں اسی کے مطابق فیصلہ صادر کروں۔ اگر کسی کو میرے (اس طرح کے) فیصلے سے (ناحق) کچھ ملے تو وہ اس سے استفادہ نہ کرے کیونکہ میں جو کچھ دیتا ہوں وہ آگ کے ایک ٹکڑے کے سوا کچھ نہیں"

جس سماج میں پیشہ ور وکیل اور اڈووکیٹ نہ ہوں اور جو قانونی حق سے

---

[۵] بخاری مسلم ۳۰ ۱۴ تا ۶ - ترمذی ۱۴ : ۱۱ - ابو داؤد ۲۳ ۲۴ : ۷ - ابن ماجہ ۱۳ : ۵ نسائی ۴۹ : ۱۳ ، ۳۳ - ابن حنبل ج ۶ ص ۲۹۰ تا ۹۱ - نیز اقضیہ رسول اللہ للقرطبی ص ۸۲ - ابن القیم ، الطرق الحکمیہ ص ۲۶۶ -

زیادہ قدرتی حق پر زور دیتا ہوا اس کے قاضیوں کے لئے حضرت علی کو دی ہوئی اس ہدایت نبوی سے بہتر اور کیا ہدایت دی جاسکتی ہے کہ :-

اذا جلس بین یدیک الخصمان	جب تیرے پاس دو جھگڑنے
فلا تقض بینہم حتی تسمع من	والے آئیں تو تو اس وقت تک
الآخر کما سمعت من الاول	ان کا فیصلہ صادر نہ کر جب
فانہ احری ان یتبین لک	تک کہ تو پہلے اور دوسرے
القضاء - قال فما زلت	دونوں کا بیان نہ سن لے -
قاضیا وما شککت فی قضاء	تجھے اس طرح صحیح فیصلے کا سجھائی
بعدہ[95]	دینا زیادہ ممکن ہے - (حضرت
	علی فرماتے ہیں) اس کے بعد
	سے میں ہمیشہ فیصلے کرتا رہا ہوں
	اور فیصلے کرنے میں مجھے کبھی شک
	اور ہچکچاہٹ نہیں محسوس ہوئی

آنحضرت صلعم نے قانون اور انصاف رسانی کا یہ اہم قاعدہ مقرر فرما دیا تھا کہ بار ثبوت مدعی پر ہے اور اگر مدعی ثبوت نہ پیش کر سکے[96] تو دعوے کے منکر یعنی مدعا علیہ کو قسم دی جائے[97] اس قاعدے کو بدلنے کی ابتدا تک

---

۹۵ ترمذی ۱۳ : ۵ - ابوداؤد ۲۳ : ۶ ابن حنبل ج ۱ ص ۱۱۱، ۱۴۹، ۱۵۰، ۹۰،

۹۶ - کنانی ج ۱ ص ۲۵۶، ۲۶۱ - (بقیہ نوٹ صفحے پر)

کہیں ضرورت نہیں سمجھی گئی ہے۔ مزید براں، مدعی اپنے ناکافی ثبوت کی تلافی (جب کہ مدعا علیہ کے پاس بھی جوابی ثبوت نہ ہو) قسم کے ذریعے بھی کرتا اور عہد نبوی میں اس کی بکثرت نظیریں ملتی ہیں[۵۱]۔ ایک نسبتہً فرو تر اختلاف کے زمانے میں ثبوت میں پیش شدہ گواہوں کے علاوہ، قاضی شریح مدعی کو قسم بھی دیتے تھے کہ اس کا دعوی سچا ہے۔ لوگوں نے اس پر اعتراض کیا تو انھوں نے کہا :-

رأیت الناس احدثوا فاحدثت[۵۲]	جب میں نے دیکھا کہ لوگوں میں نت نئی برائیاں پیدا ہو گئی ہیں تو مجھے بھی نئے طریقے اختیار کرنے پڑے۔

اسی سلسلے میں حضرت علی کی ایک نئی اصلاح کی طرف توجہ منعطف کرائی جا سکتی ہے۔ وہ یہ کہ گواہوں کی پیشی پران کا "تزکیہ" یعنی معتبر ہونے

(بقیہ نوٹ ص۱۷۹) ۵۰ ابن حنبل ج ۱ص ۲۸۸۔

۵۱ البینۃ علی المدعی والیمین علی المدعی علیہ (والیمین علی من انکر) بخاری ۴۸: ۲، ۲۶: ۲۰۱۵ مسلم ۳۰: ۱، ۲۱۔ ابوداؤد ۲۱: ۱۳، ۲۱: ۲۳، ۲۴: ۳۲: ۲۴، ترمذی ۱۳: ۱۲، نسائی ۴۹: ۳۶، ابن ماجہ ۲۷: ۸۔ ابن حنبل ج ۱ص ۳۴۲، ۳۵۱، ۳۵۶، ۳۶۳۔ المبسوط للسرخسی ج ۱۷ص ۲۸۔ الطرق الحکمیۃ لابن القیم ص ۹۵

۵۲ مسلم ۳۰: ۱۔ ترمذی ۱۳: ۱۳، ابوداؤد ۲۳: ۲۱ (جنانچہ قضی بشاہد ویمین)

۵۳ الطرق الحکمیۃ ص ۲۸۔

کے متعلق اہل محلہ وغیرہ کا اظہار، قدیم سے رائج تھا لیکن اس تحقیقات کو قاضی شریح نے مخفی طور سے کرانا شروع کیا[۵۱] اور جھوٹے گواہوں کا انسداد کرنے کے لئے حضرت علی ایک گواہ کا اظہار لیتے وقت دوسروں کو عدالت کے کمرے سے ہٹا دیتے تھے اور ان کا قول مشہور ہے کہ " انا اول من فرق بین الشھود "[۵۲] ورنہ اس سے پہلے سب گواہ کمرۂ عدالت میں حاضر رہتے اور ایک دوسرے کے بیانات سنتے رہتے تھے۔

قاضی شریح کا ذکر اب تک کئی بار آیا ہے۔ فصل خصومات ان کا موروثی پیشہ تھا اور ان کے والد ھانی اپنے بے لاگ فیصلوں کے باعث زمانہ جاہلیت میں ابوالحکم کے معزز نام سے مخاطب کئے جاتے تھے[۵۳] خود شریح ان مادر زاد قاضیوں میں سے ہیں جن کی تعداد تاریخ عالم میں بھی بہت کم ہے اور جن پر ہر قوم بجا طور پر فخر کر سکتی ہے۔ یہ بچے سے تھے کہ انھوں نے ایک پیچیدہ قانونی مقدمے میں جس میں خلیفہ حضرت عمر پریشان تھے ایک بہترین اصول اس پیچیدگی کے حل کا بتایا۔ مردم شناس و قدردان حضرت عمر اس قدر خوش ہوئے کہ باوجود لوگوں کی مخالفت کے اس کمسن بچے کو عراق کے اہم صوبے کا قاضی بنا کر کوفہ روانہ کیا۔ قاضی شریح کو وہاں

---

۵۱ المبسوط للسرخسی ج ۱۶ ص ۹۱ - نیز محاضرۃ الاوائل ص ۷۹۔

۵۲ الطرق الحکمیۃ لابن القیم ص ۶۰۔

۵۳ سنن نسائی میں کتاب آداب القضاۃ دیکھئے۔

جو کامیابی ہوئی اس کے لئے صرف اتنا بیان کر دینا کافی ہوگا کہ وہ تقریباً پچھتر سال تک مسلسل اسی کام کو انجام دیتے رہے اور کسی خلیفہ مابعد کو ان کی اہلیت کے متعلق بدگمانی نہیں ہوئی[۵۱]۔ انھیں قاضی شریح کو حضرت عمر نے جو ہدایت نامہ دیا تھا اس کے چند فقرے خود ان کی زبانی سنئے :-

ما استبان لك من كتاب الله فلا تسأل عنه فان لم يستبن في كتاب الله فمن السنة فان لم تجده في السنة فاجتهد رايك[۵۲]	اگر تجھ کو کتاب اللہ میں کوئی چیز مل جائے تو پھر اس کے متعلق کسی اور سے رجوع نہ کر۔ اگر کتاب اللہ میں نہ ملے تو سنت میں اور جو سنت میں بھی نہ ملے تو پھر اپنی رائے کو کام میں لا۔

ایک دوسری روایت میں ہے :-

قال الشعبی عن شریح قال قال لی عمر اقض بما استبان لك من كتاب الله فان لم	شعبی نے شریح سے روایت کی ہے، انھوں نے کہا، مجھ سے حضرت عمر نے فرمایا اگر

---

۵۱ المعارف لابن قتیبۃ ص ۲۲۱، وفیات لابن خلکان بر موقع۔ استیعاب لابن عبدالبر، نمبر ۴۱۵۹۔

۵۲ اعلام الموقعین لابن القیم ج ۱ ص ۳۰۔ بعض اور تفصیلوں کے لئے دیکھئے المبسوط ج ۱۶ ص ۶۶۔ کنز العمال ج ۲ ص ۱۷۵۔

تعلم كل كتاب الله فاقض بما	کتاب اللہ میں کوئی چیز مل جائے
استبان لك في قضاء رسول	تو اسی کے مطابق فیصلہ کرے۔
الله فان لم تعلم (كل) قضاء	اگر پوری کتاب اللہ میں بھی وہ
رسول الله فاقض بما	مسئلہ نہ ملے تو رسول اللہ کے
استبان لك من (قضاء)	فیصلوں میں جو چیز ملے اس کے
ائمة (الائمة؟) المهتدين	مطابق فیصلہ کرے۔ اگر رسول اللہ
فان لم تعلم كل ما قضته ائمة	کا کوئی فیصلہ نہ ملے تو راہ یاب
(الائمة؟) المهتدين	اماموں کے فیصلوں کے مطابق
فاجتهد رايك واستشر	فیصلہ کرے۔ اگر راہ یاب اماموں
اهل العلم والصلاح ۵۱	کے فیصلوں میں بھی کوئی چیز نہ
	ملے تو اپنی رائے کو کام میں
	لا اور علم و صلاح والوں سے
	مشورہ کر۔

جیسا کہ اوپر بتایا جا چکا ہے یہی طرز عمل اور حکم آنحضرت کا تھا اور بغوی نے لکھا ہے کہ حضرت ابوبکر کا بھی یہی طرز عمل تھا ۵۲ بلکہ یہاں تک پتہ

---

۵۱ اعلام ج ۱ ص ۸۵، تا ۸۶، آخری جملے کی تائید کے لئے دیکھئے سنن نسائی کتاب آداب القضاء۔ نیز المقارنات ص ۲۶۔

۵۲ بحوالہ السیاستہ الشرعیہ لعبد الوہاب الخلاف ص ۴۷۔

چلتا ہے کہ قاضیوں کے لئے مشیران قانون بھی جوزر لائینگ بنا دیئے گئے تھے اور عرصہ دراز تک اس پر عمل رہا جس کے باعث نئے قاضیوں کی ناتجربہ کاری قانون کی مکمل تعمیل میں حارج نہ ہوئی۔ شاید یہ متاخر قانون رومانا کے "کونسیلیم" سے مشابہ ہے۔ اس کے کچھ اشارے بدائع کا سانی جلد ۷ صـ۱۲ میں ملتے ہیں اور تفصیل کے لئے امیل تیان کی مذکورہ کتاب جلد ۱ صـ۲۱۴ و مابعد۔

حضرت عمر نے اپنی خلافت کے زمانے میں مختلف صوبوں کے قاضیوں کو جو ہدایتیں دی تھیں ان میں سے چند تاریخ نے محفوظ رکھی ہیں[۹۲] ان میں سے ایک جو "کتاب سیاسۃ القضاء و تدبیر الحکم" کے موزوں نام سے مشہور ہے[۹۳] سب سے زیادہ اہم ہے۔ یہ وہ ہدایت نامہ ہے جو انھوں نے حضرت ابوموسیٰ الاشعری کو بصرے کا قاضی بنانے کے بعد بھیجا تھا اور جو آج بھی حکام عدالت

---

۹۱ تفصیل کے لئے امیل تیان کی مذکورہ بالا فرانسیسی تالیف، برموقع۔

۹۲ بنام حضرت ابو عبیدہ (کتاب الخراج لابی یوسف ص ۶۷) بنام حضرت معاویہ (المبسوط للسرخسی ج ۱۶ ص ۶۵ - العقد الفرید لابن عبد ربہ ج ۱ ص ۲۵)۔ دیگر بنام شریح (مبسوط ج ۱۶ ص ۶۶ - کنز العمال ج ۳ ص ۱۷۵) بنام حضرت ابو موسیٰ علاوہ اس کے جس کا آگے ذکر ہے (العقد الفرید ج ۱ ص ۲۶)۔

۹۳ مبسوط ج ۱۶ ص ۶۰

کے لئے دستورالعمل بن سکتا ہے۔ اس کی اہمیت نے آکسفرڈ کے پروفیسر عربی ڈاکٹر مارگولیوث کو ۱۹۱۰ء میں اس بات پر آمادہ کیا تھا کہ اس پر ایک بسیط مضمون لکھے[۵۱] مگر بدقسمتی سے اصل دستاویز کا انگریزی ترجمہ جو مارگولیوث نے کیا ہے، حد درجہ ناقص ہونے سے اس کی اہمیت کا کوئی صحیح اندازہ پڑھنے والے کو بالکل نہیں ہو سکتا۔ اسلامی مولفوں نے بھی قدیم سے اس دستاویز کو بڑی اہمیت دی ہے اور اس پر شروح لکھے ہیں[۵۲] اس کافی طویل دستاویز کا یہاں خلاصہ پیش کیا جاتا ہے۔ اصل متن بکثرت مولفوں نے محفوظ کیا ہے[۵۳]

قضاءت ایک خدائی فریضہ ہے اور آنحضرت کا واجب التعمیل حکم اور طرز عمل۔

اگر آپ کے پاس کوئی مقدمہ رجوع ہو تو غور و فکر کے بعد پوری طرح سمجھ کر فیصلہ کیجئے اور اس کی تعمیل کرائیے۔ بغیر تعمیل کے اچھے سے اچھا فیصلہ بھی بیکار رہے۔

---

۵۱ جرنل رائل ایشیاٹک سوسائٹی لندن ۱۹۱۰ء صفحہ ۳۰۳ تا ۳۲۳

۵۲ مثلاً السرخسی نے مبسوط ج ۱۶ ص ۶۰ و مابعد میں اور ابن القیم نے اعلام الموقعین جلد اول میں۔

۵۳ عربی متن اور جملہ عربی ماخذوں کے لئے دیکھئے مارگولیوث کا مذکورہ مضمون نیز میری تالیف الوثائق السیاسیہ، دستاویز ص ۳۲۷

فریقین سے برابری کا برتاؤ کیجئے تاکہ کمزور آپ کے عدل سے مایوس نہ ہو جائے اور قوی ظالم اس سے بے جا فائدہ نہ اٹھائے۔ بار ثبوت مدعی پر ہے اور منکر پر صرف قسم۔

اگر فریقین صلح کرلینی چاہیں تو وہ جن شرائط پر چاہیں صلح کر سکتے ہیں بشرطیکہ شرط یہ ہے کہ اس طرح کوئی حرام چیز حلال نہ ہو جائے اور حلال چیز حرام۔

فیصلہ کر چکنے کے بعد نظر ثانی میں کوئی حرج نہیں کیونکہ اصل حق رسانی اور انصاف ہے۔

اگر کسی بات کے فیصلے میں قرآن اور سنت میں کوئی چیز نہ ملے تو خوب غور و فکر کیجئے اور نظائر اور مشابہ امور کو ڈھونڈ کر ان پر قیاس کیجئے اور ایسا فیصلہ کیجئے جو خدا کو زیادہ پسند آئے اور حق سے زیادہ قریب ہو۔

اگر مدعی کو اپنا حق ثابت کرنے یا شہادت فراہم کرنے میں مہلت درکار ہو تو وہ دی جائے۔

شہادت سے اگر وہ دعوی ثابت کر دے تو اس کے موافق ورنہ اس کے مخالف فیصلہ صادر کیا جائے۔

شہادت کے اغراض کے لئے سب مسلمان قابل اعتماد ہیں، سوائے بدچلنی میں سزا یافتہ (مجلود فی حد) اور ایسے لوگوں کے جن کا جھوٹی گواہی دینا اس سے پہلے ثابت ہو چکا ہو۔

کسی مدعی کے رشتہ دار کی خاص اس مقدمے میں شہادت قابل اعتماد نہیں۔

مجلس عدالت میں غرور و تکبر، لوگوں کو جھڑکنا اور حق بات پر ناگواری نہیں ظاہر کرنی چاہیئے۔ خدا سب دیکھتا ہے اور سنتا ہے، اس سے سب کو اپنا معاملہ صاف رکھنا چاہیئے۔

اس عہد کا اسلامی قانون شہادت اتنا وسیع موضوع ہے کہ ایک مستقل مقالے کے بغیر یہ بتانا ناممکن ہوگا کہ تفتیش کس طرح ہوتی تھی تنقیح شہادت اور جرح کے کیا قواعد تھے، گواہوں کی تعداد، عمر، مرد اور عورتیں، مسلم اور غیر مسلم کی شہادت، غیر ملکی مستامنوں کے عدالتی حقوق وغیرہ کے کیا قاعدے تھے۔

قاضیوں کی تنخواہ بھی ایک دلچسپ چیز ہے۔ اسلام میں اس اصول کو شروع ہی سے تسلیم کیا جاتا رہا ہے کہ قاضیوں کو معقول بلکہ بیش قرار تنخواہیں دیکر رشوت کے لالچ سے بچایا جائے۔ آنحضرت طالب عہدہ لوگوں کو کبھی گورنر یا قاضی نہیں بناتے تھے۔ تاریخ سے ثابت ہوتا ہے کہ آنحضرت نے حکام عدالت کے لئے ماہواریں بھی مقرر کرنی شروع فرمادی تھیں اور اس بارے میں حضرت عتاب بن اسید کا نام بہ طور نظیر پیش کیا جاتا ہے، جن کو، کہتے ہیں کہ، ماہانہ تیس درہم تنخواہ دی جاتی تھی[۵۷] سلیمان بن ربیعہ الباہلی کو حضرت عمر ماہانہ پانچ سو درہم دلاتے تھے اور کمسن قاضی شریح کو

---

۵۷ کتانی ج ۱ ص ۲۶۴ بحوالہ ہدایہ۔ (و فرض له اربعین اوقیة من فضة" المنتقی فی اخبار ام القری للفاکہی ص ۲۰)۔

۱۱۱۔ ایک سو۵۱ حضرت علی اپنے زمانۂ خلافت میں ایک مرتبہ قاضی شریح کے پاس اپنے ایک مقدمے کے لئے رجوع ہوئے اور اپنے بیٹے امام حسن کو بطور گواہ پیش کیا۔ حضرت علی کے، باوجود خلیفہ ہونے اور امام حسن کی خصوصی شخصیت بتاکر اصرار کرنے کے، قاضی شریح نے بیٹے کی گواہی کو باپ کے حق میں قبول کرنے سے انکار کردیا۔ اس واقعے کے کچھ دنوں بعد حضرت علی نے قاضی شریح کی بھی ماہوار پانچ سو درہم مقرر کردی۵۱

متعدد نظیروں سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ آنحضرت فوجداری مقدموں میں ملزم کو تحقیقات تک اور مدیون کو قرض کی ادائی کے لئے حوالات میں رکھتے تھے۵۲ نیز حاضری کا مچلکہ بھی لیتے تھے۵۳ خلافتِ راشدہ میں قید خانوں کے لئے مستقل عمارتیں ہونے لگ گئی تھیں۔ اس غرض کے لئے حضرت عمر کا مکان خریدنا مشہور ہے۔ حضرت علی کے بنائے ہوئے دو قید خانے نافع اور مخیس کے نام سے معروف ہیں۵۴

انگریزی قانون کا ایک اہم اصول ہے کہ بادشاہ کے خلاف کوئی مقدمہ نہیں دائر کیا جاسکتا کیونکہ King can do no wrong. لیکن اسلام

---

۵۱ مبسوط ج ۱۶ ص ۱۲۲۔

۵۲ ابوداؤد ۲۳ : ۲۸۔ قرطبی ص ۴ تا ۵۔ کتانی ج ۱ ص ۲۹۶۔

۵۳ مبسوط ج ۲۰ ص ۷۵۔

۵۴ مبسوط ج ۲۰ ص ۸۸ قاموس وغیرہ میں مادہ خیس

کسی انسان کو خطا سے مبّرا نہیں سمجھتا۔ اور یہی وجہ ہے کہ آنحضرت صلعم نے خود اپنی ذات کے خلاف ٹارٹ اور دیوانی دونوں قسم کے متعدد مقدمات سنے اور مدعیوں کے حق میں فیصلے صادر کئے[۵۱] حضرت عمر نے نہ صرف اضلاع بلکہ مستقر حکومت مدینہ منورہ میں مستقل اور پورا وقت دینے والے قاضی مقرر کر دئے تھے۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ خود خلیفے کے خلاف کوئی مقدمہ دائر ہوتا تو خلیفے کو بھی عدالت میں حاضر ہو کر جوابدہی کرنی پڑتی کیونکہ کوئی اپنے آپ فریق اور حاکم دونوں نہیں بن سکتا ("على أن الإمام لا يكون قاضياً في حق نفسه" مبسوط سرخسی جلد ۱۶ ص ۶۳۔ مزید تفصیل کے لئے میری انگریزی تالیف "مسلم کانڈکٹ آف اسٹیٹ ص ۸۰ تا ۸۴)۔ اس قسم کی نظیریں نہ صرف حضرت ابوبکر، عمر، عثمان اور علی کے زمانے میں ملتی ہیں[۵۲] بلکہ خلفائے بنی امیہ و بنی عباس تک اس سے اپنے کو مستثنا کرنے کی جرأت نہیں رکھتے تھے اور عبدالملک اور منصور کا عدالت میں مدعا علیہ بن کر جوابدہی کے لئے حاضر ہونا[۵۳] مثال کیلئے

---

[۵۱] ابن ہشام ص ۴۴۴ - ابن الاثیر ج ۲ ص ۲۴۱، مسلم کانڈکٹ آف سٹیٹ ص ۸۲ تا ۸۴

[۵۲] مبسوط ج ۱۶ ص ۶۳، ۶۴، ۱۲۲ - طبقات ابن سعد ۱/۲ ص ۹۷ - کتاب الخراج لابی یوسف ص ۶۵

[۵۳] ولاۃ مصر للکندی ص ۳۵۷، ۳۵۶ - الحکم بن ہشام بن عبدالرحمن الداخل کے لئے دیکھئے مقری کی نفح الطیب طبع یورپ جلد ۱ ص ۲۵۵ میں اس حوالے کے لئے پروفیسر جمیل الرحمن مرحوم کا ممنون ہوں اسی طرح (بقیہ ص ۱۹۰ پر)

کافی ہے۔ اس کی نظیریں حال کے حیدر آباد کی تاریخوں تک میں ملتی ہیں۔

مستقل قاضیوں کے سلسلے میں ایک بعد کے زمانے کا واقعہ بیان کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ مورخ ابن الجوزی نے بیان کیا ہے کہ عبید اللہ ابن الحسن العنبری اور عمر بن عامر بصرے میں پہلی مرتبہ ایک عدالت میں مشترک قاضی مقرر کیئے گئے اور انھیں حکم دیا گیا کہ وہ مل کر مقدمے سنیں اور متفقہ فیصلے صادر کریں [۵۱] (عورت کے قاضی ہوسکنے کے متعلق مباحث ماوردی باب ششم میں دیکھئے)۔

قاضی یا حاکم عدالت کا اجلاس شروع میں عموماً مسجد میں ہوتا تھا جو شہر کے ٹاؤن ہال کا کام دیتی تھی۔ ان مسجدوں میں مسلم اور غیر مسلم سب بے تکلف آسکتے تھے۔ ابن عساکر کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عثمان کے زمانے میں ایک عمارت دار القضاء کے نام سے بن چکی تھی [۵۲] سلطان نورالدین زنگی کا ایک دار العدل تعمیر کرانا البتہ ایک بعد کا واقعہ ہے۔

چونکہ مقدمات ہر قسم کے پیش ہوتے ہیں اس لئے ان کے تسویے کے لئے ماہرین کی امداد حاصل کرنی ضروری ہوتی ہے۔ تعمیرات [۵۳] غلے اور

(بقیہ نوٹ ص۱۸۹) ماوردی کی الاحکام السلطانیہ میں بھی کچھ واقعات ملتے ہیں۔

۵۱ کتاب الاذکیاء (مخطوطہ باڈلیئن) ورق ۴۳ ب نیز دیکھئے کتاب المقارنات ص ۹۲

۵۲ بحوالہ کتانی ج ۱ ص ۲۷۱ تا ۲۷۲

۵۳ (بصیر بالبناء) کتانی ج ۱ ص ۲۸۰ تا ۲۸۱۔

زرعی پیداوار کا اندازہ[۵۱]، قیافہ شناسی[۵۲]، اور اسی طرح کی چند چیزوں کے ماہر خود عہد نبوی میں عدالتی اغراض کے لئے بر سر موقع بھیجے جایا کرتے تھے اور ان کی رائے پر آنحضرت فیصلہ کرتے اور فیصلہ نافذ کراتے۔

قاضی کا تقرر شروع سے مرکز حکومت سے متعلق رہا ہے خاص کر صوبوں کے صدر قاضی۔ البتہ بعض بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت علی اور خود حضرت عمر اپنے گورنروں کو اجازت دیتے تھے کہ اپنے علاقے میں حسب ضرورت حکام عدالت خود مقرر کریں اور انھیں کافی تنخواہ دے کر مستغنی بنا دیں[۵۳]۔

قاضیوں کی سخت غصے کی حالت میں فیصلے نہ کرنا، پیچیدہ مقدموں میں مشورے کرنا، جھوٹے دعوے، جھوٹی شہادت اور جانبدارانہ فیصلوں پر سخت وعیدیں، رشوت اور سفارش کی ممانعت، مبہم فیصلوں (قضاء بقضائین) کی ممانعت، وغیرہ امور زیادہ تر ادب القاضی[۵۴] سے متعلق ہیں

---

۵۱ (خرص) کتاب الاموال لابی عبید فقرہ ۱۴۳۵ تا ۸۶۔ نیز بکثرت دیگر حوالے۔

۵۲ الطرق الحکمیہ لابن القیم ص ۱۹۶ مزید حوالوں کے لئے مفتاح کنوز السنہ عنوان قائف۔

۵۳ الکتانی، التراتیب الاداریہ ج ۱ ص ۲۶۰۔

۵۴ ہر فقہی کتاب میں باب آداب القضا ملے گا۔ نیز دیکھئے شاہ ولی اللہ صاحب کی حجۃ اللہ البالغۃ جلد ۲ ص ۱۲۴ تا ۲۷ اور مفتاح (بقیہ نوٹ ص ۱۹۲ پر)

ان پر اس مختصر اشارے کے بعد ایک اہم تر چیز کا ذکر کیا جاتا ہے :۔

عدل گستری کے لئے حق و ناحق میں امتیاز کرنے کے لئے ایک معیار یعنی ایک قانون کی ضرورت ہوتی ہے تاکہ فیصلوں میں ہر جگہ یکسانی رہے اور لوگوں کو اپنے حقوق و فرائض پہلے ہی سے معلوم رہیں اور ساتھ ہی ان احکام کی خلاف ورزی کے لئے ایک تدارک اور ایک تہدید بھی مقرر کر دی جائے تاکہ ان کی پابندی زیادہ سے زیادہ ہو سکے۔

تدارک کے لئے عام طور پر صرف حکومت کی قوت کام میں لائی جاتی ہے لیکن پوشیدہ جرائم خاص کر جھوٹی تاویلوں کی اس سے روک تھام نہیں ہوتی۔ اسی لئے اسلام نے برائیوں کی اصل جڑ پر وار کیا اور احکام کو ایک تقدس دیدیا تاکہ ہر فرد رعیت خوف سے نہیں بلکہ برضا و رغبت اور نہ صرف ظاہر بلکہ باطن میں، حکومت کی دارو گیر سے بالکل باہر بھی، ہر جگہ اپنے فرائض بجا لائے اور جرم اور گناہ سے بچے۔ حشر و حساب کا عقیدہ بھی اس کو موثر بنانے میں بڑا حصہ لیتا ہے۔ مطلب یہ کہ اسلامی نقطۂ نظر سے مقنن اصلی اور سرچشمۂ احکام صرف خدائے حکیم و قدیر کی ذات ہے جس کا کوئی حکم نامناسب یا ظالمانہ نہیں اور جو انسانوں کو مرنے کے بعد دوبارہ زندہ کر کے ان کے اعمال کا حساب و کتاب لے گا اور اسی کے مطابق سزا یا جزا دے گا۔ آنحضرتؐ ایک پیغمبر تھے اور خدا کا پیغام بندوں

(بقیہ نوٹ) کنوز السنۃ مولفہ فنسنک، میں متعلقہ احادیث کے لئے تحت لفظ "قضاء"۔

تک پہنچاتے تھے ، اپنے دل سے کچھ نہیں کہتے تھے ۔ " وما ینطق عن الھوی ان ھو الا وحی یوحی " [۱]

غرض خدا نے اپنے احکام کچھ تو اپنی "کتاب" [۲] یعنی قرآن کی صورت میں دئے جو ابتدائے اسلام سے تھوڑا تھوڑا نازل ہو کر آنحضرت کی زندگی میں مکمل ہو گیا ۔ اس کے سوا کچھ اور احکام آنحضرت کے قول و فعل کے ذریعے پہنچائے گئے اور قرآن ہی میں ان کے واجب التعمیل ہونے کی صراحت کر دی گئی ہے [۳]

یہ تو راست قانون سازی تھی ۔ فقیہ ، مجتہد ، قاضی وغیرہ اسی قانون موضوعہ کے پابند ہوتے ہیں گو جیسا کہ حضرت معاذ بن جبل گورنر یمن کے سلسلے میں بیان کیا گیا ، اجتہاد اور صوابدید نیز استحسان کے لئے گنجائش رکھ کر قانون میں ضروری لچک پیدا کر دی گئی ۔

قرآن و حدیث اور آرائے مجتہدین یعنی اجماع و قیاس سے قانون اسلام کا انتخاب ، استنباط ، تدوین اور ترقی اس وقت ہمارے موضوع سے خارج ہیں ۔ البتہ اس مختصر خاکے کے آخر میں ان حقوق اساسی کا ذکر بے محل نہ ہوگا جو آنحضرت صلعم نے حجۃ الوداع (سنہ ۱۰ھ) کے موقع پر اپنے

---

[۱] قرآن سورہ نجم آیت ۳ ۔

[۲] لفظ کتاب کے معنے فرض مقررہ کے بھی ہیں ۔

[۳] قرآن ۳۳ : ۲۱ ؛ ۵ : ۶ ۔ وغیرہ

جبل الرحمة کے مشہور پہاڑی خطبے[۵۱] میں حلقہ بگوشان اسلام کے لئے مقرر فرمائے یہ خطبہ مسلمانوں کی تاریخ تمدن میں ایک منشور انسانیت کا کام دیتا ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے:-

ہر شخص کے تین بنیادی حقوق یعنی جان، مال، آبرو محفوظ اور قابل احترام ہیں۔

امانت (اور قرض) واپس ادا کئے جائیں۔

زمانۂ جاہلیت کا سود ممنوع کیا جاتا ہے اور فی الوقت واجب الادا سود بھی نہیں دلائے جائیں گے، صرف اصل واپس ملے گا۔ خود حضرت عباس کے سود بھی کالعدم کئے جاتے ہیں۔

زمانۂ جاہلیت میں کئے ہوئے خون لوگ اب بھول جائیں اور ان کے بدلے اور انتقام کا خیال نہ کریں۔ خود آنحضرت اپنے چچا زاد بھتیجے کا خون معاف کرتے ہیں۔

زمانۂ جاہلیت کے تمام آثار مٹا دئے جاتے ہیں سوائے خانہ کعبہ کی تولیت اور حاجیوں کے پانی کے انتظام کے۔

۵۱۔ پورے متن کے لئے دیکھئے ابن ہشام ص ۹۶۸ تا ۹۷۰۔ تاریخ طبری ص ۱۷۵۳ تا ۱۷۵۵۔ البیان والتبیین للجاحظ ج ۲ ص ۲۴ تا ۲۶۔ تاریخ یعقوبی ج ۲ ص ۱۲۲ تا ۱۲۳۔ العقد الفرید لابن عبد ربہ باب خطب وغیرہ وغیرہ نیز میری عربی تالیف الوثائق السیاسیۃ، بر موقع۔

قتل عمد میں قصاص لیا جائے گا اور شبہہ عمد میں سو اونٹ خوں بہا دیا جائیگا۔
سال کبیسہ کی تقویم برخاست کی جاتی ہے اور قمری سنہ رائج کیا جاتا
ہے جس میں بارہ مہینے ہوتے ہیں۔

میاں اور بیوی کے ایک دوسرے پر حق ہوتے ہیں۔ شوہر کا حق یہ ہے
کہ بیوی پاکدامن رہے اور ان لوگوں کو گھر میں داخل ہونے نہ دے
جن کو شوہر ناپسند کرتا ہے۔ بیوی کا حق یہ ہے کہ شوہر اسے اچھا
کھلائے اور پہنائے۔ عورتیں ایک امانت ہیں۔ ان سے سلوک میں خدا
سے ڈرو اور اچھا برتاؤ کرو۔

سب مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ بلا رضامندی کوئی کسی کا مال نہ
لے اور نہ آپس میں لڑائی کرے۔

میں تم میں دو بھاری چیزیں چھوڑے جاتا ہوں جب تک تم ان کو تھامے
رہو گے، تم بھٹکو گے نہیں۔ وہ قرآن اور سنت ہیں۔ اور میں تمہیں میرے
اہل بیت سے سلوک کے متعلق بھی تاکید کرتا ہوں۔

سب لوگوں کا رب بھی ایک ہی ہے اور سب آدمیوں کا باپ بھی ایک
ہی ہے۔ تم آدم سے ہو اور آدم مٹی سے بنے تھے۔ خدا کے نزدیک
تم میں سے محترم ترین وہی ہے جو سب سے زیادہ متقی ہو، ورنہ کسی عرب
کو کسی عجمی پر کوئی فضیلت نہیں۔

وارثوں کے لئے حصے خدا نے مقرر کر دئے ہیں۔ وصیت ایک تہائی مال
سے زیادہ کی روا نہیں۔

بچہ فراش (عورت؟) کا ہوگا اور زانی کو پتھر ملیں گے۔
نسب اور ولا میں جھوٹے دعوے اور کوششیں ایک ملعون فعل ہیں۔

یہ ایک سرسری خاکہ ہے جو ابتدائے اسلام کے، زیادہ تر طرز عمل اور نظائر کی روشنی میں، مرتب کیا گیا۔ اور یہی طرز عمل بعد کے زمانوں میں ہمیشہ تمام دنیائے اسلام کے لئے ایک قابل عمل نمونے اور ایک واجب التعمیل نظیر اور حکم کا کام دینے لگا۔ اسلامی تصور عدل کے متعلق چند آیتوں کی تلاوت سے اسے ختم کرتا ہوں:-

ان اللہ یامر بالعدل والاحسان۔	خدا انصاف اور احسان دونوں کا حکم دیتا ہے۔
ولا یجرمنکم شنآن قوم علی الا تعدلوا اعدلوا ھو اقرب للتقوی۔	کسی کی شخصی مخالفت کے باعث ناانصافی کے مجرم نہ بن جاؤ بلکہ عدل کرو اور یہی متقی کی شان ہے۔
جزاء سیئۃ سیئۃ مثلھا فمن عفا و اصلح فاجرہ علی اللہ۔	برائی کا بدلہ مساوی برائی ہے زیادہ نہیں، لیکن اگر کوئی عفو اور صلح سے کام لے تو خدا اس کا اجر دے گا۔
وان عاقبتم فعاقبوا بمثل ما عوقبتم بہ ولئن صبرتم لھو خیر للصابرین۔	اگر بدلہ لینا چاہو تو اتنا ہی لو جتنا تمہیں نقصان پہنچایا گیا ہے۔ لیکن اگر صبر کرو تو یہ بہتر ہے۔

(مجلہ تحقیقات علمیہ جامعہ عثمانیہ سالنامہ ۱۹۵۷ء)

عہدِ نبوی کا نظامِ تعلیم

عرب اور خاص کر مکہ معظمہ کی معاشرتی حالت کا جو قبلِ اسلام پائی جاتی تھی، اگر قریب سے مطالعہ کیا جائے، تو ناگزیر اس نتیجے پر پہنچنا پڑتا ہے۔ کہ اس زمانے کے عربوں میں غیر معمولی صلاحیتیں پائی جاتی تھیں۔ جب اسلامی تعلیمات نے ان صلاحیتوں کو صیقل کیا، تو عربوں نے اپنی سوجھ بوجھ اور کارکردگی کی قابلیت سے دنیا کو حیران کر دیا۔ اور جب "وحدت اور حرکت کے مذہب" یعنی اسلام نے ان کی توانائیوں کو ایک مرکز پر جمع کیا، اور اس طرح ان میں عزم و قوت پیدا کر دی تو یہی عرب اس قابل ہو گئے کہ پوری دنیا کو مبارزت دیں، اور وقتِ واحد میں اس وقت کی دونوں عالمگیر شہنشاہتوں یعنی ایران اور روم (بیزنطینہ) سے جنگ کریں۔

میں نے اپنے بعض مقالوں میں کسی قدر تفصیل سے بتایا ہے، کہ زمانۂ جاہلیت کی عربی، خانہ جنگیاں عربوں کے کردار کو بنانے اور ان میں حیرت انگیز قوتِ برداشت اور دیگر اعلیٰ صفات پسند قابلیتیں پیدا کرنے میں مدد و معاون رہیں جن پر خود نپولین[1] کو رشک تھا۔ عرب میں معینہ اوقات پر لگنے والے

[1] سینٹ ہیلینا کی یادداشتیں (فرانسیسی) جلد (۳) صفحہ ۱۸۔

بنداروں اور کاروانوں کی حفاظت کے لئے بدرقوں یا خفاروں کا انتظام کچھ اتنا مکمل اور وسیع ہوگیا تھا کہ اس نے پورے جزیرہ نمائے عرب میں ایک معاشی "وفاق" قائم کر دیا تھا[91]، جس سے عربوں میں وحدت کے خیالات پیدا ہونے لگ گئے تھے، اور اسلام کے تحت ان کی "سیاسی وحدت" کا راستہ صاف ہوگیا تھا، اسی طرح شہری مملکت مکہ کا دستور بھی خاصا ترقی یافتہ تھا، جس سے وہاں کے باشندوں کو اس بات کی تربیت مل چکی تھی، کہ ایک عالمگیر شہنشاہیت کے نظم و نسق کو چلا سکیں[92]

یہاں میرے پیش نظر ایک اور مسئلہ ہے، اور وہ یہ کہ زمانہ جاہلیت کے عربوں کی علمی صلاحیتیں بھی اتنی خاصی تھیں، کہ ہجرت کی ابتدائی صدیوں میں عربوں نے علوم و فنون کی حیرت انگیز فصلیں کاٹیں، انھیں صلاحیتوں کو اجاگر کرنا، ان کی خفتہ قابلیتوں کو بیدار کرنا، اور ان کو مفید اغراض میں کام میں لانا، یہ البتہ اسلام کا کارنامہ ہے۔

عہد نبوی کے نظام تعلیم کا اس سے بہتر پس منظر کیا ہوگا، کہ اسلام سے پہلے عرب میں علمی حالت جیسی کچھ تھی، اس کا خاکہ پیش کیا جائے۔

عرب میں زمانۂ جاہلیت میں تعلیم | بدقسمتی سے ہمارے پاس زمانۂ جاہلیت کے تعلیمی معاملات کے متعلق بہت کم معلومات محفوظ ہیں۔ اس کی کچھ تو یہ وجہ ہے،

---

[91] باب "زمانۂ جاہلیت کا معاشی نظام"

[92] باب "شہری مملکت مکہ"

کہ اس زمانے میں وہاں لکھنے کا زیادہ رواج نہ تھا، اور کچھ یہ کہ لاکھوں کروڑ کتابیں ہلاکو خاں وغیرہ نے بغداد، قرطبہ اور دیگر مقامات پر ایسے زمانے میں تباہ کر دیں، جب کہ ابھی فنِ طباعت سے کتابیں چھاپنے کا کام نہیں لیا جانے لگا تھا۔ اس دشواری کے باوجود جو کچھ تھوڑا بہت مواد ہم تک پہنچ سکا ہے، اس کی مدد سے زمانۂ جاہلیت کی تعلیمی حالت کا پتہ چلتا ہے جس سے ہمیں حیرت ہوتی ہے، اور اس قوم کے متعلق رشک ہونے لگتا ہے، جو ان پڑھ ہونے پر اتراتی تھی[۹]۔

اولاً اُن کی زبان کو لیجئے، یہ خیال کیا جاتا ہے کہ کوئی زبان اپنے لغات، محاورات، اور ادبی کمالات میں اس زمانے میں ترقی کرتی ہے، جب اُس کے بولنے والوں کا تمدن عروج پر ہو، اور اس سے پہلے اُس زبان کی حالت اتنی پست ہوتی ہے کہ اُس کو جانوروں کی آواز سے کچھ ہی بلند قرار دیا جا سکتا ہے، کیونکہ اس وقت اس زبان میں نہ تو اونچے خیالات ادا کئے جا سکتے ہیں، اور نہ معمولی روزمرہ کی ضرورتوں کے سوا اس میں کوئی علوم وفنون مل سکتے ہیں۔ اگر اس معیار پر اسلام سے پہلے کی عربی زبان کو

---

۹ خود ایک حدیث میں ہے "ہم ایک اُمّی قوم ہیں، لکھنا اور حساب کرنا نہیں جانتے" (إنا أمة أمية لا نكتب ولا نحسب) مختصر جامع بیان العلم ص۲۳۔ یہ حدیث صحیح بخاری وغیرہ میں بھی ہے اس میں اصل میں تو زمانہ اسلام میں قمری مہینوں کے اختیار کی وجہ بتائی گئی ہے، لیکن ضمناً اس سے شاید زمانۂ جاہلیت کے تصورات کا اندازہ کرنے میں مدد لی جا سکتی ہے۔

جانچا جائے، تو ہم زبان کی نزاکت، لغات کی کثرت، قواعد صرف و نحو کی استحکام اور خاصے بلند معیار کے نظم کے ذخیرے کے باعث حیرت زدہ ہو جاتے ہیں۳ یہ بات بھی یاد رکھنے کے قابل ہے، کہ مستند عربی زبان زمانۂ جاہلیت کی سمجھی جاتی ہے، اسلامی تمدن کے عہد زریں کی زبان کو یہ حیثیت حاصل نہیں ہے، اگر ہم زمانۂ حال کی کوئی زبان مثلاً جرمن، روسی، فرانسیسی یا انگریزی کو لیں، تو ان کے دو مؤلف جن میں مثلاً ڈیڑھ ہزار سال کا زمانہ حائل ہو تو ایک ہی زبان کے یہ مؤلف ایک دوسرے کو بالکل نہیں سمجھ سکیں گے۔ اس کے برخلاف امرؤ القیس کی زبان اور قواعد صرف و نحو بالکل وہی ہیں، جو مثلاً زمانۂ حال کے مصری شعراء شوقی اور حافظ کے ہیں۔ قرآن اور حدیث اس "جاہلی زبان" میں ہیں جس پر عربی شہنشاہیت کے تمدن نے کوئی اثر قائم کرنے کا موقع نہیں پایا تھا۔ قرآن اور حدیث زمانۂ جاہلیت کے بدویوں کو بھی اسی سہولت سے سمجھ میں آتے تھے، جتنا آج کسی جدید عربی کے متعلم کو۔ اسی زمانے میں عربی زبان، لغات کی حد تک اتنی وسیع اور مشمول ہو گئی تھی، کہ اس کا مقابلہ زمانۂ حال کی انتہائی ترقی یافتہ مغربی زبانوں سے بھی بآسانی کیا جا سکتا ہے۔ ان چیزوں کی جیسے تفصیل بیان کرنی غیر ضروری ہے، کیونکہ ہر عربی داں اس سے واقف ہے، میرا منشا صرف اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے، کہ اسلام سے پہلے عربوں کی زبان جس پختگی اور وسعت سے بہرہ ور ہو چکی تھی، وہ یقیناً اس بات کے بغیر ممکن نہیں، کہ اس سے پہلے اس زبان کے بولنے والوں میں ادبیات کی بڑی صلاحیتیں اور چرچے چلتے رہے ہوں۔

بے شمار نظمیں زمانۂ جاہلیت کی طرف منسوب ہیں۔ خود نثر بھی بہت سے خطبوں، تقریروں ضرب المثلوں، کہانیوں، کاہنوں، اور حکموں (پنچ) کے فیصلوں وغیرہ کی صورت میں ہم تک ان کی یادگاریں پہنچی ہیں۔ ان کے دیکھنے سے ہر ناظر یہ اندازہ کرلے گا، کہ اس زمانے کے عربوں میں بلاغت، ظرافت، حسنِ ذوق، اور دقتِ نظر کا معیار کتنا بلند تھا!

خود لفظ "عرب" کے معنی ہیں وہ شخص جو اپنا مطلب اچھے طور سے واضح کرسکتا ہو۔ تمام غیر عرب "عجم" کہلاتے ہیں، جس کے معنی گونگے کے ہیں۔

یہاں تک تو استنباطات اور قیاس آرائیاں ہوتی رہیں۔ خود تاریخی واقعات بھی مفقود نہیں ہیں۔

مدرسوں کے سلسلے میں کسے یقین آئے گا کہ اس زمانے میں وہاں نہ صرف تعلیم گاہیں تھیں بلکہ ایسی تعلیم گاہیں جن میں لڑکے اور لڑکیاں دونوں تعلیم پاتی ہوں؟ بہرحال ابن قتیبہ نے عیون الاخبار (جلد ۴ صفحہ [illegible]) میں بیان کیا ہے، کہ مکے کے قریب رہنے والے قبیلۂ ہذیل کی ضرب المثل فاحشہ عورت کے طلحہ جب بچی تھی، تو ایک مدرسہ جاتی تھی، جہاں اس کا سب سے دلچسپ مشغلہ یہ تھا کہ دواتوں میں قلم ڈال اور نکال کر کھیلا کرے۔ اس دلچسپ واقعے سے اتنا تو معلوم ہو جاتا ہے کہ قبیلۂ قریش کے رشتہ دار قبیلہ ہذیل میں ایسے مدرسے تھے، جو چاہے کتنے ہی ابتدائی نوعیت کے کیوں نہ ہوں، ان میں لڑکے اور لڑکیاں تعلیم پانے کے لئے جاتی تھیں۔

بازار عکاظ میں ہر سال جو ادبی چرچا ہوا کرتا تھا اس کے باعث اسے

ایک "جرنل لعرب لٹریری کانگریس" کہنا بے جا نہ ہوگا۔ عکاظ نے مورخین اور مولفین کو ہمیشہ سے ہی بہار رکھا ہے۔ حال ہی جامعۂ مصریہ کے پروفیسر احمد امین نے مجلۂ کلیۃ الآداب میں اس موضوع پر ایک بہت اچھا مضمون لکھا ہے۔ سب مجھے یہاں عکاظ کی علمی سرگرمیوں کی تفصیل کی ضرورت نہیں۔ یہاں اس قدر کافی ہے کہ اس ادارے کا صرف نام لے لیا جائے، جس نے عربی زبان کو معیاری بنانے کے لئے اتنا نمایاں حصہ لیا ہے۔

غیلان بن سلمہ ثقفی کے متعلق بیان کیا جاتا ہے[۱] کہ وہ ہفتے میں ایک دن علمی جلسہ منعقد کرتا جس میں نظمیں پڑھی جاتیں، اور ان پر تنقید ہوتی۔ ہفتے کے باقی دنوں میں وہ کسی دن عدل گستری کا کام انجام دیتا اور کسی دن دوسرے فرائض میں مشغول ہوتا۔ اس واقعے سے معلوم ہوسکتا ہے، کہ جاہلیت میں طائف والوں کا علمی ذوق بھی کتنا بلند تھا!

اس زمانے میں مکے کی علم دوستی اس سے بھی کچھ زیادہ ہی بلند تھی۔ سبع معلقات مکے ہی کے معبد کعبے میں لٹکائے جاتے رہے، اور اسی اعزاز و امتیاز نے ان سات نظموں کو عربی ادبیات میں ایک لافانی زندگی عطا کردی ہے!

ورقہ بن نوفل مکے کا ایک باشندہ تھا۔ اس نے زمانۂ جاہلیت میں توریت اور انجیل کو عربی میں منتقل کیا تھا۔

---

[۱] الازمنہ والامکنہ، مولفہ مرزوقی جلد ۲ [illegible] نیز معارف ابن قتیبہ بر موقع۔

غالباً یہ مکے والے ہی تھے جنھوں نے عربی زبان کو سب سے پہلے ایک تحریری زبان کی حیثیت عطا کی تھی[۹]. غالباً یہی وجہ تھی کہ یہاں کے اجڈ سپاہی بھی لکھے پڑھے ہوا کرتے تھے - اس کی مزید تفصیل آگے آئیگی -

قصہ نویسی ، ناول اور ڈرامہ زمانۂ حال میں ادبیات میں بہت بڑی اہمیت رکھتے ہیں . مکے والوں کو بھی اس کا بڑا ذوق تھا . چنانچہ چاندنی راتوں میں خاندانی اجتماع گاہوں پر یا شہر کے مرکزی دارالندوہ میں یہ لوگ جمع ہوتے ، اور پیشہ ور قصہ گو وغیرہ وہاں برجستہ یا سنے ہوئے قصے بیان کرکے دلچسپی کا سامان مہیا کرتے ، اس کے کچھ حوالے باب " شہری مملکت مکہ " میں اوپر ملیں گے - اصطلاحاً یہ سامرہ کہلاتا .

ادبی ذوق جاہلیت میں صرف عربوں ہی میں نہ تھا ، بلکہ عرب میں رہنے والی دوسری قوموں میں بھی اس کا پتہ چلتا ہے . چنانچہ یہودی سموأل بن عادیا اور دیگر یہودی اور نصرانی شعراء کے دیوان بھی پائے جاتے تھے . مدینہ منورہ کے یہودیوں نے ایک بیت المدراس قائم کر رکھا تھا ، جو نیم عدالتی اور نیم تعلیمی ادارہ ہوا کرتا تھا . اور اسلام کے آغاز تک اس کا پتہ چلتا ہے (دیکھئے سیرۃ ابن ہشام میں غزوۂ بنی قینقاع وغیرہ)

زمانۂ جاہلیت میں عربی زبان میں لکھنے پڑھنے کی چیزوں کے لئے بڑی

---

۹. فہرست ابن ندیم ص۵ نیز کتاب الخراج مؤلفہ قدامہ بن جعفر کا ٹکڑا جو آکسفرڈ میں ہے (گو غلطی سے ... کی طرف منسوب ہے)

کثرت سے الفاظ ملتے ہیں، چنانچہ صرف قرآن مجید میں ہی حسب ذیل الفاظ کا ذکر ہے :-

رق اور قرطاس (کاغذ کے لئے) قلم، نون (دوات)، نستنسخ، مرقوم مسطور، مستطر، مکتوب، تخطہ، تملّی، تملل (لکھنے کے معنی میں جو مختلف افعال پائے جاتے ہیں، یہ ان کے صیغے ہیں) سفرہ، کاتب، مداد (سیاہی) اسفار، زبر، کتب، صحف (کتابوں اور تحریری چیزوں کے معنوں ہیں) وغیرہ -

عہد نبوی میں تبلیغی اور دیگر خطوط سینکڑوں کی تعداد میں عرب کے طول و عرض کے قبائل کے نام جاتے رہے (میری الوثائق السیاسیۃ ملاحظہ ہو) - اس سے بہ آسانی اس کا ثبوت مل جاتا ہے کہ لکھنا پڑھنا عرب کے ہر حصہ میں رائج تھا -

غرض ان اور اسی طرح کی مماثل بنیادوں پر علوم و فنون کی وہ بلند عمارتیں بعد میں زمانۂ اسلام کے عربوں نے کھڑی کیں، جن پر آج پورے کرۂ ارض کی علمی دنیا فخر کر سکتی ہے -

قبل ہجرت اسلام

یہ چیز عام طور سے معلوم ہے کہ اسلام کا آغاز اس وقت سے ہوا جب حضرت محمد صلعم پر چالیس سال کی عمر میں وحی اتری - اس بات کا کوئی پتہ نہیں چلتا، کہ نو عمری میں آپ نے لکھنے اور پڑھنے کے فن

میں حصہ لیا ہو۔ آپ عمر بھر اُمی ہی رہے۔ اس کے باوجود یہ کس قدر اثر انگیز واقعہ ہے، کہ خدا کے پاس سے آپ کو جو سب سے پہلی وحی آئی اس میں آپ کو اور آپ کے متبعین کو حکم تھا کہ "اقرء" یعنی پڑھ، اور قلم کی ان الفاظ میں تعریف کی گئی تھی، کہ جملہ انسانی علم اسی سے ہے ا:-

"پڑھ اپنے رب کے نام سے جو خالق ہے، جس نے انسان کو ایک جمے ہوئے قطرۂ خون سے پیدا کیا۔ پڑھ یہ تیرا بزرگ رب ہی ہے، جس نے قلم کے ذریعے سے تعلیم دی اور انسان کو وہ چیز بتائی، جسے وہ نہیں جانتا تھا۔"

(قرآن مجید سورہ ۹۶۔ آیۃ ۱ تا ۴)

ایک حدیث میں رسول کریم صلعم نے بیان فرمایا ہے کہ خدا نے سب سے پہلے قلم ہی کو پیدا کیا[۵۹]

سہولت کے لئے ہم بھی وہی مشہور تقسیم اختیار کر سکتے ہیں، جو قبل ہجرت و بعد ہجرت کے نام سے رسول کریم صلعم کی زندگی کے متعلق استعمال کی گئی ہے۔ اور اسی تقسیم سے وہ زمانے بھی متعین ہو جاتے ہیں، جب آپ کے ہاتھ میں دنیاوی اقتدار تھا یا نہ تھا۔

یہ امر نمایاں کئے جانے کے قابل ہے کہ قریب قریب وہ تمام آیتیں جن میں لکھنے پڑھنے یا علم سیکھنے کا ذکر ہے، وہ مکی آیتیں ہیں، اس کے برخلاف

---

۵۹ ترمذی ۴۴/۲۹۔ ابو داؤد ۳۹/۱۹، ابن حنبل جلد (۵) ص ۳۱۷، طیالسی ص ۵۷۷۔

مدنی آیتوں میں کام کرنے اور تعمیل کرنے پر زیادہ زور دیا گیا ہے، چنانچہ:-

(۱) کیا وہ لوگ جو جانتے ہیں، اور جو نہیں جانتے، برابر ہو سکتے ہیں؟
(قرآن مجید ۳۹/۹)

(۲) تم کو علم سے تھوڑی مقدار دی گئی ہے۔ (" ۱۷/۸۵)

(۳) اللہ سے اس کے بندوں میں صرف عالم ہی ڈرتے ہیں (" ۳۵/۲۸)

(۴) اور کہہ میرے آقا مجھے علم میں زیادتی عطا کر (" ۲۰/۱۱۴)

(۵) تمھیں وہ چیز سکھائی گئی، جو نہ تم جانتے تھے، اور نہ تمھارے آباؤ اجداد
(قرآن مجید ۶/۹۱)

(۶) اگر زمین کے تمام درخت قلم بن جائیں، اور سمندر سات دیگر سمندروں کے ساتھ سیاہی بن جائے تو بھی خدا کے کلمات ختم نہ ہو سکیں (قرآن مجید ۳۱/۲۷)

(۷) قسم ہے پہاڑ کی، اور قسم ہے ایک کتاب کی جو لکھی ہوئی ہے ایک جھلی پر جو پھیلائی گئی ہے۔ (قرآن مجید ۵۲/۱تا۴)

(۸) قسم ہے دوات کی اور قلم کی اور اس چیز کی جو تم لکھتے ہو (" ۶۸/۱)

(۹) اگر ہم نے تجھ پر ایک واقعی تحریری چیز کاغذ پر لکھی ہوئی بھیجی ہوتی۔
(قرآن مجید ۶/۷)

(۱۰) اگر تمھیں معلوم نہ ہو، تو یاد رکھنے والوں سے پوچھ لو (" ۱۶/۴۳)

یہ تمام مکی آیتیں ہیں۔

کسی قوم میں کسی پیغمبر کا مبعوث ہونا تعلیم کے سوا کسی اور غرض کے لئے نہیں ہوتا۔ چنانچہ ہمیں حیرت نہ ہو کہ ایک حدیث میں رسول کریم صلعم

نے فرمایا ہے کہ میں ایک معلم بناکر بھیجا گیا ہوں[۵۸]

اس کی تائید قرآنی آیتوں سے بھی ہوتی ہے، چنانچہ فرمایا ہے:-

۱۔ (ابراہیم اور اسماعیل نے دعا کی) اے ہمارے آقا ان کے پاس انھی میں کا ایک رسول بھیج، جو انھیں تیری آیتیں سنائے اور انھیں کتاب و حکمت کی تعلیم دے، اور ان کا تزکیہ کرے، تو ہی طاقتور اور عقلمند ہے۔ (قرآن مجید ۲/۱۲۹)

۲۔ وہی ہے جس نے اُمیوں میں انہیں میں کا ایک رسول بھیجا تاکہ انھیں اس کی "آیتیں سنائے" ان کا تزکیہ کرے اور انھیں کتاب و حکمت کی تعلیم دے، اگرچہ اس سے پہلے وہ فاش گمراہی میں مبتلا تھے۔ (ایضاً ۶۲/۲)

۳۔ بیشک خدا نے ایمان والوں پر مہربانی کی جب اس نے ان کے پاس انہیں میں کا ایک رسول بھیجا، جو انھیں اس کی آیتیں سناتا ہے، ان کا تزکیہ کرتا ہے اور انھیں کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے اگرچہ اس سے پہلے وہ فاش گمراہی میں مبتلا تھے (ایضاً ۳/۱۶۴)

حقیقت میں تبلیغ اور تعلیم ایک ہی چیز ہیں، خاص کر ایسے شخص کے لئے جو مذہب و سیاست کو بالکل ایک دوسرے سے الگ اور آزاد چیزیں نہ سمجھتا ہو، اور جس کا مطمح نظر یہ ہو کہ:-

---

۵۸ ابن عبدالبر کی مختصر جامع بیان العلم ص ۲۵۔ نیز ابن ماجہ باب فضل العلماء۔

اے ہمارے رب! ہمیں اس دنیا میں بھی بھلائی عطا کر اور آخرت میں بھی اور ہمیں آگ کے عذاب سے بچا۔ (قرآن مجید ۲-۲۰۱)

بیعتِ عقبہ ثانیہ جیسے ابتدائی زمانے میں، جو ہجرت سے بھی دو سال پہلے منعقد ہوئی تھی، کوئی ایک درجن مدینے والوں نے اسلام قبول کیا تھا، تو ان کی خواہش پر رسول کریم صلعم نے ان کے ساتھ کے سے ایک تربیت یافتہ معلم[۵۱] روانہ کر دیا تھا جو انھیں قرآن مجید کی تعلیم دے سکے، اور دینیات اسلام سے واقف کرا سکے۔ بے شبہہ اس ابتدائی زمانے میں تعلیم سے مراد صرف مبادئ دین اور عبادت کے طریقوں کی تعلیم ہی ہو سکتی تھی۔

زمانہ قبل ہجرت کی سب سے اہم چیز جو اس سلسلے میں بیان کی جا سکتی ہے، یہ تھی کہ آنحضرت صلعم نے کاتبوں کو مقرر کر رکھا تھا، جن کا کام یہ تھا کہ جیسے جیسے وحی نازل ہوتی جائے۔ اس کو لکھ لیں، اور اس کی نقلیں کریں۔ چنانچہ تاریخ بتاتی ہے کہ جب حضرت عمرؓ اسلام لانے لگے، تو انھیں قرآن مجید کی چند صورتیں اپنی بہن کے گھر میں لکھی ہوئی ملی تھیں، اور بظاہر ان کی بہن بھی پڑھنا جانتی تھیں۔

اس سلسلے میں سب سے آخر میں حضرت موسیٰؑ کے قصے کی طرف اشارہ کرنا چاہتا ہوں جو قرآن شریف کی ایک کی صورت (کہف) میں مذکور ہے، کہ کس طرح وہ طلب علم کے لئے گھر سے نکلے، سفر کی صعوبتیں برداشت

---

۵۱ سیرت ابن ہشام صـ ۲۸۹

کیں، اور دل دہلانے والے تجربے حاصل کیے۔ اس قصے کا ماحصل یہ ہے کہ کوئی شخص کتنا ہی بڑا عالم ہو جائے، ہر چیز نہیں جان سکتا، اور یہ کہ علم میں زیادتی کی خواہش ہو تو بیرونی ممالک کا سفر ناگزیر ہے[۹]

بعد ہجرت

ہمارے پاس بعد ہجرت زمانے کے متعلق جو مواد ہے، اس کو سنہ وار ترتیب کی جگہ فن وار مرتب کرنا زیادہ سہولت بخش ہوگا، مثلاً درسوں کا انتظام، امتحانات، اقامت خانے، ابتدائی تعلیم اور لکھنا پڑھنا سکھانے کا بندوبست، اجنبی زبانوں کی تعلیم، نصاب تعلیم، عورتوں کی تعلیم، صوبہ جات میں تعلیمی انتظام، صوبہ جات میں دورہ اور تفتیش کرنے والے افسر وغیرہ۔

ہم ابھی اوپر بیان کر چکے ہیں کہ رسول کریم صلعم نے ہجرت سے بھی پہلے ایک معلم کو مدینہ منورہ روانہ کیا تھا جس کے کارنامے تاریخ نے محفوظ رکھے ہیں۔ جب ہجرت کے بعد رسول کریم صلعم خود مدینہ منورہ پہنچے تو بیشمار اور بیچیدہ اہم جنگی اور سیاسی مصروفیتوں کے باوجود آپ اس کے لئے وقت نکال لیا کرتے تھے کہ مدینۂ منورہ سے ناخواندگی کو دور کرنے کے کام کی شخصی طور سے نگرانی کر سکیں۔ چنانچہ اس سلسلے میں آپ نے سعید بن العاص رض کا تقرر

سلہ ۹ طلب علم کے لیے سفر کے سلسلے میں دیکھئے مقدمۂ ابن خلدون، ص ۴۲۶

کیا تھا، کہ لوگوں کو لکھنے اور پڑھنے کی تعلیم دیں، یہ بہت خوشنویس بھی تھے[۹۱]
ایک دوسرے راوی کے الفاظ میں ان کو "معلم حکمت" بنایا گیا تھا[۹۲] جس سے
لکھنے پڑھنے کو جو عظیم اہمیت دی جاتی ہے اس کا اندازہ ہو سکتا ہے۔
رسول کریم صلعم کو خواندگی سے اتنی دلچسپی تھی، کہ ہجرت کے ڈیڑھ ہی سال
بعد جب ساٹھ ستر کے والے جنگ بدر میں گرفتار ہو کر مدینہ لائے گئے تو آپ
نے ان لوگوں کا جو مالدار نہ تھے، ان کی رہائی کے لئے یہ فدیہ مقرر کیا تھا کہ
مدینے کے دس دس بچوں کو لکھنا سکھائیں[۹۳]۔ حضرت عبادہؓ ابن الصامتؓ
کہتے ہیں، کہ رسول کریم صلعم نے مجھے صفے میں اس غرض سے مامور کیا تھا،
کہ لوگوں کو لکھنے کی اور قرآن مجید کی تعلیم دوں[۹۴]۔

صفے سے مراد مکان کا صحن حصہ ہوتا ہے، مسجد نبوی میں ایک
احاطہ تھا جو اس غرض کے لئے مختص کر دیا گیا تھا کہ باہر سے تعلیم کے لئے
آنے والوں بلکہ خود مقامی بے گھر طالب علموں کے لئے دارالاقامہ کا بھی
کام دیتا اور مدرسے کو بھی۔ اس اقامتی درسگاہ میں لکھنے پڑھنے کے علاوہ
فقہ کی تعلیم دی جاتی[۹۵]، قرآن مجید کی سورتیں زبانی یاد کرائی جاتی تھیں، فن

۹۱۔ استیعاب ابن عبدالبر صفحہ ۴۹۳، نیز نظام الحکومۃ النبویہ مولفہ کتانی ۱/۴۸ بحوالہ ابوداؤد

۹۲۔ کتاب المحبر مولفہ ابن حبیب ورق ۱۵۹ الف

۹۳۔ ابن سعد ۲/۱ صفحہ ۱۴، سہیلی ۲/۹۲، مسند ابن حنبل ۱/۲۴۷، کتانی کتاب مذکور ۱/۴۸

۹۴۔ کتانی ۱/۴۸ بحوالہ ابوداؤد، کتاب البیوع باب کسب المعلم وغیرہ

تجوید سکھایا جاتا تھا اور دیگر اسلامی علوم کی تعلیم کا بندوبست تھا جس کی نگرانی خود رسول کریم صلعم شخصی طور سے فرمایا کرتے تھے، اور وہاں رہنے والوں کی غذا وغیرہ کا بھی بندوبست کیا کرتے تھے۔ یہ طلبہ اپنی فرصت کے گھنٹوں میں طلب روزگار میں بھی مصروف ہوا کرتے تھے۔[۱]

درس گاہ صفہ میں نہ صرف مقیم طلبہ کی تعلیم کا انتظام تھا بلکہ ایسے بھی بہت سے لوگ آتے تھے، جن کے مدینے میں گھر تھے، اور وہ صرف درس کے لئے وہاں حاضر ہوا کرتے تھے۔ وقتاً فوقتاً عارضی طور سے درس گاہ میں شریک ہونے والوں کی بھی کمی نہ تھی۔ مقیم طلبہ کی تعداد گھٹتی بڑھتی رہتی تھی اور ایک بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک وقت ان کی تعداد ستر بھی تھی۔[۲]

مقامی طلبہ کے علاوہ دور دراز کے قبائل سے بھی طلبہ آتے، اور اپنا ضروری نصاب تکمیل کر کے اپنے وطنوں کو واپس ہو جاتے تھے۔[۳]

رسول کریم صلعم اکثر اپنے کسی تربیت یافتہ صحابی کو قبائلی وفود کے

---

[۱] بخاری باب سریہ بیر معونہ،

[۲] مسند احمد بن حنبل جلد ۳ صفحہ ۱۳۷

[۳] بخاری باب رحمۃ الناس والبہائم نیز تفسیر طبری کی جلد (۱۱) صفحہ ۴۸ نیز تفسیر خازن میں سورہ (۹) آیت ۱۲۲ کی تفسیر بیان، قرآن مجید میں حکم ہے کہ ہر جماعت میں سے کچھ لوگ جائیں، بلکہ چند لوگ تعلیم حاصل کر کے اپنی قوم کو تعلیم دیں ... جامع بیان العلم صفحہ ۲۰ تا ۲۱

ساتھ ان کے مسکنوں کو روانہ کر دیتے، تاکہ وہ اس علاقے میں دینیات کی تعلیم کا بندوبست کریں، جس کے بعد وہ مدینہ واپس آجاتے [۹۳]

ہجرت کے ابتدائی سالوں میں معلوم ہوتا ہے، کہ رسول کریم صلعم کی مستقل سیاست تھی کہ جب مدینے کے باہر کے لوگ مسلمان ہوتے، تو ان کو حکم دیا جاتا کہ ترک وطن کر کے مرکز اسلام کے قریب آبسیں [۹۴] جہاں بعض وقت ان کو اپنی نوآبادی بسانے کے لئے سرکاری زمینیں بھی دی جاتیں [۹۵]

ترک وطن کے اس حکم میں فوجی، سیاسی اور تمدنی جو اغراض پوشیدہ تھے، دو ظاہر ہیں۔ ابن سعد [۹۶] نے بیان کیا ہے کہ ایک مرتبہ آنحضرت صلعم نے ایک قبیلے میں جو نیا نیا مسلمان ہوا تھا، ایک معلم روانہ کیا، معلموں کو ہجرت کے متعلق جو عام ہدایتیں تھیں، اس کی انھوں نے لفظی تعمیل کی، اور کہنا شروع کیا کہ جو ہجرت نہ کرے، وہ مسلمان ہی نہیں سمجھا جائے گا۔ قبیلے والے پریشان ہوگئے کہ وہ کھیتی دار تھے۔ انھوں نے اپنا ایک وفد مدینہ روانہ کیا، تاکہ براہ راست جناب رسول اکرم صلعم سے معلوم کریں، کہ ہجرت کے حکم کا کیا منشا ہے؟ اور یہ عرض کریں کہ انھیں اپنا وطن چھوڑنے میں کس قدر عظیم معاشی

۹۳۔ کتانی کی نظام الحکومۃ النبویہ جلد ۱ ص ۴۳ و ما بعد

۹۴۔ دیکھئے باب ہجرت یا نوآبادکاری۔

۹۵۔ ابوداؤد جلد ۲ ص ۴۳ وغیرہ

۹۶۔ طبقات ابن سعد باب الوفود۔

نقصان ہے ۔ رسول کریم صلعم نے ان کی مشکلات کو سن کر انھیں اجازت دی کہ وہ اپنے وطن ہی میں رہیں ، اور ان کے ساتھ ویسا سلوک ملحوظ رکھا جائے گا ، جو اسلامی سرزمین میں ہجرت کرانے والوں کے ساتھ رکھا جاتا تھا ۔

مدنی زندگی میں رسول کریم صلعم کی یہ مستقل سیاست تھی ، کہ قبائل میں تعلیم و تربیت کے لئے معلم روانہ کریں ، بیر معونہ کے مشہور واقعے میں ستر قاریان قرآن بھیجے گئے تھے ، جس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے ، کہ انھیں نجد کے ایک آباد علاقے میں اور کثیر قبائل میں کام کرنا تھا ۔

قبائلی نمائندوں کا تعلیم کی غرض سے مدینہ آنا بھی کوئی شاذ و نادر واقعہ نہ تھا[۵۹] اور جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ، ایسے لوگوں کے قیام و طعام اور تعلیم و تربیت کی رسول کریم صلعم خود شخصی طور سے نگرانی فرماتے تھے ۔ اور یہ لوگ عموماً صُفّے میں ٹھیرائے جاتے تھے ۔

مدینہ منورہ میں صفہ واحد درسگاہ نہ تھی ، بلکہ یہاں کم از کم نو مسجدیں خود عہد نبوی میں تھیں[۶۰] اور اس میں کوئی شبہہ نہیں ہے ، کہ ہر مسجد اپنے آس پاس کے محلے والوں کے لئے درسگاہ کا بھی کام دیتی تھی ، خاص کر بچے وہاں پڑھنے آیا کرتے تھے ۔ قبا ، مدینہ منورہ کے جنوب میں مسجد نبوی سے کوئی دو ڈھائی میل پر واقع [illegible] بیان کیا جاتا ہے کہ وقتاً فوقتاً رسول کریم صلعم

---

۵۹ [illegible] تفصیل اوپر آچکی ہے

۶۰ [illegible] کتاب المساجد [illegible] یا شرح بخاری جلد ۲ صفحہ [illegible]

وہاں تشریف لیجاتے، اور وہاں کی مسجد کے مدرسے کی شخصی طور سے نگرانی فرماتے[۹۱] بعض احادیث میں رسولِ کریم صلعم کے عام حکم ان لوگوں کے متعلق محفوظ ہیں، جو اپنے محلے کی مسجد کے مدرسے میں تعلیم پاتے تھے[۹۲] آنحضرت صلعم نے یہ بھی احکام صادر کئے تھے، کہ لوگ اپنے ہمسایوں سے تعلیم حاصل کیا کریں[۹۳]

ایک دلچسپ واقعہ حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ نے بیان کیا ہے[۹۴] کہ ایک دن جب رسولِ کریم صلعم مسجدِ نبوی میں داخل ہوئے، تو دیکھا کہ وہاں دو قسم کے لوگ موجود ہیں، کچھ لوگ نوافل اور خدا کی عبادت میں مشغول تھے اور کچھ لوگ فقہ کی تعلیم و تعلم میں منہمک۔ آنحضرت صلعم نے ارشاد فرمایا کہ دونوں ہی لوگ اچھا کام کر رہے ہیں، البتہ ایک کا کام زیادہ اچھا ہے۔ جو لوگ خدا سے کچھ مانگ رہے ہیں، ان کے متعلق خدا کی مرضی ہے، کہ چاہے تو دے چاہے تو نہ دے، البتہ دوسری قسم کے لوگ وہ ہیں جو علم حاصل کر رہے ہیں، اور جہالت کو دور کر رہے ہیں، سچ تو یہ ہے کہ خود میں بھی معلم ہی بنا کر بھیجا گیا ہوں ——— یہ کہتے ہوئے آپ نے اس حلقے میں

---

۹۱ ابن عبد البر کی کتاب العلم ص ۹۷۔

۹۲ ابن عبد البر کی کتاب العلم ص ۱۴۔

۹۳ کتانی کی نظام الحکومۃ النبویہ جلد ۱ ص ۴۲ نیز صحیح بخاری المدارس النبوی بیان حضرت عمرؓ

۹۴ ابن عبد البر کی کتاب العلم ص ۱۵ نیز دیگر کتب حدیث۔

اپنے لئے جگہ بنائی جہاں درس ہو رہا تھا۔

یہاں اس مشہور اور اکثر حوالہ دیا جانے والی حدیث کا ذکر کیا جا سکتا ہے کہ شیطان پر ایک عالم، ایک ہزار عابدوں سے زیادہ سخت گزرتا ہے[۵۱]۔

رسول کریم صلعم خود بھی شخصی طور سے اعلیٰ تعلیم دیا کرتے تھے۔ حضرت عمرؓ وغیرہ بڑے صحابہ ان درسوں میں شریک رہا کرتے تھے، جہاں قرآن وغیرہ کی تعلیم دی جاتی تھی۔ آنحضرت صلعم مسجد نبوی کے حلقہائے درس کا اکثر معائنہ کیا کرتے تھے۔ اگر وہاں کوئی بے عنوانی نظر آتی، تو فوراً تدارک فرمایا کرتے، چنانچہ ترمذی میں ہے[۵۲] کہ ایک مرتبہ مسجد نبوی میں رسول کریم صلعم نے قضا و قدر کے متعلق کچھ مباحثہ ہوتے سنا۔ آپ اپنے حجرے سے باہر آگئے۔ مارے غصے کے آپ کا چہرہ تمتما رہا تھا۔ اور راوی کے الفاظ میں، ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ انار کا رس آپ کے رخساروں اور پیشانی پر نچوڑ دیا گیا ہے۔ آپ نے اس موضوع پر بحث مباحثے سے منع کر دیا اور ارشاد فرمایا کہ بہت سی گزشتہ امتیں اسی مسئلے میں اُلجھ کر گمراہ ہو گئی تھیں۔

یہ رسول کریم صلعم کی ایک طے شدہ سیاست تھی، کہ صرف وہی لوگ قوم کی سیادت، سرداری اور رہنمائی کریں اور نتیجۃً مسجدوں میں امام بنیں جو قرآن مجید اور سنت کے زیادہ سے زیادہ ماہر ہوں،

---

۵۱ سیوطی کی جمع الجوامع تحت عنوان "عالم وفقیہ" بحوالہ بخاری و دیلمی، نیز ترمذی، باب العلم۔

۵۲ شمائل ترمذی بہ موقع۔

جیسا کہ صحیح مسلم میں بیان کیا گیا ہے۔

یہ کوششیں بیکار نہ گئیں، اور خواندگی میں اس قدر تیزی سے ترقی ہوئی کہ ہجرت کو چند ہی دن گذرے تھے، کہ قرآن مجید نے حکم دیا کہ ہر وہ تجارتی معاملہ جس میں رقم اودھار ہو، صرف تحریری طور سے انجام پائے، اور ایسی دستاویز پر کم از کم دو اشخاص کی گواہی لی جایا کرے۔ اس کا منشاء قرآن کے الفاظ میں یہ تھا کہ اس طرح کی تحریری گواہی "خدا کے نزدیک زیادہ منصفانہ ہے، اور شہادت کے اغراض کے لئے زیادہ مستحکم وسیلہ ہے، اور شبہات پیدا ہونے کی صورت میں رفع شک کا بہترین ذریعہ ہے۔"[۵۱]

مدینے میں خواندگی کی کثرت ہو جانے کے باعث اس حکم سے کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔ اور ظاہر ہے کہ ملک میں خواندگی کی وسعت کے بغیر ایسا حکم نہیں دیا جا سکتا تھا، گو اس میں شک نہیں کہ پیشہ ور کا تبوں کا بھی اس زمانے میں پتہ چلتا ہے۔[۵۲]

ہجرت کے بعد سے ہی سیاسی معاہدات، سرکاری خط و کتابت، ہر فوجی مہم میں جانے والے رضاکاروں کے ناموں کی فہرستیں[۵۳]، مختلف مقامات مثلاً مکہ، نجد، خیبر اوطاس وغیرہ میں خفیہ نامہ نگار[۵۴] جو عموماً تحریری طور سے

---

۵۱ قرآن مجید $\frac{۲}{۲۸۲}$

۵۲ کتانی کی نظام الحکومۃ النبویہ، $\frac{۱}{۲۷۵}$ تا ۲۷۷۔

۵۳ کتانی کتاب مذکورہ جلد ا صـ۲۲۱ بحوالہ صحیح مسلم

۵۴ کتانی $\frac{۱}{۳۶۲}$ تا ۳۶۳ اگرچہ مولانا سلیمان ندوی کے خیال میں (باقی نوٹ صـ۲۱۷ پر)

آنحضرت صلعم کو اپنے مقام کے حالات سے اطلاع دیا کرتے تھے، نیز مردم[۵۱] شماری اور اسی طرح کی بہت سی چیزیں اس بات میں ممد و معاون ہوئیں، کہ خوانندگی روز بروز بڑھتی ہی جائے۔ تاریخ نے رسول کریم صلعم کے کوئی ڈھائی تین سو خطوط محفوظ رکھے ہیں[۵۲]۔ صحیح تعداد اس سے بہت زیادہ ہونی چاہیئے، کیونکہ آنحضرت صلعم کی حکومت دس لاکھ مربع میل کے علاقے پر چلتی تھی، اور دس سال تک حکمرانی کے فرائض آپ کو انجام دینے پڑے تھے۔

عرب میں خطوط پر مہر کرنے کا رواج سب سے پہلے جناب رسالت صلعم ہی سے شروع ہوا[۵۳]۔ آپ کو خط کی صفائی اور وضاحت کا جس قدر لحاظ رہتا تھا، اس کا اندازہ ان چند احادیث سے ایک حد تک ہو سکتا ہے جن میں آپ نے ارشاد فرمایا ہے، کہ کاغذ کو موڑنے سے پہلے اس کی سیاہی کو ریگ ڈالکر خشک کر لو[۵۴]، یا یہ کہ حرف "س" کے تینوں شوشے برابر دیا کرو اور اس کو بغیر شوشوں کے نہ لکھا کرو[۵۵]، یعنی (ٮ)، غالباً یہ حکم

(بقیہ نوٹ ص ۲۱۶) خفیہ نامہ نگار کی اصطلاح صحیح نہیں بلکہ ممکن ہے کسی نے اتفاقاً کوئی اطلاع بھیج دی ہو لیکن کتانی کا یہ بیان متعدد اور صریح تذکروں پر مبنی ہے)

۵۱ صحیح بخاری ۱۸۱/۱ کے مطابق ایک مرتبہ مسلم شماری کی فہرستوں سے پندرہ سو اندراجات شہر مدینہ میں ہونے معلوم ہوئے تھے، جو ظاہر ہے کہ ابتدائے ہجرت کا زمانہ ہوگا۔

۵۲ اس پر جدید ترین تالیف الوثائق السیاسیہ کے نام سے میں نے شائع کی ہے۔

۵۳ کتانی [illegible] فتوح البلدان مؤلفہ بلاذری باب الخاتم۔ ۵۴ کتانی [illegible] ۵۵ ایضاً [illegible]

اس لئے تھا کہ شور شئے نہ زنیا احتیاط پسندی کے فقدان اور سستی پر دلالت کرتا ہے، یا یہ کہ لکھتے ہوئے اگر کچھ رکنا پڑے تو کاتب کو چاہیئے کہ قلم اپنے کان پر رکھ لے، کیونکہ اس سے لکھوانے والے کی زیادہ آسانی سے یاددہانی ہوجاتی ہے[۹۱] بولنے میں ذہن منتشر ہو جاتا ہے۔

عہد نبوی ہی میں یک فنی ذوق یا تخصص بھی ترقی کر گیا تھا اور خود جناب رسالت مآب صلعم اس کی حوصلہ افزائی فرمایا کرتے تھے۔ چنانچہ آپ فرمایا کرتے تھے، کہ جس کو قرآن سیکھنا ہو، وہ فلاں صحابی کے پاس جائے، جس کو تجوید یا تقسیم ترکہ کا حساب سیکھنا ہو، وہ فلاں کے پاس جائے وغیرہ[۹۲]۔

متعدد حدیثوں میں معلموں کو معاوضہ قبول کرنے کی ممانعت کی گئی ہے[۹۳]۔ عبادہ بن صامت رض کی روایت ہے، کہ وہ درس گاہ صفہ میں قرآن اور فن تحریر کی تعلیم دیتے تھے۔ ایک مرتبہ ایک شاگرد نے انھیں ایک کمان نذر کی، مگر رسول کریم صلعم نے انھیں اس کے قبول کرنے سے روک دیا[۹۴]۔

ایک مملکت کے حاکم اعلیٰ کی حیثیت سے جناب رسالت مآب صلعم کو

---

۹۱ کتانی ۱۲۵/۱ و ما بعد، (اگرچہ اوپر کی تینوں باتیں مجھے صحیح حدیثوں میں نہیں ملیں لیکن یہ ناممکن یا غیر معقول چیزیں نہیں ہیں)

۹۲ طبقات ابن سعد ۲/۲

۹۳ سیوطی کی جمع الجوامع تحت عنوان "علم" بحوالہ طبرانی نیز بخاری ۲۷/۱۴ ابوداؤد ۲۲/۲۳

۹۴ ابو داؤد جلد ۲ صفحہ ۱۲۹، اس کا ذکر شبلی کی سیرۃ النبی طباعت دوم، جلد ۲ صفحہ ۹۸ میں بھی ہے۔

مترجمین کی بھی ضرورت ہوا کرتی تھی، جو غیر زبانیں جانتے ہوں۔ چنانچہ حضرت زید بن ثابت رضؓ جو دربار رسالت کے میر منشی کہے جا سکتے ہیں، فارسی، حبشی، عبرانی اور رومی (یونانی) جانتے تھے[۵۰] آنحضرت صلعم نے ایک مرتبہ ان کو حکم دیا تھا کہ وہ عبرانی خط لکھنا اور پڑھنا بھی سیکھ لیں، اور چند ہفتوں میں وہ اس میں طاق ہو گئے تھے[۵۱] چنانچہ یہودیوں کو اگر کوئی خط بھیجا جاتا یا ان کے پاس سے کوئی خط آتا، تو حضرت زید بن ثابت رضؓ اس کو لکھ یا پڑھ لیا کرتے تھے۔ حضرت عبداللہ بن الزبیر کے متعلق بھی مشہور ہے کثیر زبانیں جانتے تھے۔ معلوم نہیں مبالغہ ہے یا واقعہ کہ ان کے پاس ایک سو غلام ایسے تھے جن میں سے ہر ایک کی بولی الگ الگ تھی اور حضرت عبداللہ ان میں سے ہر ایک سے اسی کی زبان میں گفتگو کیا کرتے تھے[۵۲]

نصاب کا مسئلہ ایسا ہے کہ اس پر پوری صحت کے ساتھ بیان کرنا دشواری سے خالی نہیں۔ ہمارے پاس جو مختصر و محدود مواد ہے، اس سے پتہ چلتا ہے کہ ہر جگہ ایک ہی نصاب جاری نہ تھا۔ معینہ کتب کو پڑھانے کی جگہ معینہ معلم کے پاس لوگ جاتے، اور وہ جو پڑھا سکتا، اس سے پڑھتے۔ بہرحال اتنا معلوم ہوتا ہے، کہ قرآن و سنت کے ہمہ گیر نصاب کے علاوہ آنحضرت صلعم

---

[۵۰] کتانی ج ۱/۲ بحوالہ العقد الفرید مؤلفہ ابن عبد ربہ وغیرہ۔

[۵۱] ایضاً ۱/۲۰۲ بحوالہ بخاری وغیرہ۔

[۵۲] کتانی ج ۱/۲ (بحوالہ مرآۃ الزمان لسبط ابن الجوزی تاریخ الخلفاء للسیوطی ص ۱۳۰)

نے حکم دیا تھا کہ نشانہ بازی[۹۱]، پیراکی[۹۲]، تقسیم ترکہ کی ریاضی[۹۳]، مبادی طب[۹۴]، علم ہیئت[۹۵] علم انساب[۹۶] اور علم تجوید[۹۷] قرآن کی تعلیم دی جایا کرے۔ ایک حدیث میں یہ بھی حکم ہے کہ استاد کی عزت کی جائے[۹۸] علم تعبیر عمل کے لیے سود مند ہے، وغیرہ۔

مکے کے باشندوں کو زبان کی صفائی کا بیحد لحاظ رہتا تھا، اور وہ یہ بھی چاہتے تھے، کہ ان کے بچے صحرا کی آزاد زندگی میں پرورش پائیں، اور مکے کی رنگا رنگ کی آبادی میں مل کر متاثر نہ ہوں۔ اسی لیئے وہ اپنے نوزائیدہ بچوں کو مختلف قبائل میں بھیج دیتے تھے، جہاں وہ کئی سال رہ کر والدین کے پاس واپس آتے۔ خود رسول کریم صلعم کو بھی اس سے سابقہ رہا تھا، اور آئندہ زندگی میں آپ اُسے یاد کیا کرتے تھے۔ کہتے ہیں، کہ معزز زین مکہ میں اس کا رواج آج چودھویں صدی ہجری کے وسط میں بھی چلا آتا ہے۔

---

۹۱ جمع الجوامع مؤلفہ سیوطی تحت عنوان "علّموا" بحوالہ ابن مندہ، ابونعیم و دیلمی نیز تحت تعلموا

۹۲ ایضاً تحت عنوان "علموا" بحوالہ ابونعیم و ابن مندہ

۹۳ ایضاً تحت عنوان تعلّموا بحوالہ طبرانی و دارقطنی وغیرہ نیز ابن عبدالبر کی کتاب العلم حدیث ابوداؤد ۲۶، ابن ماجہ ۲۳۔

۹۴ سیوطی کی جمع الجوامع تحت عنوان تعلّمن بحوالہ مالک۔

۹۵ ایضاً تحت عنوان تعلموا من امر النجوم بحوالہ ابن سنی وغیرہ

۹۶ ایضاً تحت عنوان تعلموا من انسابکم بحوالہ مالک و ترمذی و بیہقی و طبری

۹۷ ایضاً تحت عنوان تعلموا القرآن بحوالہ دیلمی

۹۸ جمع الجوامع سیوطی تحت عنوان "تعلّموا" بحوالہ طبرانی الاوسط

تربیت دلانے کا ایک دوسرا طریقہ مکے والوں نے یہ اختیار کیا تھا کہ تجارت کے لئے جو کاروان جایا کرتے تھے اس میں کسی معمر کے ساتھ نوعمروں کو بھیج دیا کریں۔ چونکہ مکے کی معاشی زندگی کا دارومدار بہت بڑی حد تک تجارت پر تھا، اس لئے تربیت کے اس طریقے کی اہمیت مکے والوں کے لئے جیسی کچھ تھی ظاہر ہے۔ سفر کے تجارب کا فائدہ ما سوا تھا۔

اس زمانے میں نوعمروں اور معمروں کی تعلیمی ضرورتوں کے فرق کو محسوس کر لیا گیا تھا، چنانچہ احادیث میں واضح الفاظ میں بتایا گیا ہے، کہ بچوں کو کن چیزوں کی تعلیم دینی چاہئے۔ نشانہ اندازی اور پیراکی خاص طور سے بچپن ہی سے سکھائی جاتی تھی۔ اسی طرح نماز پڑھنے کا طریقہ بھی بچپن ہی سے بچوں کو سکھایا جاتا تھا، اور سات برس کی عمر کے بعد بچے نماز نہ پڑھیں تو انھیں سزا دینے کا حکم تھا[۹۱]۔

عورتوں کے ساتھ علاحدہ سلوک کیا جاتا تھا۔ چنانچہ آنحضرت صلعم نے ہفتے میں ایک دن مقرر کر لیا تھا، جب آپ عورتوں کے خصوصی مجمع میں تشریف لے جاتے، ان کو تعلیم دیتے، اور ان کے سوالات کا جواب دیتے[۹۲]۔ آنحضرت صلعم نے عورتوں کے لئے چرخہ کاتنا، سب سے اچھا مشغلہ قرار دیا تھا[۹۳]۔ ایک حدیث میں یہ واقعہ بیان ہوا ہے کہ آنحضرت صلعم نے ایک خاتون سے خواہش

۹۱۔ جمع الجوامع سیوطی تحت عنوان علّموا الصّبی بحوالہ ابن حنبل وترمذی وبغوی۔

۹۲۔ صحیح بخاری کتاب العلم۔

۹۳۔ جمع الجوامع سیوطی تحت عنوان "علّموا" (نعم لہو المومنۃ فی بیتہا الغزل) بحوالہ ابو نعیم وابن مندہ،

کی کہ وہ آپ کی ایک بیوی کو لکھنے پڑھنے کی تعلیم دیں[۵۱]۔ آنحضرت صلعم کی زوجہ مطہرہ بی بی عائشہؓ کو فقہ اور دیگر اسلامی علوم، نیز ادب، شاعری اور طب میں بڑا دخل تھا[۵۲]، یہاں تک کہ ایک مرتبہ رسول کریم صلعم نے فرمایا، کہ آدھا علم عائشہؓ سے حاصل کرو[۵۳]۔ قرآن نے بھی رسول کریم صلعم کی بیویوں پر ایک خصوصی فریضہ عائد کیا ہے، کہ وہ دوسروں کو تعلیم دیا کریں[۵۴]۔ ایک حدیث میں بیان ہوا ہے کہ جس کسی کے پاس کوئی لونڈی ہو اور وہ اُسے تعلیم دے اور اچھی تعلیم دے، اور اس کی تربیت کرے، اور اچھی تربیت کرے، پھر اس کو آزاد کر کے باضابطہ نکاح کرلے، تو اسے دگنا ثواب ملے گا[۵۵]۔

رفتہ رفتہ مملکتِ اسلامیہ جو ابتداءً ایک شہر مدینہ کے کچھ حصہ پر مشتمل تھی، پھیلتی گئی، اور نہ صرف خانہ بدوش بدوی، بلکہ شہروں میں مستقل طور پر سکونت کرنے والے عربوں نے بھی بڑی تعداد میں اسلام قبول کرنا شروع کیا۔ ایک نئے دین کے قبول کرنے کا ناگزیر نتیجہ تھا، کہ ایک وسیع تعلیماتی نظام قائم ہو، جو دس لاکھ مربع میل کے رقبے کی ضرورتوں کو پورا کرسکے۔ عہدِ نبوی کے اختتام پر حکومت اسلامی

---

۵۱ کتانی ۱/۵۰-۴۹ بحوالہ قاضی عیاض وابوداؤد

۵۲ سیرۃ النبی مؤلفہ شبلی طبع دوم ۲/۴۱۲

۵۳ احادیث فضلِ عائشہ کسی کتاب حدیث میں دیکھی جاسکتی ہیں۔

۵۴ قرآن مجید ۳۳/۳۴

۵۵ ابن عبدالبر کی کتاب العلم صفحہ ۷۶

باوجود اس قدر وسیع رقبے پر مشتمل ہونے کے دینیات کی تعلیم کی ضرورتوں سے اچھی طرح عہدہ برآ ہونے لگی تھی۔ کچھ تو مرکز مدینہ سے بڑے بڑے مقامات پر تربیت یافتہ معلم بھیجے جاتے تھے، اور کچھ صوبہ دار گورنروں کے فرائض منصبی میں یہ امر صراحت کے ساتھ شامل کر دیا جاتا تھا کہ وہ اپنے ماتحت علاقے کی تعلیمی ضرورتوں کا مناسب انتظام کریں[۹۱]۔ یمن کے گورنر عمرو بن حزم کے نام جو طویل تقررنامہ یا ہدایت نامہ جناب رسالتمآب صلعم نے لکھا تھا، اسے تاریخ نے محفوظ رکھا ہے[۹۲]۔ اس میں بھی گورنر کو ہدایت ہے کہ لوگوں کے لیے قرآن، حدیث، فقہ اور علوم اسلامیہ کی تعلیم کا بندوبست کریں۔ اسی دستاویز میں ایک دلچسپ جملہ ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مذہبی اور دنیاوی تعلیم میں کس طرح فرق کرنا چاہیئے اور وہ جملہ یہ ہے کہ "لوگوں کو اس بات کی نرمی سے ترغیب[۹۳] دو کہ وہ دینیات کی تعلیم حاصل کریں"۔ گورنروں کو جس تعلیم کے رائج کرنے کا حکم تھا، اس میں دینیاتی ضرورتوں میں سے وضو، جمعہ کا غسل، نماز با جماعت، روزہ اور حج کعبہ کے احکام شامل تھے۔

صوبہ دار درس گاہوں کا معیار بلند کرنے کے لئے رسول کریم صلعم نے صوبہ

---

۹۱ کتانی ۱/۴۴۳ و مابعد

۹۲ سیرۃ ابن ہشام ص ۹۶۱ تا ۹۶۲، تاریخ طبری ج ۱ ص ۱۷۲۷ تا ۱۷۲۹، کتانی ۱/۴۴۳ تا ۴۴۹ وغیرہ۔

۹۳ جمع الجوامع سیوطی تحت عنوان "علّموا" (علّموا ولا تعنفوا فان المعلم خیر من المعنف، علّموا ویسّروا ولا تعسّروا) بحوالہ ابن سعد و بیہقی و ابن حنبل۔

یمن میں ایک صدر ناظر تعلیمات مقرر کیا تھا، جس کا کام یہ تھا، کہ مختلف اضلاع و تعلقات میں ہمیشہ دورہ کرتا رہے، اور وہاں کی تعلیم اور تعلیم گاہوں کی نگرانی کرے۔[۵۱] کوئی تعجب نہیں جو اور صوبہ جات میں بھی اس طرح کے افسر مامور کیے گئے ہوں۔

آخر میں تعلیم کی نظری حیثیت کے متعلق قرآن و حدیث کے بعض احکام کی جانب اشارہ کرنا بے محل نہ ہوگا۔ چنانچہ قرآن مجید میں ہم دیکھتے ہیں، کہ شروع سے آخر تک بار بار اور صاف و صریح الفاظ میں اندھی تقلید کو برا ٹھیرایا گیا ہے،[۵۲] اور اس بات کا حکم دیا گیا ہے کہ ہر شخص خود اپنے طور پر غور و فکر کرے، اور کسی رسم و رواج کی پیروی محض آبائی و موروثی ہونے کی بنا پر نہ کرے۔[۵۳] کسی اور مذہبی کتاب میں فطرت کے مطالعہ پر اتنا زور نہیں دیا گیا ہوگا، جتنا قرآن مجید میں ہے، کہ سورج چاند، سمندر کی موجیں، دن اور رات، چمکتے ستارے، رنگتی فجر، پودے، اور حیوانات ——— تمام ہی قوانین فطرت کے تابع بنائے گئے ہیں، جن سے ان کے خالق کی قدرت کا مظاہرہ ہوتا ہے۔ قرآن مجید کے مطابق علم اللہ کا ہی ہے[۵۴]

۵۱ تاریخ طبری ص ۱۹۵۳ تا ص ۱۹۸۵ (احوال سنہ ۱ ہجری)

۵۲ ابن عبدالبر کی کتاب العلم ص۱۱۶ باب ذم التقلید بحوالہ آیت ۳۱ "اتخذوا احبارھم و رھبانھم اربابا من دون اللہ"

۵۳ طلب علم کی فضیلت کے لیے دیکھو ابوداؤد ۲/۱۴۲، مقدمہ ابن ماجہ ص۲۰، مقدمہ دارمی وغیرہ، ترمذی ۲/۳۹

۵۴ قرآن مجید ۲۰/۱۱۴ قرآن مجید میں قصہ موسیٰ و خضر کا مقصد بھی طلب علم کی فضیلت اور علم انسانی کی قلت کو نمایاں کرتا ہے۔

اور بڑے سے بڑے عالم کا علم بھی تھوڑا ہی ہوتا ہے، یہ کہ سارا عالم انسان کی خدمت کے لئے پیدا کیا گیا ہے، اور انسان جو زمین میں خدا کا نائب ہے، اپنے برتاؤ اور کردار کے مطابق جانچا جائے گا۔ اسی طرح قرآن مجید میں اس کا بھی بار بار ذکر ہے، کہ حق و صداقت کی پیروی کی جانی چاہیئے، اور مروجہ عقائد و رواجات سے متاثر نہیں ہونا چاہیئے۔

احادیث میں بھی علماء کی بڑی تعریف کی گئی ہے، اور ان کو سب سے بہتر انسان قرار دیا گیا ہے[۵۱]، حتیٰ کہ ان کو انبیاء کا وارث قرار دیا گیا ہے[۵۲]۔ آخر میں ایک حدیث کا ذکر کیا جا سکتا ہے، جس کا اکثر حوالہ آتا ہے، اگرچہ ماہرین اس کو اس کے موجودہ الفاظ میں صحیح حدیث نہیں سمجھتے، لیکن اس کا مفہوم قرآن و حدیث کی عام تعلیمی پالیسی سے بالکل متفق ہے، یعنی "علم حاصل کرو، اگرچہ چین ہی میں کیوں نہ ہو، کیونکہ علم کا حاصل کرنا ہر مسلمان مرد و عورت کا فریضہ ہے[۵۳]۔"

---

۵۱ من یرد اللہ بہ خیراً یفقھہ، فی الدین (بخاری ۳ ۱۴۱، ۹ ۱۰، ترمذی ۱ ۴، مقدمہ ابن ماجہ ف ۱۷ مقدمہ دارمی ف ۲۳ ابن عبد البر کی کتاب العلم ص ۱۶ تا ص ۱۸، حدیث خیر الناس العلماء والمتعلمون (مقدمہ دارمی ف ۲۵ ؛ ف ۳۱) ابو داؤد ۲۲ ۱۔

۵۲ العلماء ورثۃ الانبیاء (بخاری ۳ ۱۰، ترمذی ۹ ۱۹، ابن عبد البر کی کتاب العلم ص ۲۱)

۵۳ اطلبوا العلم ولو بالصین فان طلب العلم فریضۃ علیٰ کل مسلم ومسلمۃ (ابن عبد البر کی کتاب العلم، بیہقی کی شعب الایمان، ابن عدی کی الکامل اور سیوطی کی جمع الجوامع میں یہ حدیث ہی

ایک حدیث میں یہ دعا ماثور ہے اور اسی پر یہ تبصرہ ختم کیا جاتا ہے کہ "اے خدا میں تجھ سے علم نافع اور رزقِ طیب اور عملِ مقبول کی استدعا کرتا ہوں[۵۷]" "اللّٰھم انی اسئلک علماً نافعاً ورزقاً طیباً وعملاً متقبلاً" ، آمین!

(معارف اعظم گڑھ نومبر ۱۹۴۱ء)

۵۷۔ حدیث نبوی بحوالہ کتاب العلم مؤلفہ ابن عبدالبر ص۴۲۔

صفحہ (۹۲۵) کے حاشیہ کا بقیہ

لکھے ہیں جن دس معروف عہدہ داروں کا مورخ ذکر کرتے ہیں وہ یہ تھے:۔

۱۔ بنی ہاشم سے عباس ۔ سقایہ، عمارۃ البیت، حلوان النفر

۲۔ بنی امیہ ۔ ابوسفیان ۔ عقاب

۳۔ نوفل ۔ حارث بن عامر ۔ رفادہ ۔

۴۔ عبدالدار ۔ عثمان بن طلحہ ۔ لواء، سدانہ، حجابہ، ندوہ

۵۔ بنی اسد ۔ یزید بن ربیعہ ۔ مشورہ

۶۔ تیم ۔ ابوبکر صدیق ۔ اشناق

۷۔ مخزوم ۔ خالد بن الولید ۔ قبۃ، اعنہ

۸۔ عدی ۔ عمر بن الخطاب ۔ سفارہ

۹۔ جمح ۔ صفوان بن امیہ ۔ ایسار، ازلام

۱۰۔ بنی سہم ۔ الحارث بن قیس ۔ حکومہ، اموال محجرہ

جاہلیت عرب کے معاشی نظام کا اثر

پہلی مملکت اسلامیہ کے قیام پر

تمہید خدائے تعالیٰ نے قادر مطلق ہونے کے باوجود کم از کم انسانی دنیا کو عالم اسباب بنایا ہے۔ اور مشیت ایزدی کا کوئی کرشمہ یہاں جب پوری طرح جلوہ گر ہو کر اپنا مظاہرہ دکھاتا ہے تو اس کے پس منظر میں اسباب و مسببات اور علل و معلولات کا ایک کثیر و طویل سلسلہ پھیلا ہوا نظر آتا ہے۔

مشیت ایزدی یہ ہوئی تھی کہ اب سے پورے پونے چودہ سو سال پہلے پرانی دنیا کے جغرافی مرکز (اور اس طرح ناف زمین) یعنی مکہ معظمہ سے انسان و خدا کے تعلقات میں ایک نئی مرکزیت پیدا کرائے۔ اور عرب سے شروع ہو کر اسلام اقصائے عالم تک پہنچ جائے۔ عہد نبوی میں جو پہلی اسلامی مملکت قائم ہوئی اس کے بیسیوں اسباب تھے۔ اخلاقی بھی، سماجی بھی، سیاسی بھی، معاشی بھی، اور ظاہری طور پر اس تحریک کی کامیابی میں جہاں سرور کائنات پیغمبر اسلام کی قابلیتوں اور کوششوں کو دخل تھا وہیں آن آلوں اور ہتھیاروں میں بھی صلاحیت کی ضرورت تھی جن سے رسول کریم کو کام لینا تھا۔ گیہوں سے

روٹی بیشک بنتی ہے۔ لیکن محض گیہوں سے نہیں۔ پہلے اُسے کھلا کرنا اور پچھوڑنا ہوتا ہے پھر پیسنا۔ اور محض پسے ہوئے سوکھے آٹے سے بھی روٹی نہیں بنتی۔ اسے بھگونا اور گوندنا اور بیلنا اور توے پر ڈال کر سینکنا بھی ہوتا ہے۔

پہلی مملکت اسلامیہ کو اگر ایک پکی پکائی روٹی سمجھا جائے اور حجازی عربوں کو گیہوں، تو اب یہ دیکھنا ہمارے لئے دلچسپی کا باعث ہوگا کہ اس گیہوں کو کھلا کس طرح کیا گیا، پچھوڑا کس طرح گیا، پیسا کس طرح گیا، چھانا کس طرح گیا گوندھا کس طرح گیا، بیلا کس طرح گیا، بھرنا، الٹا پلٹا اور پھر اکس طرح گیا۔ کتنا پانی ڈالا گیا، کتنا نمک ڈالا گیا، کتنی دیر کتنی تپش پر سینکا گیا۔ کسی کونے کو داغ نہ لگنے دینے کے لئے کیا کیا احتیاطیں ملحوظ رہیں وغیرہ۔

پہلی مملکت اسلامیہ کے لئے ایک نئی دنیا نہیں پیدا کی گئی بلکہ موجودہ دنیا کے موجودہ لوگوں ہی کو ان کے موجودہ مروّج طرز زندگی کے ساتھ مملکت اسلامیہ میں مبدّل کیا گیا تھا۔ یہ لوگ اسلام سے پہلے بھی کھانا کھاتے، پانی پیتے، چلتے پھرتے، سوتے، مرتے اور پیدا ہوتے تھے۔ اور اسلام کے بعد بھی ان امور میں کوئی بنیادی تبدیلی نہیں ہوئی۔ کچھ چیزیں مثلاً بت پرستی، شراب خواری، سود خواری وغیرہ گھٹیں، کچھ چیزیں مثلاً نماز، روزہ، زکوٰت بڑھیں، لیکن انسانی زندگی میں یہ سب جزئیات ہیں۔ انسان کی پیدائش کا طریقہ زندگی گزارنے کا طریقہ اور مرنے کا طریقہ کبھی بدل نہ سکے۔ تصورِ حیات البتہ بدل دیا گیا۔ بس ایسا تصورِ حیات کے بدلنے سے انسانوں کے افعال میں وہی فرق ہو گیا جو ایک رہزن ٹھگ کی خونریزی اور ایک سپاہی کے قتل و غارتگری میں

ہوتا ہے کہ رہزن کو تو سماج کا بدترین مجرم اور سپاہی کو محسنِ اعظم ہیرو خیال کیا جاتا ہے۔ گو دونوں کرتے ایک ہی قسم کا کام تھے۔ اس تصورِ حیات کے بدلنے سے پہلے کعبے کے سامنے سجدہ بدترین قسم کی بت پرستی اور جہالت تھی تو اب اسی کعبے کے سامنے سجدہ وحدانیت اور خدا پرستی کا اعلیٰ ترین مظاہرہ بن گیا۔

تصورِ حیات کی اس تبدیلی میں مختلف امور اثر دکھاتے ہیں۔ پہلے "کھاؤ پیو اور مزے اڑاؤ" منتہائے آمال اور ملتمسائے اعمال تھا تو اب، اور تو اور کھانے پینے کا مقصد بھی یہ ہو گیا کہ اپنے بلند نصب العین اور مفوضہ مشن کی تکمیل کے لیے صحت و طاقت کے ساتھ جی سکیں۔

اس نئے مقصدِ حیات کا تعلق نہ صرف روحانی زندگی سے تھا بلکہ دنیاوی زندگی سے بھی۔ اور نہ صرف انفرادی زندگی سے تھا، بلکہ اجتماعی زندگی سے بھی۔ نہ صرف اپنی زندگی سے تھا بلکہ اپنے جیسے دوسرے انسانوں کو اس نئے تصور سے بہرہ ور کرنے سے بھی۔

ان گوناگوں مقاصد کے لئے جہاں اور وسائل کے اختیار کرنے کی ضرورت تھی وہیں ایک مملکت کا قیام بھی درکار تھا، تاکہ یہ بتایا جا سکے کہ اس جدید تصورِ حیات یعنی اسلام یا "خدا کی مرضی پر چلنے کے اصول" کا اطلاق حکمرانی اور سیاستِ مدن پر کس طرح کیا جائے۔ جنگ و صلح، عدل گستری، محصول گیری، راعی و رعایا کے حقوق و واجبات، اجتماعی و انفرادی آزادیاں اور پابندیاں سب ہی میں ایک نئی مرکزیت، ایک نیا ولولہ، ایک نئی زندگی، ایک ہمہ جہتی اور بے پناہ انقلاب کس طرح برپا کر دیا جائے؟

کسی مملکت کے قیام کے لئے آدمیوں کی ضرورت ہے لیکن اسی طرح جس طرح روٹی کے لئے گیہوں کی۔ پہلی مملکت اسلامیہ کے قیام کے لئے جن نفسیاتی، سیاسی، سماجی، جغرافی، تمدنی، معاشی اور دیگر موثرات کی ضرورت تھی ان سب کی تفصیل طویل ہوگی۔ یہاں صرف ایک امر یعنی معاشی ضروریات کی تحلیل مقصود ہے۔ اور یہ دکھانے کی کوشش کی جائے گی کہ زمانہ جاہلیت میں عرب کا معاشی نظام کیا تھا اور اس نظام نے پہلی مملکت اسلامیہ کے قیام میں کیا حصہ لیا؟

عرب کے مختلف علاقے | اس کا پتہ نہیں چلتا کہ اسلام سے پہلے عرب کے جزیرہ نما میں کبھی بھی ایک ملک گیر اور مرکزی حکومت قائم ہوئی ہو۔ اور قریب قریب ہندستان کے برابر وسعت رکھنے والے اس صحرائی براعظم میں تمدنی ترقی چوطرف یکساں بھی نہیں رہی۔ ربع خالی آج چودھویں صدی ہجری میں بھی خالی ہی پڑا ہے، لیکن یمن وغیرہ میں حضرت مسیح سے بھی ہزاروں سال پہلے متمدن اور طاقتور مملکتوں کا پایا جانا ایک امر واقعہ ہے۔ کبھی کبھی خاصی وسیع سلطنتیں وجود میں آئیں مثلاً کندہ والوں نے حضرموت سے عراق جاماسب[1] وغیرہ تک یعنی عرب کے جنوب سے شمال تک کچھ دنوں ایک حکومت قائم کرلی تھی لیکن حجاز وغیرہ کے وسیع علاقے اس سے آزاد رہے۔ بحرین، عمان وغیرہ کے ساحلی علاقے بھی خاصے قدیم زمانے سے خانہ بدوش قبائل کی جگہ حضری زندگی رکھنے والی بستیوں پر مشتمل نظر آتے ہیں۔ بہرحال آغاز اسلام پر صورت حال یہ دکھا دیتی ہے کہ کوئی مرکزی مملکت

---

[1] المحبر لابن حبیب ص ۳۶۹

عربی قوم یا ملک عرب میں نہ تھی۔ سینکڑوں قبیلے تھے جو نیم حضری اور نیم بدوی زندگی گزارتے ہوئے مکمل خود مختارانہ طور سے رہتے تھے۔ ہر قبیلہ جنگ کا خود اعلان کر سکتا تھا۔ صلحنامہ خود طے کر سکتا تھا۔ اس کے خلاف کوئی بیرونی حاکم کسی طرح کا اختیار سماعت نہ رکھتا تھا۔ ان قبائل کے علاوہ بیسیوں شہر بھی تھے۔ مکہ، مدینہ، طائف، ینبوع (حجاز میں)؛ جُرش، صنعا، عدن، (یمن میں)؛ صحار اور دبا (عمان میں)؛ ہجر (بحرین میں)؛ یمامہ، فید، (نجد) میں؛ دومۃ الجندل، خیبر، فدک، وادی القریٰ، (شمالی عرب میں)؛ ایلہ، مقنا، صحرائے سینا کے مشرقی ساحل پر اچھی خاصی بستیاں تھیں جو کم و بیش شہری مملکتیں کہی جا سکتی تھیں۔ یمامہ، یمن وغیرہ بعض علاقوں میں غلے کی کاشت ہوتی تھی اور آس پاس کے عربی علاقوں میں برآمد بھی ہوتی تھی۔ لیکن نہ اتنی کہ پورے ملک کی ضرورتیں پوری ہو سکیں۔ کھجور اور اونٹ بکریاں ایک حد تک بدویوں کی غذائی ضرورتیں پوری کر دیتی تھیں۔ لیکن لباس، برتن، ہتھیار[سلہ]، زیور اور دیگر ضرورتوں کا سوال پھر بھی باقی رہتا ہے۔ صحرائے گوبی، ترکستان اور جرمنی کے کالے جنگل کی طرح عرب بھی نا معلوم وجوہ سے بڑا مردم خیز خطہ ہے۔ اور توالد و تناسل کی کثرت مقامی ذرائع معیشت سے اتنی کچھ زیادہ ہے کہ باوجود خانہ جنگیوں وغیرہ کے جلد ہی یہ زندگی، آبادی کی کثرت سے اضافے کے باعث ناقابل برداشت ہو جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ چار ہزار سال قبل مسیح[سلہ] سے عرب مہاجرین کا واحد خشکی کے راستے یعنی شمال سے

سلہ مشرفی یعنی مشارف شام کی تلواریں عربی ادبیات میں ضرب المثل ہیں۔ (نوٹ ملہ صفحہ ۲۳۲ پر)

پھیلنا اور عراق و شام اور مصر تک میں جا جا کر آباد ہونا، سب جانتے ہیں ہجرت کے باوجود بھی جو آبادی تنگ رہتی ہے وہ بیرونی درآمد کی محتاج ہوتی ہے۔ قدرت نے عرب میں کچھ ایسے زیادہ خام مواد بھی نہیں مہیا کئے ہیں اور نہ آب و ہوا کی عمدگی ہے کہ بیرون والے یہاں آئیں اور غلہ وغیرہ پہنچائیں۔ مجبوراً بیچارے عربوں ہی کو باہر جانا اور اپنی پونجی کے عوض ضروریات زندگی کا لانا ضروری تھا۔ بحرین و عمان کا بلوچستان اور سندھ سے اتنا قریبی جغرافی تعلق ہے کہ یہ لوگ ہندوستان اور ایران کے سوا کہیں اور جا نہیں سکتے۔ حجازی عربوں کے متعلق قرآن مجید کی شہادت رحلۃ الشتاء والصیف سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ ہر سال دو مرتبہ جاڑوں اور گرمیوں میں کئی کئی ماہ کے سفر پر مجبور تھے جاڑوں میں یمن جاتے اور گرمیوں میں شام و مصر۔ اونٹ، بکریاں، اونٹوں اور بکریوں کی کھالیں اور اون، گھوڑے، گوند، لوبان، روغن بلسان عقیق جیسے کچھ قیمتی پتھر، اور اسی طرح کی کچھ چیزیں وہ ساور کر سکتے تھے۔ اور تبادلے میں غلہ، برتن اور ہتھیار اور کپڑوں کی درآمد ہو سکتی تھی۔

عربوں کے دو بڑے حصے تھے اور بعض وقت ایک ہی قبیلے میں بھی یہ تقسیم نظر آتی تھی کہ کچھ لوگ خانہ بدوش بدویانہ زندگی بسر کرتے ہیں تو کچھ لوگ بستیوں

(بقیہ نوٹ ۲۲)

۵۵ دیکھئے ڈاکٹر عنایت اللہ کی "جیوگرافکل فاکٹرس ان عرب ین لائف اینڈ ہسٹری" (طبع لاہور)

نیز میرا مضمون "عربوں کے تعلقات بیزنطینی حکومت سے" (مجلہ تحقیقات علمیہ جامعہ عثمانیہ ۱۹۳۵ء)

میں مستقل حضری زندگی گزارتے ہیں بدویوں کی غذا کچھ تو شکار سے کچھ ان کے اونٹ بکریوں سے اور کچھ شہروں میں لگنے والے میلوں میں تبادلہ اشیا کرنے کے ذریعے سے مہیا ہوتی تھی۔ مزید برآں یہ کرائے پر نقل و حمل کا کام کرتے تھے لوٹ مار کی مہمیں بھی وقتاً فوقتاً اختیار کی جاتی تھیں دل چسپ ابن خلدون نے ان میں سے بعض کی حالت یوں بیان کی ہے کہ اگر انھیں چولھے کے لئے پتھر درکار ہوتا تو کسی مکان کا پایہ کھود لیتے اور جلانے کے لئے لکڑی درکار ہوتی تو مکان کی چھت توڑ ڈالتے تھے[۵۹]۔

رہی شہری زندگی، سو اس میں بھی بڑی حد تک تمام عرب میں یکسانی نظر آتی ہے نخلستان ہی مرکز تھے۔ طائف، سوارقیہ وغیرہ میں انگور، انجیر، انار، شفتالو وغیرہ کے بکثرت باغ تھے ۱۳۵۱ھ میں طائف میں میں نے انجیر کا ایک پرانا درخت دیکھا جو یقین نہ آئے گا کہ ہمارے ہاں کے کسی پورے تناور نیم یا بڑ کے درخت کے برابر اونچا اور پھیلا ہوا تھا۔ چشموں کے ساتھ ترکاری، تربوز، ککڑی وغیرہ کی کاشت بھی ہوتی تھی۔ کہیں کہیں غلہ جو وغیرہ بھی بویا جاتا تھا مرغیاں پال جاتیں جسے کوئی ٹھیٹ بدوی آج چودھویں صدی میں بھی بڑا نفرت انگیز اور کمینہ کام سمجھتا ہے۔

ان مقامی وسائل کے بعد بھی ضرورتیں پوری نہ ہوتیں تو مختلف میلوں

---

[۵۹] تفصیل کے لئے دیکھئے پروفیسر مارسے کا افتتاحی مقالہ فرنچ اکاڈمی میں "اسلامی اور حضری زندگی" (ترجمہ مطبوعہ روزنامہ رہبر دکن حیدرآباد ۱۹ تا ۲۲ رجب ۱۳۵۵ھ)۔

منڈیوں میں جاکر تبادلۂ اشیا کرنا پڑتا۔ یہ کام سب ہی عربی شہر اور عربی قبیلے کرتے لیکن مکّے کے قریشیوں نے اسے ایک فن سے بھی گزار کر ایک علم بنا دیا تھا۔

مکے کے امتیازات عرب شہروں پر

عرب میں ہر جگہ بستیاں اور قریے تھے لیکن مکہ ام القریٰ (یعنی قریوں کی ماں) کہلاتا تھا۔ عرب کی ہر بستی میں معابد اور بُت خانے تھے لیکن کعبے کے حج کے لئے جو لوگ آتے تھے ان میں بیعت عقبہ کے سال یمن کے لوگ بھی تھے، عمان کے لوگ بھی، بحرین کے لوگ بھی، طائف کے لوگ بھی، نجد کے لوگ بھی، طئی اور کلب جیسے شمالی عرب کے لوگ بھی۔ عرب کی ہر بستی میں میلے لگتے تھے کہیں مقامی اور کہیں بین المقاماتی۔ چھوٹے ہاٹ ہفتہ وار لگتے۔ بڑے بین القبائل اور بین المقاماتی میلے سالانہ مقررہ ایام میں لگتے۔ لیکن جو اہمیت مکّے کے عکاظ اور منیٰ کے میلوں کو حاصل تھی وہ انتہائی غیر جانبدار تحقیق و تلاش کے بعد بھی کسی اور میلے میں نظر نہیں آتی۔ عرب کی ہر بستی والے اپنے کاروانوں کو باہر بھیجا کرتے تھے۔ لیکن لایلاف قریش کا مفہوم محمد بن حبیب، یعقوبی وغیرہ کسی پڑھے لکھے اور واقف کار شخص کی تالیف میں دیکھو تو معلوم ہوتا ہے قریش کے ایلاف یعنی معاہدات قیصر روم سے، کسرائے ایران سے، نجاشی حبش سے، اور اقیال یمن سے تھے اور ان حکمرانوں نے رسول کریم کے دادا ہاشم کو منظور اور اجازت نامے عطا کر رکھے تھے کہ ان کے علاقوں میں وہ تجارت کے لئے آزادانہ کارواں لایا کریں۔

---

۹۱ ایلاف کے معنی بھی معاہدے کے ہیں (محبر محمد بن حبیب ص ۱۶۲ الخ)

عرب کی ہر بستی والے اپنے تجارتی کارروانوں کی حفاظت کے لئے کچھ تو خود ہتھیار بند ہو کر بطور محافظ دستہ جاتے اور کچھ ان علاقوں کے جہاں سے انھیں گزرنا ہوتا، قبائل سے حلیفی اور دوستی پیدا کر لیتے۔ لیکن قریشی کاروبار شمال، جنوب، مشرق، مغرب، سب طرف پھیلے ہوئے تھے۔ وہ عراق بھی جاتے، یمن بھی، حبش بھی، شام بھی اور اندرون عرب، بحرین و عمان، نجد و خیبر بھی۔ ان کا نظام ناگزیر وسیع ہونا چاہیئے۔ اور واقعہ بھی یہی تھا۔ انھوں نے ایک فوج قائمہ نوکر رکھ لی تھی[۹۵] جو تمام بدوی عرب میں اچھوتی چیز تھی۔ انھوں نے خفارے یا بدرقے کی ضروریات کے لئے معاہدات کا جو وسیع اور ملک گیر جال پھیلا دیا تھا اس کا ذکر ابن قتیبہ کے استاد محمد بن حبیب (المتوفی ۲۴۵ھ) سے سنئے جو کہتا ہے کہ:-

"جو تاجر بھی یمن اور حجاز سے نکلتا تو وہ اُس وقت تک قریشی خفارے یعنی محافظ دستے کا محتاج رہتا جب تک کہ وہ مضری قبائل کے علاقے میں رہے کیونکہ ایک مضری قبیلہ، دوسرے مضری قبیلے کے تاجروں کو نہ ستاتا۔ مزید برآں مضریوں کی حلیفی جن جن قبائل سے تھی ان کے ہاں بھی ان کو امن رہتا۔ اور یہ "باہمی امن" کے اصول پر مبنی تھا۔ چنانچہ قبائل کلب ان کو مضری قبیلہ بنو تمیم سے حلیفی کے باعث نہ ستاتے اور قبائل طئی بھی ان کو مضری قبیلہ

---

۹۵ تفصیل اوپر باب "شہری مملکت مکہ" میں۔

بنو اسد سے حلیفی کے باعث نہ چھیڑتے - اور مضری قبائل کہا کرتے تھے کہ قریش نے ہمارا وہ قرض ادا کر دیا جو حضرت اسمٰعیلؑ سے ہم کو وراثۃً مذمت کی صورت میں ملا تھا - جب یہ آگے بڑھ کر عراق سمت میں جاتے اور بنی عمرو بن مرثد سے خفارہ حاصل کر لیتے تو تمام قبائل ربیعہ میں وہ کافی ہوتا . . . . جو تاجر دومۃ الجندل جاتے ان کو بھی قریش ہی سے خفارہ حاصل کرنا ہوتا . . . . . رابیہ جو حضرموت میں واقع ہے اگر وہاں جانا ہوتا تو قریش وہاں کے قبیلہ بنو آکل المرار سے خفارہ حاصل کرتے اور باقی لوگ آل مسروق سے لیکن قریشی حلیفی کے باعث آکل المرار نے غلبہ اور حکومت وسطوت حاصل کر لی اور سب کو زیر کر لیا۔"
(کتاب المحبر ص ۲۶۳ الخ)

اس دلچسپ اقتباس سے معلوم ہوگا کہ خفارہ جو ایک معنے میں بین الاقوامی اجازت نامۂ رہگذر کا مہیا کرنا تھا، عربوں کے ہاں ایک مستقل ادارہ بن گیا تھا جس کی قیمت مقرر تھی، عدنان وقحطان کے قبائل، مضر و ربیعہ کے قبائل سب اس میں داخل تھے - اور عملاً پورا عرب اس نظام میں منسلک ہو گیا تھا، جو قریشی مواصلات کے لئے ضروری تھا - قریش نہ صرف اس نظام اور سلسلۂ حلیفی سے خود فائدہ اٹھاتے بلکہ تاریخی شہادت سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ سی اور کبھی بخوشی معاوضہ لے کر اپنا خفارہ مہیا کرتے - اسی نظام کی برکت تھی کہ ہندوستان کا سامان عرب کی راہ یورپ میں پہنچ سکتا تھا، مگر خود یورپ کا

حال عرب کے اس ہمعصر زمانے ہی میں نہیں بلکہ حال حال اٹھارہویں صدی تک یہ تھا کہ تقنیں اور جے لوا ہو کہ اسپین و پرتگال، تجارت پہ قومی اجارہ داری ضروری سمجھی جاتی تھی۔ اور طوفان زدہ مصیبت کا مارا تک اگر اپنی مقبوضات میں پہنچتا تو نہ وہ صرف مال سے ہاتھ دھو بیٹھتا بلکہ جان نہ جا کر صرف غلام بنتا، تو اسے ایک نعمت غیر مترقبہ ملتی تھی[۵۹] قریش نے خفارے کے اغراض کے لئے حلیفیوں کی جو طرح ڈالی تھی وہ مختلف اصول پر مبنی ہوتی: کبھی تو باہم ان کی شرط کافی ہوتی۔ کبھی قریش یہ کرتے نظر آتے ہیں کہ کسی غریب قبیلے کا مال بطور کارندہ تجارت کے لئے لیجاتے اور کوئی کمیشن لئے بغیر نفع مالکوں کے سپرد کرتے۔ اور کبھی خفاروں پر نقد معاوضہ رقم یا جنس کی صورت میں دیتے۔ بہت سے قبیلوں کا روزگار ہی اس خفارہ کاری سے نکلتا۔ وہ یہ مہیا کرتے جو راستے میں چوکس اور سینہ سپر رہتے۔ اور عربوں ہی نہیں بلکہ حیرہ کے بادشاہ اور دیگر اجنبیوں کا تک مناسب معاوضہ لے کر "لطیمہ" یعنی تجارتی سامان منڈی تک بحفاظت لے جانے اور واپس لانے کا ذمہ لیتے اور یہ ذمہ داری علی العموم پوری ہوا کرتی ہوگی جبھی تو یہ ادارہ بقا و استحکام میں نظر آتا ہے۔

اسواق العرب پر محمد ابن حبیب کی کتاب کا ایک اقتباس ہم ابھی سن چکے ہیں۔ اسی کتاب کا ایک اور اقتباس سننے کے قابل ہے، جس میں کہیں

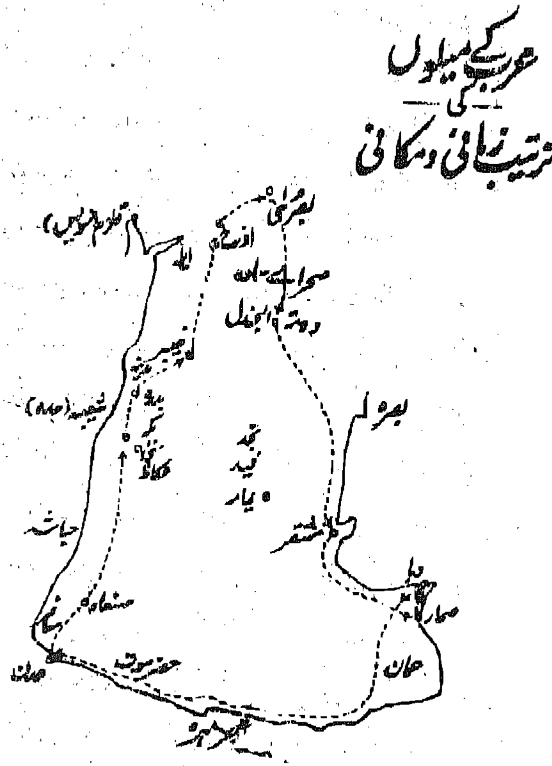
---

۵۹ نیس کی فرانسیسی تالیف "جدید قانون بین الممالک کا آغاز" ص ۲۶۲/۹۶۴

(ترجمۂ دارالترجمہ جامعۂ عثمانیہ)

کہیں ایک ہم ماخذ مؤلف، مرزوقی، کے بیان سے تکملہ کیا گیا ہے:۔
"رومۃ الجندل میں جو شام و حجاز کے مابین ہے یکم ربیع الاول کو میلہ لگتا اور مہینہ بھر چلتا پھر برخاست ہو کر آئندہ سال اسی زمانے میں لگتا۔ (قریش مکے سے اس کے لئے جاتے) ..... پھر یہاں سے لوگ چل کر بحرین میں مُشقّر آتے جہاں یکم سے آخر جمادی الآخرہ تک میلہ لگتا اور دومۃ الجندل کی طرح یہاں بھی مقامی حکمران کو عُشر یعنی دس فیصد چنگی وصول ہوتی۔ ایران سے تک تاجر سامان لے کر یہاں آتے۔ اس کے بعد یہاں سے یکم رجب کو چلتے تو عمان کے شہر صُحار کو آتے آتے بیس دن لگتے اور جو پہلے نہ آسکے ہوتے وہ اب آتے اور یہاں پانچ دن تک میلہ لگتا۔ یہاں کا عُشر بادشاہ جُلَندی کو ملتا۔ اس کے بعد دَبا کا میلہ رجب کے آخر میں لگتا۔ یہ عرب کی دو بڑی بندرگاہوں میں سے ایک تھا۔ یہاں سندھ اور ہند اور چین اور مشرق اور مغرب کے لوگ آیا کرتے۔ اور خشکی اور سمندر سے سامان لاتے۔ یہاں کا عُشر بھی بادشاہ جُلَندی کو ملتا۔ اس کے بعد مہرہ کے شہر شحر میں ـــــ جو آج کل ہمارے سلطان مُکلّا و شحر کے علاقے میں ہے ـــ وسطِ شعبان سے میلہ لگتا، جہاں بری اور بحری تاجر سب دبا سے چل کر آتے یہاں کھالیں، کپڑے وغیرہ فروخت کئے جاتے۔ اور ایلوہ، لوبان وغیرہ جو مقامی پیداوار تھے خرید

کیے جاتے۔ پھر عدن میں یکم رمضان سے بیس دن میلہ لگتا۔
یہاں بڑا اچھا انتظام تھا۔ کسی محافظ دستے کی یہاں ضرورت
نہ رہتی تھی۔ یہاں کا عُشر ایرانی نوآبادکار افسر لے لیتے۔ یہاں
سمندری راہ سے آنے والے لوگ جو دبا اور مہرہ آتے وہ
نہ آتے بجز اس کے کہ کسی کے پاس کچھ سامان بک رہا ہو اور
اس سے پہلے کے میلوں میں اسے شرکت کا موقع نہ ملا
ہو۔ عدن میں جو عطر بنتا اس کی دور دور تک شہرت تھی۔
سمندری راہ سے آنے والے تاجر اسے بطور تحفہ سندھ اور
ہند تک لے جاتے اور اس پر فخر کیا جاتا۔ اور خشکی کی راہ آنے
والے اسے ایران و روم تک لے جاتے۔ (عطر سازی
کے متعلق مرزوقی نے ۴۲۱ھ کی تالیف میں لکھا ہے کہ
اس وقت تک وہ صنعت وہاں کمال پر ہے۔ عدن کے
بعد صنعاء کا میلہ تھا جو وسط سے آخر رمضان تک ہر سال لگتا۔
یہاں روئی، زعفران، مختلف قسم کے رنگ، لوہے وغیرہ
کے سامان بکتے۔ یہاں کا عُشر بھی ایرانی حکمران افسر لیتے۔
ان مختلف میلوں میں لوگ وہ سامان خریدتے جن کی ان کو
اپنے ملکوں میں مانگ ہوتی۔ اس کے بعد رابیہ واقع حضرموت
اور عکاظ قریب عرفات و مکہ میں بیک وقت وسط ذیقعدہ
سے آخر ماہ تک میلہ لگتا۔ کچھ لوگ عکاظ آتے اور کچھ رابیہ


عرب کے میدانوں
کی
ترتیب زمانی و مکانی
بصریٰ
ایلہ
دومۃ الجندل
خیبر
شعیبہ (جدہ)
نجد
بصرہ
حباشہ
صنعاء
حضر موت
عمان

جاتے۔ عکاظ کے قریب ذی المجاز ہے چنانچہ عکاظ کے بعد
یکم ذی الحجہ سے دس دن ذی المجاز میں میلہ لگتا پھر منیٰ میں
جو مکے کے مضافات میں ہے، حج کے سلسلے میں میلہ جمتا۔
یہاں سے فارغ ہونے کے بعد لوگ خیبر یا یمامہ جاتے
جہاں محرم کی دسویں سے میلے لگتے اس کے بعد جنوبی فلسطین
میں بُصریٰ اور اذرعات کے میلے لگتے (دیکھئے نقشہ صفحۂ گزشتہ پر)۔

اس اقتباس سے اندازہ ہو گیا ہوگا کہ کس طرح شمال سے مشرق، مشرق سے جنوب، جنوب سے مغرب اور مغرب سے شمال، غرض پورے عرب کا سال بھر میں دورہ ہو جاتا ہے۔ کس طرح پورے عرب میں سیاسی تو نہیں لیکن معاشی وفاق قائم ہو گیا تھا۔ کس طرح ان میں ایک ربط و نظم پیدا ہو گیا تھا اور اگرچہ ہر جگہ مقامی خود مختاری اور محصول گیری وغیرہ رائج تھی لیکن پھر بھی کس طرح خفارے کے نظام اور میلوں میں حفاظت کے انتظام وغیرہ نے مرکز گریز اور افتراق پسند بدویوں میں بھی ایک یکجہتی اور مرکزیت پیدا کر دی تھی۔

اوپر عکاظ کے میلے کی کچھ اہمیت ہم نے بیان کی کہ وہاں کس کس حصے سے لوگ آتے تھے۔ ہمارے مؤلفوں نے ایک اور اہم بات بھی بیان کی ہے کہ عکاظ میں عام نگرانی اور جھگڑوں کا فیصلہ، نیز اس کے بعد ہی ہونے والا موسم حج، قبیلۂ تمیم کے اہتمام میں ہوتا۔ قمری سال کو کبیسہ گری کے ذریعے سے فصلی شمسی سال بنانا بھی قبیلۂ تمیم کے قلمس کا فریضہ تھا جو مکہ معظمہ میں کعبے کے سامنے کھڑے ہو کر اس کا اعلان کرتا[۹]۔ قبیلۂ تمیم عرب کے (نوٹ ص ۲۴۳ پر)

انتہائی مشرق میں رہتا تھا اور عکاظ و مکہ انتہائی مغرب میں ہیں۔ حج کے زمانے میں مختلف فرائض مختلف قبائل میں چلے آتے تھے۔ علاوہ بنو تمیم کے آل صفوان اجازہ یعنی عرفات سے روانگی کا حکم دینا بطور موروثی حق کے استعمال کرتے تھے۔ کعبے کے اطراف جو تین سو ساٹھ بت تھے وہ عرب کے ہر حصے کے قبائل کے معبود تھے۔ ان میں حضرت ابراہیمؑ کے ساتھ حضرت عیسیٰؑ اور بی بی مریمؑ کے بھی کہتے ہیں کہ بت تھے۔ کیا یہ سب کعبے کی مرکزیت اور مکے اور قریش کی خاموش مرجعیت پر دلالت نہیں کرتے؟

ان میلوں کے ساتھ ساتھ اشہر حُرم یعنی محفوظ و محترم مہینوں کا ادارہ بھی قابلِ لحاظ اہمیت رکھتا ہے۔ نہ معلوم یہ عرب میں کیسے آیا اور کب سے رائج تھا۔ بہر حال حروب صلیبیہ کے زمانے میں فلسطین وغیرہ کے مسلمان عربوں سے اخذ کرکے پوپوں نے عیسائی یورپ کے تاراج کو کم کرنے کی اسی طرح کی ایک ناکام کوشش کی تھی جو خدائی امن (ٹروس آف گاڈ) کے نام سے مشہور ہے۔ عربوں کا یہ نظام زمانۂ جاہلیت میں یوں تھا کہ ذی قعدہ، ذی حجہ اور محرم کے مسلسل تین مہینے اور رجب کا ایک مہینہ محترم و محفوظ سمجھے جاتے۔ خطبۂ حجۃ الوداع میں "رجب مضر" کہا گیا آیا ہے۔ اس تخصیص سے معلوم ہوتا ہے کہ مضر کے علاوہ قبائل ربیعہ کا بھی کوئی الگ زمانہ محفوظ مہینوں کا ہوتا ہوگا۔ اوپر پڑھی ہوئی باتوں کی یاد تازہ کی جائے گی تو نظر آئے گا کہ رجب میں صحار اور دبا کے اہم میلے

(نوٹ ۲۴۴) ۔ ۱ محبّر محمد بن حبیب ص ۱۵ ۔

لگتے ۔ جہاں خود رسالت مآب صلعم کے نبوت سے پہلے جانے اور طویل مدت گزارنے کا مسند احمد بن حنبل میں اشارہ ملتا ہے[۵۱]۔ اور ذی قعدہ، ذی حجہ، اور محرم میں عکاظ، منیٰ، خیبر، اور یمامہ کے زبردست اجتماع ہوتے۔ یمامہ کا غلہ مکے تک آتا۔ ذی حجہ کا مکہ معظمہ میں حج اور منیٰ کا میلہ خاص کر خوش نصیب تھے کہ دور دراز کے لوگوں کو پورے تین مہینے امن کا یقین رہتا کہ جاکر واپس آنے تک چاہے وہ عرب کے کسی حصے سے آئے تک کیوں نہ ہو، کوئی خطرہ نہیں۔ کیونکہ ذی حجہ کے علاوہ اس سے ایک مہینہ پہلے اور ایک مہینہ بعد بھی حرام زمانہ رہتا جو عرب کے بعید ترین گوشوں سے آنے اور واپس جانے کے لئے کافی تھا۔ اس نے ناگزیر محافظین کعبہ یعنی قریش کی جو عظمت تمام عرب کے ذہنوں پر نقش کر دی ہوگی وہ کسی بیان کی محتاج نہیں۔ سیرۃ ابن ہشام[۵۲] کے مطابق اشہر حُرم کے ساتھ ایک ادارہ بَسل بھی تھا جس کے تحت قریش کے چند خاندانوں کو پورے عرب میں تین مہینے نہیں بلکہ مسلسل آٹھ مہینے محفوظ و مامون حالت میں ملتے۔

اس نظام کا اثر: تمام عرب سے لوگوں کا مکہ آنا اور مکے والوں کا عرب اور عرب کے باہر عراق و شام اور مصر و حبشہ تک مسلسل آیا جایا کرنا ۔۔۔۔ اس کے اثرات پر جتنا بھی زور دیا جائے کم ہی ہوگا۔ اس نے پورے عرب کی مختلف علاقہ وار

---

۵۱ مسند احمد بن حنبل جلد ۳ صفحہ ۳۰۶

۵۲ ص ۲۶ نیز قاموس فیروز آبادی تحت کلمہ "بسل"۔

بولیوں میں قربت پیدا کرکے ایک مشترکہ معیاری بولی پیدا کرنے میں حصہ لیا ہوگا، اس نے عربوں میں احساس یگانگی کو تقویت دی ہوگی، اس نے تمام عرب کے رسم و رواج اور اخلاق و عادات میں مماثلت پیدا کی ہوگی۔ اس نے ان میں محنت پسندی اور کوچ کی عادت اور تمام دنیا کو اپنا وطن سمجھنے کا میلان پیدا کیا ہوگا۔ اس نے ان کو عراق، شام، اور مصر کی خاص کر جغرافی اور طبیعی حالت سے واقف کرا دیا ہوگا جس کے باعث عہد نبوی اور خلافت راشدہ کی فاتحانہ پیش قدمی کسی اجنبی امداد کی محتاج نہ رہی ہوگی۔ اسی نے بیرون، خاص کر متمدن ممالک کے آئے دن کے سفر سے ان میں روشن خیالی، جذبات اور امنگیں پیدا کی ہوں گی۔ ایرانی اور رومی دونوں ان کے ساتھ سخت بدسلوکی کرتے تھے۔ خاص کر رومی علاقوں میں عرب کے کاروانوں کی جس سختی سے جھڑتی لی جاتی اور ان کے ساتھ جرائم پیشہ اقوام سمجھ کر جس توہین اور درشتی کا سلوک کیا جاتا اور جس طرح ان کے لئے مختلف علاقے مقرر کر دئے جاتے کہ ان کے سوا وہ شام و فلسطین میں کہیں اور نہ جائیں، اور سامان مقرر کر دئے جاتے کہ ان کے سوائے   اور چیزیں خرید کر نہ لے جائیں، ان پر شدید محصول جنگی عائد کئے جاتے وغیرہ وغیرہ[۵] ۔ تو ان چیزوں کا اثر حساس دماغوں اور سوچنے والے ذہنوں پر جو کچھ پڑ سکتا ہے وہ بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔ ایرانی بدسلوکیاں بھی کم نہ تھیں۔ ذی قار کے معرکے میں چند عرب قبائل نے ایرانی لشکر کو ایک دفعہ

۵ل تفصیل کے لئے میرا مذکورہ مضمون "عربوں کے تعلقات بیزنطینی حکومت سے"

شکست دی تو اس کے متعلق خود جناب رسالت مآب صلعم نے فرمایا تھا کہ اس دن پہلی مرتبہ عربوں نے ایرانیوں سے بدلہ لینے میں کامیابی حاصل کی ہے۔
متاخر کسرایان ایران کی عرب کش سیاست نے ایرانیائے ہوئے حیرہ کے عربوں اور شیبانیوں ایران کا جانی دشمن بنا دیا تھا۔ اور زیادہ تر انہیں عربوں نے تاج کیانی کو مدینے کے گلی کوچوں میں لا لٹکایا تھا۔

اسلام کی آمد | عرب کے معاشی نظام کی یہ عام کیفیت تھی کہ ربیع الاول سنہ ۱ھ میں تاریخ عالم کا ایک اہم اور عہد آفریں واقعہ پیش آیا۔ وہ یہ کہ تیرہ سال تک بے غرضانہ ایثار اور رضاکارانہ زحمت کشی کے ذریعے سے اہلِ مکہ کی اخلاقی و دینی اصلاح کی جو کوشش انہیں کے ایک ہم وطن یعنی حضرت محمد مصطفٰے صلی اللہ علیہ وسلم کر رہے تھے، اس کا انجام یہ نکلا کہ بیسیوں ساتھی مال و عیال کو چھوڑ کر یک بینی و دوگوش ترکِ وطن کو غنیمت سمجھ چکے تھے اور خود اس بے غرض مصلح کو جان کے لالے پڑے تو غاروں میں چھپتے، نامانوس اور دشوارگزار راستوں سے چلتے، وطن سے سینکڑوں میل دور مدینہ چلا آنا پڑا تھا۔ قریشِ مکہ نے اسی پر بس نہ کیا بلکہ ایک تو جلاوطن مسلمانوں کی جائیداد منقولہ و غیر منقولہ پر مکے میں غاصبانہ قبضہ جما لیا[۵۱]، دوسرے اپنے معاشی اثرات کے تحت اہلِ مدینہ کو دھمکا کر لکھ بھیجا کہ آنحضرت صلعم کو اپنے ہاں سے نکال دیں[۵۲] اور بزورِ اس کے ہوا نے کیلئے

---

۵۱ دیکھئے اوپر باب "دنیا کا سب سے پہلا تحریری دستور"

۵۲ ابن حبیب (محبر ص ۲۷۱ تا ۲۷۴)۔ ابن ہشام ص ۲۹۸ تا ۹۹۔

مدینے پر حملہ کرنے کا انتظام کرنے لگے۔ حتیٰ کہ ہجرت کے اس ابتدائی زمانے میں تارکین وطن مسلمان ہتھیار بند سویا کرتے تھے۔

مدینہ آنے کے چند ہی ہفتوں کے اندر ہم دیکھتے ہیں کہ اس شہر کی کایا پلٹ ہوگئی۔ یہاں کی قدیم آبادی میں جو خانہ جنگی اور چپقلش لڑائی ہو رہی تھی وہ ختم ہوگئی مہاجرین مکہ، مسلمانانِ مدینہ، مدینے کے غیر مسلم عرب اور یہودی قبائل ــــ ان چاروں عناصر نے ایک وفاقی شہری مملکت قائم کی جس کا تحریری دستور خوش قسمتی سے ہم تک محفوظ چلا آیا ہے۔ باون دفعات کے اس وفاقی دستور میں آخری اختیار سماعت مرافعہ، اور اعلیٰ اختیارات جنگ و صلح دونوں امور جناب رسالت مآب صلعم کو دیدینے پر سبھوں نے اتفاق کیا اور اس پر بھی سب راضی ہوگئے کہ قریش سے نہ تو کوئی تعلقات رکھے جائیں اور نہ انھیں یا ان کے دوستوں کو کوئی مدد یا حفاظت مہیا کی جائے۔ اس سلسلے میں یہ امر شاید درخور التفات سمجھا جائے گا کہ اس زمانے میں جب یہود نہ صرف مدینے کے مقامی کاروبار پر چھائے ہوئے تھے بلکہ شام سے یمن۔ وعمان تک ان کی نوآبادیوں کا ایک زنجیرہ پڑا ہوا تھا اور بین الیہود باہمی تعاون خاصا مستحکم تھا تو مدینے کے یہودیوں سے اشتراک عمل نوخیز اسلامی مملکت کے لئے کم از کم یہ فائدہ ضرور رکھتا تھا کہ یہ معاشی قوت اس ابتدائی بے کسی کے زمانے میں مخالف پلڑے میں نہیں داخل ہوگئی۔ گھر سے فراغت ہوتے ہی آنحضرتؐ مدینے سے ینبوع کا کئی بار سفر فرماتے ہیں اور ان مختلف قبائل سے جو اس راستے پر بستے تھے یا تو حلیفی کے نئے معاہدے کرتے ہیں یا اہلِ مدینہ کے ان کے ساتھ جو قدیم معاہدے تھے اُن کی تجدید عمل میں لاتے ہیں۔

ایسے بعض معاہدوں میں مدامی فوجی حلیفی اور باہمی امداد کا ذکر ہے۔ اور بعض میں باہم دوستی اور ایک کی جنگ میں دوسرے کی غیر جانبداری اور دشمن کو مدد نہ دینے کا حکم ہے۔

اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ ایک معاشی قصہ ہے۔ قریش کا شام، مصر اور عراق جانے والا راستہ مدینے اور ینبوع کے بیچ میں سے ساحل کے کنارے کنارے گزرتا تھا۔ قریشی مواصلات تجارت اور روزگار کی یہ شہ رگ اب بیک جنبش اب کٹ گئی اور ادھر سے قریشی کاروانوں کا جانا بند کر دیا گیا۔ قریش نے تھوڑی سی کشمکش کی۔ بدر، اُحد اور خندق کے معرکے پیش آئے لیکن قریش کے حلفا کا شمالی راستہ کھلنا تو کیا، اس کے لئے نجد وغیرہ سے ہو کر جانے والے نئے نو ساختہ راستے بھی بند ہی ہوتے چلے گئے[۹۱]۔ قریش کی تجارت مفلوج ہوئی تو وہ ہمسایہ قبائل جو انہیں کے کاروبار پر پل رہے تھے، خواہی نخواہی قریش سے ٹوٹ کر ہم سے جڑنے پر مجبور ہوتے چلے گئے اور تاریخوں میں صراحت سے ایسے نظائر کا ذکر آیا ہے[۹۲]۔ آنحضرتؐ کی سیاست قریش کو تباہ و نابود کرنے پر نہیں بلکہ بالکل محفوظ رکھ کر بے بس اور مغلوب کر دینے پر مشتمل تھی۔ پانچ چھے ہی سال کی کوشش میں مکے کے شمال، مکے کے مشرق بلکہ مکے کے جنوب کے قبائل بھی اسلام کے زیر نگیں بنا لئے گئے۔ اور جب یہ گھیرا مکمل ہو گیا تو بجائے شرائط منوانے کے

---

۹۱ سیرۃ ابن ہشام صفحہ ۵۴۷

۹۲ طبقات ابن سعد جلد ۲ صفحہ ۴۹ (اشجع)

آنحضرت صلعم نے قریش کی منہ مانگی شرطیں حدیبیہ میں منظور کیں۔ یہ سیاست کاری کا شہ کار تھا۔ قریش کا چڑھتا ہوا جوش اور تجار اس صلح کے سیفٹی ڈالف (safety valve) سے خارج ہوگیا۔ عین اس لمحے خیبر کے یہودیوں اور مکے کے قریشیوں میں اتحاد ہوکر ایک نئے طاقتور محاصرۂ مدینہ کی جو تجویز تیار ہو چلی تھی وہ روک دی گئی۔ کیونکہ قریش نے اپنی منہ مانگی شرطوں کے ملنے اور تجارت کا شمالی راستہ کھلنے پر وعدہ کیا تھا کہ وہ دس سال تک آنحضرت ؐ سے نہ تو خود جنگ کریں گے اور نہ کسی اور کو کوئی خفیہ یا علانیہ مدد دیں گے۔ بلکہ مسلمانوں کی جنگوں میں کامل ناطرفدار رہیں گے۔ اسی صلح سے آنحضرت صلعم کو یہ فائدہ ہوا کہ خارجہ سیاست کے لئے ہاتھ کھل گئے۔ خطرے کے مرکز خیبر کو مہینے بھر میں ہمیشہ کے لئے مٹا دیا گیا نینوا میں رومیوں کو ایران پر جو فیصلہ کن فتح حاصل ہوئی تھی اس سے فائدہ اٹھا کر بحرین، عمان، وغیرہ کا ایران سے انقطاع اور مدینے سے الحاق کرالیا اور قریش کے رہے سہے وسائل اور رفیق ان سے چھڑا دیئے گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دو ہی سال گزرے اور قریش نے ایک چھوٹا سا قصور کرکے معاہدہ شکنی کی اور مدینے سے دس ہزار قدوسیوں کا لشکر آیا تو مغرور قریش نے اپنے آپ کو اتنا بے بس پایا کہ بغیر ایک ہتھیار چلائے اطاعت قبول کرلینے ہی میں خیر دیکھی۔ اور آنحضرت ؐ نے بھی قریش کو محفوظ رکھ کر مغلوب بنانے کی جو سیاست ملحوظ رکھی تھی اس کے باعث ان کے بیس سالہ مظالم کا جواب اس "تاریخی جملے" سے دیا کہ "آج تم پر کوئی مواخذہ نہیں۔ جاؤ تم سب آزاد ہو۔"

ہم دیکھ چکے ہیں کہ عرب کے بین الممالک کاروبار کا پورا ڈھانچہ قریشی کاروباً

کے سنگ زاویہ پڑ چکا ہوا تھا۔ اور جب قریش ایک مرتبہ ہم نوا[سلہ] ہو گئے تو دو ہی سال کے اندر پورا جزیرہ نمائے عرب ایلہ و اذرح سے لے کر عمان تک اور سماوہ سے لے کر معافر تک ایک ہی قبلے کی طرف جھک رہا تھا، اور ایک ہی مرکز سے وابستہ ہو چکا تھا۔ اور جب ذی حجہ سنہ ۱۰ھ میں حجۃ الوداع کے موقع پر جبل الرحمۃ سے آنحضرت صلعم نے اپنے شہرۂ آفاق طویل الوداعی خطبے[سلہ] میں ایک منشورِ انسانیت پیش کیا کہ عرب کو عجم پر کوئی فضیلت نہیں، سب انسان آدمؑ سے پیدا ہوئے اور آدمؑ مٹی سے بنے تھے، اور قومیتیں اور قبائل صرف تعارف اور پہچاننے کی علامتیں ہیں ورنہ اصل عزت تو خدا سے ڈرنے کے مدارج پر مبنی ہے۔ جب یہ منشورِ عبدیت

سلہ قریش کی ہمنوائی سے قبل جو علاقے مملکت اسلامیہ میں داخل ہوئے تھے، ان کو اس الحاق کی تشویق مختلف وجوہ سے ہوئی۔ چنانچہ اس کے مذہبی و روحانی وجوہ بھی ہیں، سیاسی اور فوجی وجوہ بھی ہیں، اور معاشی وجوہ بھی۔ ایک اہم معاشی وجہ یہ بھی نظر آتی ہے کہ اسلام سے پہلے عرب کی ہر بستی اور ہر میلے اور بازار میں محصول چنگی لیا جاتا اور بیرون عرب جو کاروان عرب لے جاتے، ان سے بھی سخت شرح سے محصول لیا جاتا تھا۔ عہد نبوی میں مختلف قبائل سے مملکت اسلامیہ کے جو معاہدے ہوئے اُن میں سے اکثر میں صراحت سے عشر یعنی اس اندرونی محصول چنگی کی برخاستگی کا ذکر ہے۔ چنگی کے اس اتحاد سے اندرونی گردشِ مال اور تجارت کو غیر معمولی فروغ ہوا اور اس کے برکات نے سیاسی اتحاد کو قریب تر اور مستحکم تر کرنے میں یقیناً بڑا حصہ لیا ہوگا۔ جیسا کہ دیگر ممالک کی تاریخ میں مماثل امور نظر آتے ہیں، اور جس سلسلے میں جرمن مملکتوں اور قبیلوں کے (Zollverein) چنگی کے اتحاد کی طرف اشارہ کافی ہوگا۔

سلہ اس کے متن کے لئے دیکھئے میری "الوثائق السیاسیۃ" بر موقع۔

انسانیت نہ صرف پیش کیا گیا بلکہ اس پر کامیاب عمل بھی کر کے دکھا دیا گیا تو پھر نبی عربی صلعم کا کام ختم ہو گیا اور تین ہی ماہ بعد آپ رفیق اعلیٰ سے جا ملے۔

اس اولین مملکت اسلامیہ کے قیام میں خود جناب رسالت مآبؐ کا جو کردار کارفرما رہا اور اس کے جو سیاسی، جغرافی، تمدنی، تاریخی، اخلاقی، نفسیاتی، وغیرہ وغیرہ عوامل رہے جنہوں نے عربوں کو اس زمانے میں اس انقلاب کے لئے تیار کیا اور اس انقلاب کے لئے مواقع فراہم کئے اور پھر عربوں کے کردار کی قبل اسلام کی صدیوں میں پرورش و پختگی اور عہد اسلام میں اس کا صیقل و جلا کاری وغیرہ وغیرہ یہ جیسیوں مسائل ہیں جو مستقل مقالوں کے محتاج ہیں یہاں یہ دکھانے کی کوشش کی گئی کہ کس طرح ایک ملک کا معاشی پس منظر اس کی قسمت سازی میں حصہ لیتا ہے اور کس طرح ایک ادارے کی سب سے بڑی قوت ہی اس کی سب سے بڑی کمزوری ہوتی ہے۔ اور کس طرح اس کمزوری سے بروقت اور صحیح فائدہ اٹھانا اپنے مقصد کو پورا کراتا ہے اور کس طرح حریف کی صلاحیتوں کو تباہ و تاراج کرنے کی جگہ اس قوت کو بھی اپنا ہم نوا بنا لیا جائے تو دنیا میں وہ کارنامے انجام پاتے ہیں جو معجزہ اور اعجوبہ کہے جاتے ہیں کہ عہد نبوی میں دس سال میں دس لاکھ مربع میل کا علاقہ تاراج اور طوائف الملوکی چھوڑ کر مرکزیت اختیار کرتا ہے اور اس کے بعد کے پندرہ سالوں میں انہیں اصول پر عمل کر کے اس وقت کی دو عالمگیر سلطنتوں کو بیک وقت اپنے حملے کا ہدف بنا کر ۳۵ ہجری تک اپنا جھنڈا حضرت سیدنا عثمانؓ کے زمانے میں مغرب میں شمالی افریقہ سے گزر کر اسپین میں اور مشرق میں ترکستان سے گزر کر چین میں اور جنوب میں خراسان سے گزر کر

بھروچ و تھانہ یعنی بمبئی میں اور شمال میں آرمینیا اور ممالک خزر میں پہنچا دیا جاتا ہے۔ اور یہ انسانیت کی شہنشاہت Imperialism of Humanity تھی جس میں ہر حاجت مند فردیت کو حکومت روٹی مہیا کرتی اور کسی کی آزادیٔ عمل میں کوئی رکاوٹ ڈالے بغیر اجتماعیت کا مظاہرہ کرتی تھی جس میں حکومت اور رعایا ایک ہی چیز تھے چنانچہ دونوں ایک دوسرے کے ظاہر و باطن میں بھی خواہ و معاون تھے۔

یہ چند اشارے ہیں جن سے سوچنے والے دماغ کچھ نہ کچھ غذائے فکر پا سکتے ہیں۔

(مجموعہ مقالات علمیہ حیدرآباد اکاڈمی ۵)

۱۳۶۲ھ
۱۹۴۳ء

صفحہ (۱۷۶) کا حاشیہ:-

استصواب کے سلسلے میں عتاب بن اسید گورنر مکہ نے نومسلموں کو سابقہ قرض کا واجب الادا سود دلانے یا نہ دلانے کے متعلق آنحضرت سے دریافت کیا تھا (تفسیر طبری و خازن میں آیت "ما بقی من الربوا" کے تحت) اسی طرح استصواب، مرافعہ، نگرانی یا تصحیح (معلوم نہ ہو سکا کس) کے سلسلے میں آنحضرت نے ایک افسر الضحاک بن سفیان کو لکھ بھیجا کہ اشیم ضبابی کی بیوی کو اس کے شوہر کے خون بہا میں سے ورثہ دلائے (الوثائق السیاسیہ)

عہدِ نبوی کی سیاست کاری کے اصول

ایک شخص جس کو وطن میں جان کے لالے پڑے ہوں، صرف ایک رفیق کے ساتھ غاروں میں چھپنا، نامانوس اور دشوار گزار راستوں پر چلنا، سینکڑوں میل دور جا پناہ گزیں ہوا ہو، وہ دس ہی سال بعد جب انتقال کرتا ہے تو دس لاکھ مربع میل[۵۱] کے علاقے پر حکمران ہو چکا تھا۔

پھر اس علاقے میں جہاں اس سے پہلے کبھی سیاسی مرکزیت آئی ہی نہ ہو اور ملک قبائلی سطح تمدن سے بلند نہ ہو سکا ہو، اس نراج میں ایک راج قائم کرے اور بغیر کسی نمونے کے سامنے رکھے ایک باقاعدہ مملکت کی ضرورت کی ہر چیز رائج کرے اور ایک ایسی حکومت قائم کرے جس کا آغاز ایک شہر کے چند محلوں سے ہو اور جو (۲۷) ہی سال میں دنیا کی دو عظیم ترین شہنشاہیتوں[۵۲]

---

۵۱ آنحضرت صلعم کی وفات کے وقت پورا جزیرہ نمائے عرب اور جنوبی فلسطین آپ کے زیرِ نگیں آ چکا تھا تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو:- میری فرانسی تالیف "عہدِ نبوی اور خلافت راشدہ کی اسلامی سیاست کاری" دو جلدیں۔

۵۲ ایران اور بیزنطینی حکومتیں اس وقت کی دو عالمگیر سلطنتیں (World Powers) تھیں۔

سے وقت واحد میں لڑکر اور بیسیوں دیگر سلطنتوں کو شکست دے کر ایشیا، افریقا اور یورپ کے تین بر اعظموں پر پھیل جائے جیسا کہ اوپر باب عہدی مملکت مکہ میں بیان ہوا۔

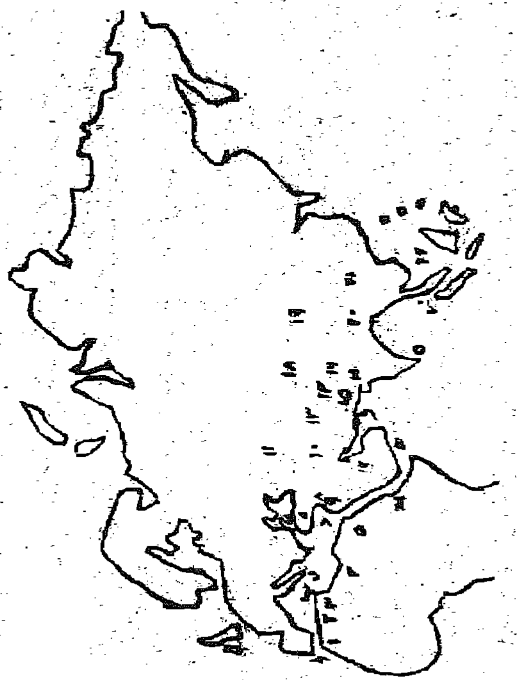
اس سیاست کا مطالعہ صرف ایک عظمت ماضیہ کا مطالعہ ہی نہیں ہے بلکہ ایک ایسی شخصیت کے کارناموں کا مطالعہ ہے جس کے ہر قول و فعل کو اب بھی دنیا کی چوتھائی آبادی اپنا قانون اور اپنے لئے اسوۂ حسنہ سمجھتی ہے۔ اگرچہ انسانوں کا یہ گروہ دنیا کی چوتھائی آبادی پر مشتمل ہے لیکن ایک تو یہ "مشارق الارض" سے "مغارب الارض" تک پھیلا ہوا ہے[۵۱]، دوسرے پرانی دنیا کی اکثر اہم شاہراہوں پر سیاسۃً نہیں تو سکونۃً قابض ہے[۵۲]، تیسرے زیادہ تر جنگی نسلوں پر مشتمل ہے[۵۳]، چوتھے عظیم الشان اور قابل رشک تاریخ رکھتا ہے جس کے پچھلے کارہائے نمایاں ہمیشہ امکانات کے خوش آئند ارادے اور ولولے پیدا کئے بغیر نہیں رہ سکتے، پانچویں یک نسلی نہ رکھنے کی وجہ سے ہمیشہ اس کا کوئی نہ کوئی جزو "میثاقِ اختلاط" کو ختم کر کے نئی زندگی کا ثبوت دیتا رہتا ہے، چھٹے ابھی تک اس کا پھیلاؤ رکا نہیں اور انتہائی ناسازگار مقاموں میں زبردست ترین

---

۵۱ دیکھئے نقشے میں مراکش، الجزائر، تونس، طرابلس، مصر و سودان، ترکی و شام، حجاز، عراق و ایران، افغانستان، پنجاب و سندھ، ترکستان، بنگال، ملتان، ملایا۔

۵۲ دیکھئے نقشے میں آبنائے جبل الطارق، آبنائے طرابلس، آبنائے داردنیل، باسفورس، نہر سویز، آبنائے باب المندب، آبنائے عمان، آبنائے ملاقہ۔

۵۳ عرب، ترک، پٹھان، بلوچی وغیرہ مراد ہیں جن کی تعداد بیس کروڑ سے کم نہیں ہے۔ ملایا میں سرکاری اعداد کے موافق ساڑھے چھ کروڑ مسلمان ہیں۔ ان کو خارج رکھا گیا ہے۔

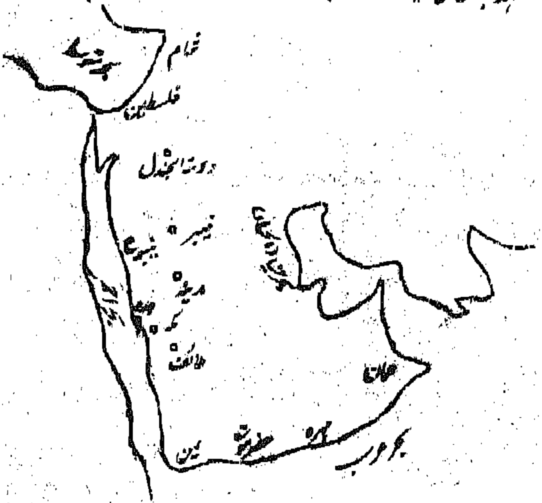


علامات

ا - جبل الطارق	۱ - مراکش	۱۲ - عرب
ب - آبنائے طرابلس	۲ - الجزائر	۱۳ - ایران
ج - بوسفورس	۳ - تونس	۱۴ - افغانستان
د - سویز	۴ - طرابلس	۱۵ - بلوچستان
ھ - باب المندب	۵ - مصر	۱۶ - کشمیر و پنجاب
و - آبنائے عمان	۶ - سوڈان	۱۷ - سندھ
ز - آبنائے ملاقہ	۷ - ترکی	۱۸ - بخارا
	۸ - شام	۱۹ - ترکستان
	۹ - فلسطین	۲۰ - بنگال و آسام
	۱۰ - عراق	۲۱ - چینان
	۱۱ - قفقاز	۲۲ - ملایا و جاوا

اور منظم حریفوں[51] کو شکست دے رہا ہے اور اس کے پرانے ساڑھے تیرہ سو برس پہلے کے قاعدے متمدن ممالک میں بھی ضروریات حاضرہ کے مطابق خیال کئے جا رہے ہیں[52]۔ وغیرہ وغیرہ۔

عہد نبوی کی سیاست خارجہ کے اصول دو حصوں میں تقسیم کئے جا سکتے ہیں۔



---

[51] مثلاً جنوبی افریقہ میں۔ گو اب جیسے متعصب کیتھلک علاقے میں نو مسلم موجود ہیں۔ نو مسلم نیپالی بھی نایاب نہیں ہیں۔

[52] مثلاً ہندوستان میں یہ ایک عجیب نظارہ ہے کہ بعض قومیں قانون کے ذریعے اپنے مذہب کو بدل رہی ہیں تو مسلمان شریعت اپلیکیشن ایکٹ وغیرہ کے ذریعے رواج کے زنگار کو دور کر رہے ہیں۔ پارس کے پروفیسر ماسینیوں نے اپنے ایک حالیہ مضمون میں لکھا ہے کہ سرمایہ داری اور اشتراکیت کا تصادم اس تمدن کے لئے امکانات بڑھا دیتا ہے جو سود کو حرام سمجھتا ہے۔

بعض ایسے تھے جو عام اور ہمہ گیر تھے اور ہر حال میں اور ہر کسی کے ساتھ ملحوظ رہتے تھے اور بعض ہر انفرادی معاملت کے ساتھ بدلتے ہوئے تھے - اور یہ ناگزیر بھی تھا کہ :-

۱ - اپنے ظالم وطن مکہ

۲ - عرب کے غیر عربی عناصر خاص کر یہودی قبائل -

۳ - خانہ بدوش عرب قبائل -

۴ - عرب کے حضری زندگی رکھنے والے شہر یا شہری مملکتیں مثلاً طائف -

۵ - عرب میں بیرونی دخل انداز یعنی ایرانی اور رومی صوبے، محفوظات، نو آبادیاں وغیرہ -

۶ - عرب کے ہمسایہ ملک -

وغیرہ وغیرہ میں سے ہر ایک کے ساتھ آنحضرت صلعم کی " سیاست کاری"[۵۱]

---

۵۱ Diplomacy کی اصطلاح خود یورپی زبانوں میں اپنے لغوی معنوں سے بہت دور جا پڑی ہے بعض وقت اس سے مراد محض سفارتی تعلقات ہوتے ہیں بعض وقت اس سے مراد سیاست خارجہ ہوتی ہے، اور بعض وقت سفیروں اور وزرائے خارجہ کی کارکردگی مراد ہوتی ہے اسی آخری مفہوم کے لئے " سیاست کاری " کا لفظ برتا گیا ہے جو مکرم ڈاکٹر یوسف حسین خاں صاحب کا تجویز کردہ ہے - یہ ضروری نہیں کہ ہر جگہ یہ لفظ کام دے سکے لیکن لفظ قابل اشتقاق ہونے اور مفہوم کو اچھی طرح واضح کر سکنے کی بنا پر کافی کارآمد معلوم ہوتا ہے -

خصوصی مسائل سے دوچار ہوا اور ان کو حل کرنے کے لئے وہ ہر جگہ الگ اور بدلی ہوئی رہے۔ بطور ذیل میں آنحضرت صلعم کی شہر مکہ سے برتاؤ کی سیاست پر بحث کی جائیگی۔

مکہ کی اہمیت | شہر مکہ کا، قدیم جغرافیہ نگاروں کے الفاظ میں "ناف زمیں" پر ہونا، چاہے اسلام کی عالمگیر توسیع میں کتنا ہی مدد و معاون رہا ہو، لیکن یہاں زمانہ ہائے مابعد سے ہمیں کوئی بحث نہیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ عہد نبویؐ میں اس کو کیا اہمیت حاصل تھی۔ ہمیں ان مشنری پادریوں کا لحاظ کرنے کی کوئی ضرورت نہیں جو مصلحۃً مکہ اور مکے والوں کو کوئی اہمیت دینا نہیں چاہتے۔ اسی طرح ان روحانی عظمتوں یا دیگر لاحاصل قصوں سے بھی یہاں سروکار نہیں جو کرۂ ارض کے بننے میں مکے کے حصے وغیرہ سے متعلق ہیں۔

شہر مکہ میں جو عرب بستے تھے وہ قریش کے نام سے یاد کئے جاتے ہیں۔ ان کے تجارتی تعلقات کی اہمیت کا اندازہ اس واقعے سے ہوسکتا ہے کہ چونکہ اس زمانے میں جزیرہ نمائے عرب میں کوئی مرکزی حکومت نہ تھی اور ہر قبیلہ اپنے رہنے سہنے کے جنگلوں، پہاڑوں میں انتہائی خود مختاری برتتا تھا اور اس کے علاقے سے گزرنے کے لئے زمانۂ حال کے پاسپورٹوں سے بھی زیادہ دشواریاں تھیں، اس لئے کاروانوں کے سفر کرنے اور بین الممالک تجارت کے عرب سے گزرنے کے لئے خفاروں اور بدرقوں کا ایک وسیع اور ترقی یافتہ نظام وجود میں آگیا تھا۔ اس نظام نے عرب میں سیاسی تو نہیں لیکن ایک معاشی وفاق ضرور قائم کر دیا تھا۔ اس وفاق میں قریش کے موقف کا اندازہ مشہور مورخ محمدؐ بن حبیب (فوت ۲۴۵ھ) کے اس بیان سے ہوسکتا ہے۔

"ہر تاجر جو یمن یا حجاز سے وہاں (دومۃ الجندل جو عرب کے شمال میں ہے) جانا چاہتا ہے تو جب تک قبائل مضر کے علاقے سے گزرنا ہو، قریشی خفارے کے خدمات حاصل کرتا کیونکہ نہ تو کوئی مضری اور نہ مضریوں کا کوئی حلیف قریشی خفارے کو تکلیف دیتا۔ چنانچہ قبائل کلب (بنی الجشم سے حلیفی کے باعث) اور قبائل طئی[سلہ] (بنی اسد سے حلیفی کے باعث) قریشیوں کو نہیں چھیڑتے تھے۔ قبائل ربیعہ کے پورے علاقے میں تاجر اپنے لئے بنی عمرو بن مرثد کا خفارہ حاصل کرتے تھے ...... بحرین کے صدر مقام المشقر کو جانے کے لئے بھی قریشی خفارہ حاصل کیا جاتا تھا ...... جنوبی عرب میں مہرہ جانے کے لئے بنی محارب کا خفارہ لیا جاتا تھا ...... حضر موت کے سوق رابیہ جانے کے لئے قریشی کاروان بنی آکل المرار کے خدمات حاصل کرتے تھے ...... جس کے باعث آکل المرار جلد اپنے حریفوں پر غالب ہو گیا ...... عکاظ عرب کا سب سے بڑا سالانہ

سلہ عربی ادبیات میں قبیلہ طئی لٹیروں کی حیثیت سے ضرب المثل ہے۔ یہ عربوں کے "شہر حرم" تک کی پروا نہیں کرتا تھا۔ پروفیسر کرینکو نے لکھا ہے کہ اس قبیلے کے لوگ زیادہ تر عیسائی تھے اسی لئے عربی بدویوں کے معتقدات کی وہ پابندی کرنے پر قابل ملامت نہیں۔ لیکن لوٹ مار نہ کرنے کی مخالفت رکھی عیسائیت ہے!۔

میلہ تھا جس میں تمام عرب کے قبائل سامان لاتے تھے مثلاً قریش، ہوازن، غطفان، عضل، وبش، حیاء، مصطلق، احابیش وغیرہ[۵۹]۔

اس کے سوا زمانۂ جاہلیت میں قریش اپنے حج کے سلسلے میں مکے کے مضافات میں منیٰ میں جمع ہوتے تھے۔ ۳ ق ھ میں بیعتِ عقبہ کے سلسلے میں مورخین نے ذکر کیا ہے کہ اہلِ مدینہ سے ملنے سے پہلے آنحضرت صلعم پندرہ قبائل کے پڑاؤوں میں تبلیغ کے لئے گئے تھے۔ ان میں سے کندہ عرب کے انتہائی جنوب میں رہتے تھے۔ کلب انتہائی شمال میں دومۃ الجندل میں بستے تھے۔ بنی حنیفہ بحرین کے پاس انتہائی مشرق میں آباد تھے۔ ان کے علاوہ وہاں یمن کے اور مدینے کے، غرض عرب کے ہر حصے کے لوگ آتے تھے اور یہ ہر سال ہوتا تھا۔

غالباً یہی وجہ تھی کہ ۸ھ میں مکہ فتح ہوا تو ۹ھ تاریخ اسلام میں "عام الوفود" (سفارتوں کا سال) کے نام سے مشہور ہوا کیونکہ عرب کے ہر حصے سے مدینے میں سفارتیں ٹوٹ پڑیں اور فاتح مکہ کے مذہب اور فاتح مکہ کی حکومت کو ماننے کا اعلان کرتی گئیں اور یہ سفارتیں بھی عرب کے ہر حصے سے آئی تھیں۔

جیسا کہ اوپر عرض ہوا، سیاستِ نبویؐ کے چند اصول عام اور ہمہ گیر تھے پہلے انھیں کا مختصر ذکر کیا جاتا ہے۔ یہ مکے سے مقابلہ کرنے میں بھی اتنے ہی ملحوظ رہے جتنے دیگر سیاسی وحدتوں کے سلسلے میں۔

---

۵۹ کتاب المحبّر باب اسواق العرب۔

۱۔ تبلیغ رسالت

سب سے پہلا اصول جو ہر حالت میں پیش نظر رہا وہ یہ تھا کہ جس مشن اور مقصد کو لے کر آپ آئے تھے اس کی اشاعت ہو۔ اس غرض کیلئے ذاتی یا مالی منفعت اور خواہش انتقام کو نظر انداز کرنا بھی گوارا کیا جاتا تھا۔ چنانچہ جب آنحضرت صلعم نے شہر مکہ کو بلا شرط اور بزور فتح کر لیا تو یہ بہت آسان تھا کہ اس مالدار شہر کو آپ لوٹ لیتے اور مہاجرین کی مقبوضہ جائیدادوں اور دیگر کثیر جسمانی اور مالی نقصانوں کا بدلہ لیتے۔ ابوسفیان گرفتار ہو کر ہاتھ آتے تو کچھ نہیں تو ان سے چند ہزار کا فدیہ ہی طلب کرتے۔ قریش کی پیشکش پر آپ نے فرمایا کہ "یہ تو کیا اگر میرے ایک ہاتھ پر چاند اور دوسرے پر سورج توڑ کر لا رکھو تو بھی تبلیغ دین سے باز نہیں آسکتا۔"

۲۔ اندرونی استحکام

کوئی بڑی سے بڑی سلطنت بھی جو سخت اندرونی خلفشار میں مبتلا ہو اکثر حقیر اور کمزور دشمنوں تک کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ تاریخ عالم اس کی مثالوں سے بھری ہوئی ہے۔ یہاں اس اصول مسلمہ کا بیان مقصود نہیں ہے بلکہ یہ دکھانا ہے کہ ناگزیر باہمی اختلافات کو کس طرح رد کا یا دور کیا جاتا تھا اور کس طرح اختلافات کو مٹانے سے اپنی قوت میں اضافہ ہوتا تھا۔

جس وقت آنحضرت صلعم ہجرت کر کے مدینہ آگئے ہیں تو مسلمانان مدینہ اوس اور خزرج کے دو رقیب اور خون کے پیاسے گروہوں میں بٹے ہوئے تھے اور ابھی بعاث کی معرکہ آرائی کا خون بھی خشک نہیں ہوا تھا۔ ان دونوں متصادم قوتوں

کی سرداری کوئی قابل رشک حالت نہیں کہی جا سکتی۔ جس طرح آج اسلامی مبلغین کو ممالک متحدہ امریکہ میں ایک حل نہ ہونے والی گتھی سے سابقہ ہے کہ وہاں حبشیوں میں تبلیغ کرو تو وہ کہتے ہیں آمنا لیکن آپ گوروں کی رنگ پر اترانے والی تنگ انسانیت، قوم کو اسلام کے برکات سے ہرگز متمتع نہ ہونے دیجئے۔ اور گورے نومسلم نہیں چاہتے کہ حبشی بھی مسلمان ہو کر ان سے سماجی مساوات حاصل کریں۔

عرب کے خانہ بدوش بدو آج بھی اپنے حضری اور بستیوں میں رہنے والے بھائیوں کو سخت حقارت سے دیکھتے ہیں۔ عہد نبویؐ میں تو حضری آبادی آج سے بھی کم تھی۔ فوجی مہموں میں بدوی رضاکاروں کا ضبط جیسی صبر آزما چیز ہوگی محتاج بیان نہیں۔

سب سے مقدم یہ کہ، ہجرت کر کے مدینہ آنے تو وہاں ایک نراج تھا۔ ایک شہری مملکت تک نہیں پائی جاتی تھی چند مدنی عرب قبائل مسلمان ہو گئے تھے اور چند میں ابھی تک اسلام پوری طرح نہیں پھیلا تھا۔ ان کے ساتھ ہمسائے میں ہزاروں کی تعداد میں یہودی رہتے تھے جو زراعت، تجارت، صنعت غرض جملہ معاشی زندگی پر حاوی تھے۔ ان میں بھی آپس میں خونریز اور اُمٹ رقابتیں تھیں اور ان کا اپنا ایک مذہب اور تمدن تھا اور ان سے اسلام قبول کرنے کی اتنی بھی توقع نہ تھی جتنی لامذہب بدوؤں کی۔ ان سب کے ساتھ سینکڑوں مہاجرین تھے جو مکے کے بیسیوں قبائل سے تعلق رکھتے تھے ——— ان تمام عناصر میں ایک وفاقی وحدت پیدا کرنا اور مدینے میں ایک شہری مملکت قائم کر کے اس کا ایک دستور مرتب کرنا اور اس کے ذریعے سے راعی و رعایا کے حقوق و فرائض کا تعین کرنا اور

پھر ان تمام متصادم اور ضائع ہونے والی توانائیوں کو ایک مرکز پر لا کر ان سے مفید کام لینا، یہ ابتداءً سیاست خارجہ ہی کے مسائل تھے اور طے ہو چکنے کے بعد اندرونی مسائل بن گئے۔

مدینے کی حفاظت کے لئے علاوہ اس اندرونی استحکام کے اس کی ضرورت تھی کہ آس پاس کے قبائل سے دوستی کی جائے، چنانچہ ہجرت کے چند مہینے بعد ہی آنحضرت صلعم مدینے کے جنوب مغربی اور ساحل سے متصل علاقے کا بار بار دورہ شروع کرتے ہیں اور ینبوع وغیرہ میں رہنے والے قبائل سے حلیفی کرتے ہیں کہ ان پر کوئی حملہ کرے تو مسلمان ان کو مدد دیں گے اور مسلمانوں پر کوئی حملہ کرے تو یہ مدد کو آئیں گے۔ بعض معاہدات میں آنحضرت صلعم کے دشمنوں سے دوستی نہ رکھنے کی شرط منظور کی گئی تھی، بعض میں اتنی پابندی بھی نہ تھی اور قبیلہ غیر جانبدار رہنے پر آمادہ ہوا تھا، بعض میں مسلمانوں کی دینی لڑائیوں میں ان قبائل کو مدد دینے کی پابندی سے مستثنیٰ کیا گیا تھا۔ بہرحال مدینے کے چاروں طرف دوستوں میں اضافہ اور مخالفوں میں کمی کی مسلسل کوشش جاری رہی، (تفصیلات کے لئے الوثائق السیاسیہ اور فرانسیسی مقالہ "اسلامی سیاست خارجہ عہد نبوی اور خلافت راشدہ میں" ملاحظہ ہوں)

ایک اور اصول یہ قرار دیا گیا تھا کہ عرب میں جو شخص یا خاندان یا قبیلہ مسلمان ہو، وہ ہجرت کر کے مدینہ یا مضافات میں آ بسے۔ یہ سیاست فتح مکہ تک باقی رہی (لا ہجرۃ بعد الفتح مشہور حدیث اسی سیاست کے اختتام کا اعلان تھی) اور بہت کم اس سے استثناء منظور کیا جاتا تھا۔ اس سیاست کا نتیجہ دوگونہ تھا

مسلمان فوج کے لئے محفوظ رضاکاروں میں روز افزوں اضافہ اور ان نومسلموں میں اسلام کی گہرائی۔

۳۔ انسانی خون کی عزت

عہد نبوی میں دس سال میں دس لاکھ مربع میل کا علاقہ فتح ہوا جس میں یقیناً کئی ملین آبادی تھی۔ اس طرح روزانہ تقریباً (۲۷۴) مربع میل کے اوسط سے دس سال تک فتوحات کا سلسلہ ہجرت سے وفات تک جاری رہا۔ ان فتوحات میں دشمن کا ماہانہ ایک آدمی قتل ہوا، اسلامی فوج کا نقصان اس سے بھی کم ہو۔[۹۵] ایک حدیث میں ارشاد نبوی ہے (انا نبی الرحمۃ انا نبی الملحمۃ (میں رحمت کا پیغمبر ہوں، میں جنگ کا پیغمبر ہوں) اس کا اس سے بہتر ثبوت کیا ہو سکتا ہے دشمن کے (۷۰) آدمیوں کا مارا جانا (جنگ بدر میں) سب سے بڑی تعداد ہے۔ یاد رہے کہ یہ عہد نبوی کی سب سے پہلی جنگ تھی۔

۴۔ فنون حرب کی ترقی و استفادہ

دشمن کو بے بس کر دینے اور ساتھ ہی خونریزی کو کم ترین حد تک گھٹا دینے کے لئے ایک ہی طریقہ ہو سکتا ہے کہ فنون حرب میں اتنا کمال حاصل کیا جائے کہ حریف مقابلہ ہی نہ کر سکے۔ اس غرض کے لئے ہر اچھی چیز، چاہے کسی ملک کی ہو، اختیار کی گئی۔

---

۹۵ کچھ اور تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو کتاب قانون بین الممالک، صفحہ ۲۰۰۔

عربوں میں صف بندی کا رواج نہ تھا۔ جوش کا بے وقت اور بے محل استعمال
اور اسلحہ کا بیکار خرچ بھی عام چیز تھی۔ جنگ بدر ہی سے آنحضرت صلعم نے اپنے
سپاہیوں میں صف بندی شروع کر دی تھی اور معاینے میں جو آگے پیچھے نظر
آتا تھا اُسے درست کیا جاتا تھا۔ (حوالہ ابن ھشام) فتح مکہ کے وقت توصف آرائی
ایک مخصوص افسر کے سپرد ہو گئی تھی جو وازع کہلاتا تھا (حوالہ طبری)۔ ہر فوج
کا مہم پہ روانگی سے پہلے شہر کے باہر معاینہ (عرض) ہوتا تھا اور کم عمر رضا کار یا
سواری یا اسلحہ نہ رکھنے والے یا اور طور پہ نا مناسب افراد (مثلاً مشرکین، یہودی
وغیرہ) واپس کر دیے جاتے تھے (حوالہ ابن سعد، ابن ہشام، طبری وغیرہ) جنگ
بدر میں صف آرائی کے بعد جو جامع ہدایات دی گئی تھیں وہ یہ تھیں کہ "جب تک
میں حکم نہ دوں کوئی اپنی جگہ سے حرکت نہ کرے۔ دشمن دور ہو تو تیر چلا کر بے کار
ضائع نہ کرے بلکہ زد پہ آئے تو مارے۔ اس سے قریب آئے تو پتھر پھینک کر
مارے۔ اس سے بھی قریب آئے تو نیزہ اور پھر تلوار چلائے"۔ وردی کی بجائے موجودگی
میں اور شبخون کی ضرورتوں کے لئے اسلامی سپاہیوں کے لئے شعار (واچ ورڈ)
مقرر کئے گئے تھے اور ہر دو بدو مقابلے کے وقت سپاہی اسے دہراتا اور حریف
وہ لفظ نہ دہراتا تو اطمینان ہو جاتا کہ وہ رفیق نہیں ہے بلکہ دشمن۔ (حوالے ایضاً)
خندق کے ذریعے سے محصور شہر کی مدافعت اسی اصول کی ایک دوسری مثال ہے۔
چنانچہ جنگ خندق میں شہر مدینہ پہ دشمن کو حملہ آور ہو لے سے اسی کے ذریعے سے
روک کرنا کام واپس کیا گیا۔
خیبر کی لڑائی میں منجنیق سے دشمن کے محصور قلعے میں پتھر برسائے گئے تھے

طائف کے محاصرے میں مزید براں دَبابے بھی استعمال کئے گئے تھے جو ترقی پا کر زمانہ حال میں خود بخود حرکت کرنے والی ٹینک کی صورت میں نظر آتے ہیں۔

دَبابہ ایک پہیے والی گاڑی ہوتی ہے جس کے اوپر کا پاکوئی اور موٹا چمڑا منڈھ دیا جاتا تھا تاکہ تیروں سے اندر رہنے والے آدمیوں کو صدمہ نہ پہنچایا جا سکے۔ فصیلوں کو کھودنے اور مماثل کام کرنے کے لئے اسے کام میں لایا جاتا تھا۔ طائف میں منجنیق کے علاوہ عرّادہ بھی برتا گیا تھا جو منجنیق ہی کی طرح پتھر وغیرہ دور پھینکتا تھا۔

فوجوں کی مشقیں، گھوڑوں، اونٹوں، گدھوں، وغیرہ کی دوڑ، تیراندازی کے مقابلے اور فوجی اسپورٹ وغیرہ ایک مستقل مضمون کے محتاج ہیں۔ نمازوں کے ذریعے سے صف بندی، روزے کے ذریعے سے ہر موسم میں سپاہیوں کو بھوک پیاس کی مشق، حج کے ذریعے سے عرفات وغیرہ کے بے آب وگیاہ علاقوں میں کوچ اور قیام کی عادت وغیرہ ان کے علاوہ ہیں۔ سرکاری اصطبلوں، محفوظ چراگاہوں اور اسلحہ خانوں کا قیام بھی اسی سلسلے میں قابل ذکر ہے۔

۵. خبر رسانی اور ناکہ بندی

ایک اور چیز جو عام تو تھی لیکن جس کا فریش کے سلسلے میں بہت مکمل مظاہرہ ہوا وہ یہ ہے کہ دشمن کی ہر نقل و حرکت سے پوری طرح باخبر رہیں اور اپنی نقل و حرکت سے اسے آخر وقت تک بے خبر رکھیں۔

اس غرض کے لئے مکے میں بھی آپؐ کے نامہ نگار متعین تھے۔ خندق کے معرکے

میں قریش نے مدینے کے شمال کے قبائل غطفان وغیرہ کے دس ہزار کے جم غفیر کے ساتھ حملہ کیا تھا۔ اتنا بڑا لشکر عرب میں غیر معمولی بات تھی۔ اتفاق سے اسی زمانے میں آنحضرتؐ عرب کے شمال میں دومۃ الجندل کی طرف گئے ہوئے تھے۔ آپ کا آدھے راستے سے واپس آجانا اور محاصرہ کنندوں کے پہنچنے سے پہلے دو ہفتے کی مہلت پاکر خندق کی کھدائی کو مکمل کرنا خبر رسانی کے عمدہ انتظام پر دلالت کرتا ہے۔ اسی طرح فتح مکہ کی مہم کی تیاری میں ایک شخص نے مدینہ سے قریش کو لکھ بھیجی تو پیام رساں راستے پر پکڑا گیا۔ اپنی خبروں کو پھیلنے سے روکنے کے لئے ناکوں کی بندش (جنس طریقہ) جتنی مکمل ہو چکی تھی اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ دس ہزار کا لشکر مدینہ سے مکے کی طرف چلتا ہے اور مضافات مکہ میں پڑاؤ ڈالنے سے پہلے دشمن کو خبر نہیں ہوتی۔ اس کا ایک اور طریقہ غلط سمت میں جانے کی خبر مشہور کرنا تھا کہ دشمن مغالطے میں مبتلا ہو اور غلط سمت میں سفر کرکے چکر کھا کر منزل مقصود پر پہنچنا بھی ہر وقت زیر عمل تھا اور مورخین نے صراحت سے لکھا ہے کہ "صرف تبوک کی مہم میں سفر کی درازی اور موسم کی خرابی کے باعث سپاہیوں سے پہلے ہی کہہ دیا گیا تھا کہ کہاں جانا ہے ورنہ ہمیشہ توریہ (دکھاوا) کیا جاتا تھا۔"

۴۔ معاشی دباؤ

ہم سب جانتے ہیں کہ قریش نے آنحضرت اور آپ کے متبعین کو کس طرح تکلیفیں دے کر ترک وطن پر مجبور کیا تھا اور کس طرح ان مہاجرین کی جائیداد

منقولہ و غیر منقولہ پر غاصبانہ قبضہ کر لیا تھا۔ اسی طرح سب لوگ اس سے بھی واقف ہیں کہ قریش کا روزگار زیادہ تر تجارت سے حاصل ہوتا تھا اور تبادلۂ اشیاء کے ذریعے سے وہ نفع کمایا کرتے تھے اور اس غرض کے لئے سردیوں میں جنوب یعنی یمن وغیرہ کو کارواں لے جاتے تھے اور گرمیوں میں شمال یعنی شام، فلسطین، مصر، عراق وغیرہ جایا کرتے تھے۔

شمالی راستہ اس علاقے سے گزرتا تھا جو مدینہ اور ینبوع کے مابین ہے اوپر بیان ہو چکا ہے کہ ہجرت کے چند مہینے بعد ہی اس علاقے کے باشندوں سے آنحضرت صلعم نے معاہدے پیدا کرنے شروع کر دیے تھے اور جب اس کی ایک حد تک تکمیل ہو گئی تو قریشی کاروانوں کا راستہ بند کر دیا گیا اور جب وہ زور دکھا کر گزرنے لگے تو ان کے کاروانوں کو حق غنیم کے تحت لوٹ لیا جانے لگا۔

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ قریش نے ساحلی راستہ مجبوراً ترک کر دیا اور صحراؤں سے ہو کر عراق جانے لگے۔ لیکن جلدی ہی آنحضرت صلعم کا اثر نجد تک پھیل گیا تو وہ راستہ بھی ہاتھ سے نکل گیا۔ قریش کو بحرین اور یمامہ سے بھی غلہ ملتا تھا۔ ان علاقوں پر اسلامی اثر کے پھیلنے، خاص کر ثمامہ بن اثال کے مسلمان ہو جانے پر غلے کی برآمد مکے کو روک دی گئی تھی۔ (ابن ہشام)

متعدد قیمتی کاروانوں کے لٹنے کے علاوہ ذرائع معیشت کا بند ہو جانا قریش کو مطیع کرنے کا سب سے مقدم اور سب سے موثر ہتھیار ثابت ہوا۔

۲۔ غنیم کے دوستوں کو توڑ لینا

دوسری اہم تدبیر یہ اختیار کی گئی تھی کہ مختلف وسائل سے قریش کے

دوستوں کو اس دوستی کے توڑنے اور مسلمانوں سے جوڑنے پر آمادہ کیا جائے۔ یہ طریقہ بہت آہستہ چلا مگر بالآخر بہت کارگر ثابت ہوا۔

بیعتِ عقبہ میں جو مدینے والے مسلمان ہوئے تھے وہ اصل میں قریش سے حلیفی کرلے آئے تھے۔ دستورِ مملکت مدینہ میں مدینے کے یہودیوں کو اس شرط پر کسی حملہ آور کے خلاف مدد دینا منظور کیا گیا تھا کہ وہ قریش کو کبھی کوئی مدد نہ دیں، نہ ان کے جان و مال کو کوئی پناہ۔ اسی دستور میں مدینے کے غیر مسلم عربوں کی حفاظت اس شرط سے منظور کی گئی تھی کہ وہ قریش کو نہ تو خود کوئی مدد دیں اور ان کی جان و مال پر مسلمان حملہ کریں تو آڑے آئیں۔ اطرافِ مدینے کے قبائل سے بھی معاہدات میں اسے ملحوظ رکھا گیا۔

کاروانی اسٹیشنوں پر جو لوگ رہتے ہیں انہیں کاروانوں کے ٹھیرنے کے زمانے میں کھانے پینے کی چیزیں، پانی اور دیگر ضروریات کی فروخت سے روزگار نکلتا ہے۔ آج کل بھی حجاج کا قافلہ اونٹوں پر جائے تو کئی کئی دن پہلے سے منزلوں پر تیاریاں ہونے لگتی ہیں اور دور دور سے بدوی خربوز، گھی، بھیڑ، بکری وغیرہ وہاں لے جاتے ہیں۔ قریشی کاروانوں کے ترک جانے سے متعدد قبائل نے روزگار کے لئے آنحضرت صلعم سے مدد طلب کی تھی اور اشجع وغیرہ اسی طرح حلیف بنے تھے (حوالہ ابن سعد)

اس سلسلے میں سب سے اہم کارنامہ[1] صلحِ حدیبیہ سے ہے سنہ ۶ھ میں مدینہ میں

---

[1] دیکھئے میرا مقالہ مجلہ "سیاست" حیدرآباد اپریل ۱۹۴۲ء میں "عہدِ نبوی کی سیاست خارجہ کا ایک شہ کار"۔

مسلمانوں کو دو خطرے تھے۔ شمال میں خیبر اور جنوب میں مکہ۔ دونوں سے ایک ہی وقت میں مقابلہ ممکن نہ تھا۔ دونوں کی بڑھتی والی دوستی کو روکنا اور ہم خیالی کو ہم عملی کی صورت اختیار نہ کرنے دینا بھی ضروری تھا۔ یہ بھی خوف تھا کہ اگر مسلمان خیبر پر حملہ کرنے جائیں تو مدینے کو فوج سے خالی پاکر مکے والے آکر نہ لوٹ لیں اور مکے پر حملہ کریں تو یہی خدشہ خیبر سے تھا۔ صلح حدیبیہ میں قریش کو اس بات پر آمادہ کر دیا کہ وہ مسلمانوں کی جنگوں میں غیر جانبدار رہیں گے (اور اس کے معاوضے میں مسلمان قریش کا تجارتی راستہ کھول دیں گے اور دس سال تک باہم صلح رہے گی) ایک زبردست سیاسی فتح تھی جو مسلمانوں نے حاصل کی کیونکہ قریش کو اس وقت موثر مدد دے سکنے والے صرف خیبری ہی رہ گئے تھے۔ ان کو پچھاڑ دینے اور پھر تباہ کر دینے سے قریش کا آیندہ کوئی مددگار نہ رہا۔

۸۔ دشمنوں سے گھرنا

مذکورہ بالا اصول کا ناگزیر نتیجہ یہ تھا کہ رفتہ رفتہ قریش کے اطراف چاروں طرف مسلمان یا مسلمانوں کے حلیف ممالک اور قبائل جمع ہو جائیں۔ قبائل اسلم و خزاعہ اس کی بہت نمایاں مثال ہیں جو مکے کے اطراف رہتے تھے۔

آنحضرتؐ کا ابتدا سے یہ اصول تھا کہ بات کا پاس رہے اور حلیفوں کی مدد سے کبھی غفلت نہ کی جائے۔ اس کے ساتھ اسلامی فوجوں کی جنگی برتری، فتوحات کی دھاک، معاشی وسائل پر زبردست اقتدار ان تمام امور نے چو طرف کے چھوٹے چھوٹے قبائل کو آنحضرتؐ کا مطیع کر دیا تھا۔ اور دشمن کو اسی کے دشمنوں سے گھیر لیا جاتا تھا۔

۹۔ دِعایہ کاری

دشمنوں میں پھوٹ ڈالنا بھی ایک مفید اصول کے طور پر اکثر عہدِ نبویؐ میں برتا گیا تھا۔ جنگ خندق اس سلسلے میں کئی نظیریں پیش کرتی ہے۔ محاصرہ کرنے والے متحدین میں سے قبیلہ غطفان کو اس پر آمادہ کر لیا گیا تھا کہ وہ بعض شرائط پر محاصرہ اٹھا کر اور قریش کا ساتھ چھوڑ کر چلے جائیں۔ مگر ان شرائط پر خود مسلمان افسر آمادہ نہ ہوئے گو آنحضرتؐ ان پر راضی تھے۔

دوسری نظیر اسی جنگ خندق میں قریش اور مدینے کے یہودیوں میں پھوٹ ڈلوانا تھا۔ اس میں جتنی زبردست کامیابی ہوئی اس سے سب واقف ہیں کہ قریش نے بیزار ہو کر محاصرہ اُٹھا دیا اور بے نیل و مرام واپس چلے گئے۔ (گو یہ بھی صحیح ہے کہ ذی قعدہ کا حرام مہینہ شروع ہو رہا تھا جس میں قریش جنگ جائز نہیں سمجھتے تھے اور یہ بھی ممکن یا مناسب نہ تھا کہ حج کے زمانے میں مکے سے باہر رہ کر کمائی سے اپنے ہاتھوں محروم رہیں)۔ بہر حال قریش اور یہودیوں میں غلط فہمی پیدا کرانے میں جناب رسالتؐ کا جملہ[۵۷] " لعلّنا أمرناهم " بھی موثر رہا تھا۔ مشہور حدیث الحرب خدعة کا بھی یہاں ذکر کیا جا سکتا ہے۔

۱۰۔ دشمن کے ایک طبقے کو موہ لینا

یہ اصول بھی بہت مفید ثابت ہوتا ہے۔ اور یہ بیان ہوا کہ قریش کے غلبے کی

---

۵۷ اصابہ ابن حجر ۳۱۷/۴ ، مسعود بن عامر۔

منڈی جو یمامہ میں تھی بند کرادی گئی تھی۔ مورخ بیان کرتے ہیں کہ اس سے مکے میں قحط نمودار ہوگیا۔ اس سال عرب میں بارش نہ ہونے سے عام کال بھی تھا۔ اس دباؤ کی قوت کا جب قریش کو اندازہ ہوگیا تو پھر یہ بندش اٹھالی گئی، اور وہ بہت ممنون ہوئے

(ابن ہشام)

یہی نہیں بلکہ اسی زمانے میں پانچ سو اشرفی کی خطیر رقم مکے کے سردار ابوسفیان کو بھیجی گئی کہ مکے کے فقراء میں تقسیم کردے۔ (سرخسی کی مبسوط اور شرح سیر کبیر)

ان کارروائیوں سے مکے میں بہتیروں بہی خواہ پیدا ہوگئے اور اسی طرح کی سیاست سے مختلف مواقع پر اور مختلف ممالک میں مسلمانوں نے فائدہ اٹھایا۔

۱۱۔ دشمن میں پھوٹ ڈلوانا

ابن قتیبہ کے استاد، محمد بن حبیب (ف ۲۴۵ھ) نے اپنی کتاب المنمق (مخطوطۂ دائرۃ المعارف جامعہ عثمانیہ ص ۱۵۴) میں اس قسم کا ایک دلچسپ واقعہ بیان کیا ہے کہ جب ابو ازیہر کو کسی خانگی دشمنی سے ایک شخص نے مار ڈالا تو جناب رسالت مآب کے اشارے سے حضرت حسان بن ثابتؓ نے آتشیں اشعار کہنے شروع کئے۔ اس سے قریب تھا کہ مکے کے قریش میں خانہ جنگی شروع ہو جاتی۔ لیکن عین دم آخر ابوسفیان نے دخل دہی کی اور بڑے تدبر سے صورت حال کو یہ کہہ کر سنبھال لیا کہ دشمن (یعنی آنحضرت صلعم) چوکس ہے، ایسے وقت خانہ جنگی کہاں کی عقلمندی ہے۔

اصول کا استنباط ہی یہاں مقصود ہے، انفرادی موقع پر کامیابی یا ناکامی سے یہاں غرض نہیں۔

۱۲۔ معزز دشمنوں کا اسلام میں بھی اعزاز

اس مختصر تبصرے کے آخر میں اس اصول کا ذکر کیا جا سکتا ہے جو حدیث میں ہے کہ خیارکم فی الجاھلیۃ خیارکم فی الاسلام اذا فقھوا (غیر مسلم معزز اسلام لانے پر بھی معزز رہیں گے اگر وہ اسلامی توانین سے بھی واقف ہو جائیں) یہی وجہ تھی کہ عمرو بن العاصؓ کے اسلام لانے پر انہیں سابقین اولین کا سردار بنا کر فوجی مہموں میں بھیجا گیا ابو سفیان نے اسلام قبول کیا تو نہ صرف انہیں انعام واکرام دیا گیا بلکہ ان کا گھر امن گاہ قرار دیا گیا۔ انہیں لشکروں کی سرداری اور صوبوں کی گورنری بھی فوراً دی جانے لگی۔ خالد بن الولید کو (باوجود اُحد میں مسلمانوں کی شکست کا واحد سبب ہونے کے) اسلام لاتے ہی سیف اللہ کے قابل رشک خطاب سے سرفراز کیا گیا۔

اگر سیرت النبی کا ان امور کی تلاش کے لئے مطالعہ کیا جائے تو نہ صرف مذکورہ بالا اصولوں کی مزید نظیریں ملیں گی بلکہ اور نئے سیاست کاری کے اصول بھی نظر آ سکتے ہیں۔ یقین ہے کہ اہل علم ان سے مستفید ہو کر اوروں کو محروم نہیں رکھیں گے۔

(رسالہ سیاست حیدر آباد دکن)

جنوری سنہ ۱۹۴۰ء

تالیفِ قلبی

(عہدِ نبویؐ کی سیاستِ خارجہ کا ایک اہم اصول)

پہلی اسلامی مملکت عہدِ نبویؐ میں قائم ہوئی۔ اس کی خارجہ سیاست کے بہت سے اصول تھے ان پر الگ الگ بحث کیے بغیر نہ ان کی اہمیت سمجھ میں آسکتی ہے اور نہ ان کا صحیح مفہوم یہاں صرف ایک چیز پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ وہ غیر ممالک کے باشندوں کا دل موہ لینا ہے۔

سوال کرنے والا پوچھ سکتا ہے کہ اس کا کیا ثبوت کہ مملکت اسلامیہ کی خارجہ سیاست میں یہ اصول عہدِ نبویؐ میں ملحوظ رہا، مگر نظری احکام اور عملی نظائر کی روشنی میں اس استنباط کے سوا چارہ نہیں رہتا۔

اولاً قرآن مجید میں سرکاری مواز نے کے لئے خرچ کے جو مدات مقرر کیے گئے ہیں، ان میں عام محتاجوں، مسکینوں وغیرہ کے ساتھ ایک اہم مد "المؤلفة قلوبهم" کی رہی گئی ہے کہ دلوں کے موہ لینے کے لئے خرچ کیا جانا چاہیے۔

جو چیز قرآن مجید میں موجود ہو اور جناب رسالت آبؐ کا زندگی بھر اس پر عمل رہا ہو اور اس کی منسوخی کا اشارۃً، کنایتہً تک کسی حدیث نبویؐ میں ذکر نہ ہو تو محض بعض متاخر فقہاء کا بیان کہ یہ منسوخ شدہ حکم ہے، کسی لاسخ العقید

عقلمند کے لئے قابل قبول نہیں رہتا۔ ان فقہاء کو حضرت عمر فاروق رضؓ کے شاید ایک جملے سے دھوکا ہوا۔ سیاق و سباق سے بچھڑا ہوا بیان ایک خالص سیاسی معاملے کے متعلق بعض غیر سیاست دان (مگر نیک طینت و نیک نیت) فقہاء کی سمجھ میں نہ آیا ہو تو اس سے رسول اللہؐ کے جاری و باقی رکھے ہوئے حکم قرآنی کو منسوخ کرنے کی ذمہ داری لینی کم از کم مجھے تو پسند نہیں۔ اصل میں حضرت عمرؓ کی طرف یہ بیان منسوب ہے کہ اب خدا نے اسلام کو عزت دی ہے اس لئے کسی کو اسلام لانے کی ترغیب دینے کے لئے رقم خرچ کرنے کی ضرورت نہیں۔ اگر یہ روایت صحیح بھی ہے تو کیا اذا فات الشرط فات المشروط کی بنا پر یہ ناگزیر نہیں کہ دیگر زمانوں میں اور دیگر ممالک کی حد تک جہاں شوکت فاروقی کارفرما نہ ہو، یہ حکم پھر بحال ہو جائے؟ یوں بھی دل موہ لینے یا تالیف قلبی کی صرف یہی ایک شکل نہیں ہے کہ اسلام قبول کرنے کی ترغیب دینے کے لئے کسی کو انعام و اکرام دیا جائے۔

پانچویں صدی ہجری کے وسط میں وفات پانے والے مشہور حنبلی امام ابو یعلیٰ الفراء نے اپنی کتاب الاحکام السلطانیہ (صفحہ ۱۱۶ میں، جو حال ہی میں چھپی ہے) آیت "المؤلفة قلوبهم" کی بڑی گہری اور دور رس تشریح کی ہے۔ وہ فرماتے ہیں:-

	ترجمہ
وأما المؤلفة قلوبهم وهم أربعة أصناف:	رہے مؤلفۃ القلوب، سو ان کی چار قسمیں ہیں:-
۱- صنف تتألف قلوبهم	۱- ایک قسم ان لوگوں کی ہے جن کے

لمعونة المسلمين	دل مسلمانوں کو مدد دینے کے لئے موہ لئے جائیں۔
٢۔ وصنف تتألف للكف عن المسلمين۔	ایک قسم ان کی ہے جن کی تالیف قلبی اس لئے کرنی ہے کہ وہ مسلمانوں کو نقصان پہنچانے سے باز رہیں۔
٣۔ وصنف تتألف لترغيبهم في الإسلام۔	ایک قسم ان لوگوں کی ہے جن کو اسلام قبول کرنے کے لئے ترغیب دی جاتی ہو۔
٤۔ وصنف يتألفهم ترغيبا لقومهم وعشائرهم في الإسلام	اور ایک قسم ان لوگوں کی ہے جن کی تالیف قلبی سے ان کی قوم اور خاندان والوں کو اسلام لانے کی ترغیب ہوتی ہو۔
فيجوز أن يعطى كل واحد من هذه الأصناف من سهم المؤلفة، مسلما كان أو مشركا۔	چنانچہ یہ چیز جائز ہے کہ ان اقسام میں سے ہر ایک کو مؤلفۃ القلوب کی مد سے حصہ دیا جائے چاہے وہ مسلمان ہو یا مشرک۔

ابن رشد نے اپنی مشہور تالیف "بدایۃ المجتہد" (کتاب الزکاۃ، جملہ خامسہ، فصل اول، مسئلہ دوم) میں بیان کیا ہے کہ امام حنیفہ اور امام شافعی بھی اسی کے قائل تھے کہ یہ قرآنی حکم منسوخ نہیں ہوا بلکہ اب تک باقی ہے، اور امام وقت ان سے مصالح اسلامی کا کام لے سکتا ہے۔

اہل سنت کے تین بڑے مذاہب کے مستند نمائندوں کی رائے معلوم کر لینے کے بعد یہ عقلی دلیل اضافہ کی جاسکتی ہے کہ ہر زمانے میں اور ہر ملک میں متمدن سلطنتوں کو اس کی ضرورت رہتی ہے کہ :-

۱. دشمن کو دوست اور مددگار بنانے کے لئے
۲. یا کم از کم غیر جانبدار ہو جانے کے لئے۔
۳. اور دوستوں کو انعام دے کر مزید اور عظیم تر کارگزاریوں پر آمادہ کرنے کے لئے۔
۴. نیز دیگر دوستوں کو ترغیب و تشویق دلانے کے لئے۔
۵. یا ڈھلمل لوگوں کو تائید میں مستحکم کرنے کے لئے۔
۶. یا مماثل مصالح کے لئے۔

اس کی ضرورت رہتی آئی ہے کہ "سیکرٹ سروس" سے کام لیں۔ اس اجمال کی بیسیوں تفصیلیں ہو سکتی ہیں۔

اب ہم سیرۃ النبیؐ کے حصہ نظائر پر نظر ڈالیں گے۔

ابھی مکہ فتح نہیں ہوا تھا کہ ایک مرتبہ وہاں سخت قحط پڑا۔ آنحضرتؐ نے بروایت فقیہ کبیر، سرخسی (مبسوط ۱۰/۹۲-۹۳ وغیرہ) ابوسفیان کے پاس پانچ سو اشرفیوں کی خطیر رقم بھیجی کہ مکے کے غریبوں اور محتاجوں میں تقسیم کر دے۔ ابوسفیان نے بے بسی کے عالم میں جھنجھلا کر کہا کہ :- محمدؐ چاہتا ہے کہ اب مکے کے غربا اور نوجوانوں کو ورغلا کر ہمارے خلاف کھڑا کر دے۔

ابھی صلح حدیبیہ نہیں ہوئی ہے اور مسلمانوں کے معاشی دباؤ کے باعث قریش کی تجارت بند ہوکر روزگار پر آفت آ چکی ہے۔ ابوسفیان کا روزگار بھی تجارت ہی سے تھا۔ آنحضرتؐ اسے مدینے کی اچھے کھجوروں کی ایک بڑی مقدار بھیجتے ہیں اور معاوضے میں طائف کا چمڑا طلب کرتے ہیں۔

ابوسفیان کی لڑکی بی بی ام حبیبہ سے آنحضرتؐ نکاح فرما لیتے ہیں۔

کیا ان تمام خاموش ولد ہوئی[۵] کے مجموعی اثر بالآخر کچھ بھی نہ ہوا ہوگا ؟ !

مکے میں مذکورہ بالا قحط کا زمانہ ہے۔ وہاں غلّے کی درآمد مشرقی عرب

---

۵ یہ لکھ کر عرصہ ہوا۔ اب اس کی طباعت ثانی کے وقت ایک بڑے پرانے مولف کے ہاں اس کی تائید نظر سے گزری۔ محمد بن حبیب کی کتاب المحبر صفحہ ۷۸ میں بی بی ام حبیبہ بنت ابی سفیان کے متعلق لکھا ہے:-

"چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عمرو بن امیہ الضمری کو حبشہ بھیجا۔
اور انھوں نے بی بی ام حبیبہ کا (وہاں) رسول اللہؐ سے نکاح کروایا۔
یہ فتح مکہ کے زمانے کا واقعہ ہے۔ اسی کے متعلق یہ آیت نازل ہوئی کہ
(عسى الله أن يجعل بينكم وبين الذين عاديتم منهم مودة):
ممکن ہے کہ (اس سے) خدا تم میں اور تمھارے ساتھ عداوت رکھنے
والوں میں دوستی پیدا کر دے۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا بی بی ام حبیبہ
بنت ابی سفیان سے نکاح کرنا ہی دوستی تھا اور اسی باعث ابوسفیان رسول اللہ
صلی اللہ کے متعلق نرم پڑ گیا اور یہی دوستی تھی (جس کا آیت میں اشارہ ہے)۔"

خاص کر یمامہ سے ہوا کرتی تھی۔ یمامہ کے ایک سردار ثمامہ بن اثال نے اسلام قبول کر لیا اور آنحضرتؐ کی اجازت سے یہ حکم دیا کہ اس کے علاقے سے اب غلّہ مکے کو برآمد نہ کیا جائے۔ مکے والے پیٹ سے مجبور ہو گئے اور جناب رسالتمآبؐ کو اپنی رشتہ داری اور صلۂ رحمی کا واسطہ دے کر خط لکھا کہ یمامہ سے غلّے کی مکے کو برآمد کی ممانعت منسوخ کر دی جائے۔ آنحضرتؐ نے ایسا ہی کیا۔ کیا یہ بات بھی اہل مکہ پر بے اثر رہا ہوگا؟

یہ غیر مسلموں کو اسلام کے حق میں متاثر کرتا تھا۔ اس کے علاوہ نومسلموں کو بھی بڑے بڑے انعام و اکرام دئے جاتے، ان کے اعزاز ملحوظ رکھے جاتے، اور ہر طرح ان کو محسوس کرایا جاتا کہ صرف روحانی اور آخرت ہی کی نہیں، دنیا اور مادی حیثیت سے بھی ان کا جدید مذہب ان کے لئے سراسر مفید ہے۔ علاوہ اور مواقع کے فتح مکہ کے بعد ابوسفیانؓ وغیرہ نومسلموں کو سینکڑوں اونٹ فی کس بطور انعام دئے گئے۔ بخاری شریف میں ہے:-

خیارکم فی الجاھلیة خیارکم فی الاسلام اذا فقھوا

جو زمانۂ جاہلیت میں معزز تھے، وہ اسلام میں بھی ویسے ہی معزز رہیں گے جبکہ وہ اپنے دین سے واقفیت میں کمال پیدا کر لیں۔

حاتم طائی کا بیٹا مدینہ آیا تو آنحضرتؐ نے اس کے لئے مسند بچھائی۔ ایسی بیسیوں مثالیں ملیں گی۔

سفیروں کو انعام و اکرام دینے میں جناب رسالتؐ کو یہاں تک اہتمام تھا

کہ مرض الموت کی وصیتوں میں سے ایک اسی کے متعلق تھی کہ آپ کا طرز عمل مسلمان آئندہ بھی جاری رکھیں۔

یہ ظاہر ہے کہ چادر دیکھ کر پاؤں پھیلائے جا سکتے ہیں۔ کبھی انعام فوراً دیدیا جا سکتا تو کبھی وعدے ہی پر اکتفا کر لی ہوتی۔ مثلاً ابو ثعلبہ خشنی نے آنحضرتؐ سے درخواست کی کہ اگر رومی (بیزنطینی) علاقہ فتح ہو تو مجھے فلاں علاقہ جاگیر میں دیا جائے۔ آنحضرتؐ نے اسے منظور فرمایا۔ (کتاب الاموال لأبی عبید ۲۷۵) اسی طرح ایک شیبانی شخص نے آکر اسلام قبول کیا اور کہا۔ یا رسول اللہ! اگر شہر حیرہ فتح ہو تو مجھے وہاں کے امیر قبیلہ کی بیٹی مال غنیمت سے بطور انعام عطا فرمائیے۔ آنحضرتؐ کے وعدے کی خلافت راشدہ میں حضرت خالد بن الولیدؓ نے تعمیل کی عزت حاصل کی (ایضاً ف ۲۸۵) ایسا ہی ایک معاملہ تمیم داریؓ کا ذکر کرتے ہیں کہ ہجرت نبویؐ سے بھی قبل یہ آ مسلمان ہوئے اور وعدہ لیا کہ اگر فلسطین فتح ہو تو حبرون، عینون اور بیت ابراہیم نامی گاؤں ان کو جاگیر میں دیے جائیں یہ تبرک تفصیل، مختصر یہ کہ اس کی تعمیل کا موقع خلافت فاروقی میں مل سکا۔ (الوثائق السیاسیہ، دستاویزات متعلقہ نیز مقریزی کی الضوء الساری لمعرفة خبر تمیم الداری، مخطوطۂ پارس و لائڈن)۔

تالیف قلبی کے ایک اور پہلو سے بحث کر کے آج کی صحبت ختم کی جاتی ہے شہر طائف کا وفد مدینہ آتا ہے۔ اور مسلمان ہونے پر آمادہ ہے۔ شرط یہ پیش کرتا ہے کہ انھیں نماز سے مستثنیٰ کیا جائے، ان کے لئے زنا حرام نہ رہے، ان کے شہر کو بھی مکے کی طرح ایک حرم قرار دیا جائے جہاں کے درخت کاٹنا اور جانوروں

سکا نشکار کرنا ممنوع ہو۔ آنحضرتؐ نے جو عام جبری فوجی خدمت نافذ فرمائی تھی اور جہاد کو فرض قرار دیا تھا، اس سے ان کو مستثنیٰ کیا جائے، اور زکات سے بھی بری رہیں۔ آنحضرتؐ نے نماز اور زنا کی شرطوں کو رد فرما دیا اور آخری دو شرطیں منظور کرلیں اور یہ رعایت بھی کہ طائف کا بت خانہ توڑنے کے لئے اہل طائف کو مجبور نہ کیا جائے بلکہ مدینے سے سرکاری افسر جاکر اسے منہدم کرائیں۔ — (اور جب وفد چلا گیا تو حیرت زدہ صحابہ سے آنحضرتؐ نے فرمایا کہ جہاد اور زکات کی فرضیت منسوخ نہیں ہوئی ہے۔ یہ رعایت ان کو دی گئی ہے لیکن جب اسلام ان کے دل میں گھر کرلے گا تو وہ خود بخود جہاد بھی کریں گے اور زکات بھی دیں گے۔ اور ہوا بھی بعد کو یہی) —— اس سے معلوم ہو سکتا ہے کہ تالیف قلبی کس حد تک کی جاسکتی ہے اور کن باتوں میں اسے مادی فائدوں کے باوجود روا نہیں رکھا جاسکتا۔

غرض "والمؤلفة قلوبهم" اور "الأنفال لله والرسول" کے ذریعے سے قرآن مجید نے عملی سیاسیات کی جو نہایت اہم اور دور رس تعلیم دی اور حکمران کو صوابدید کا جو وسیع حق دیا، اس کی عہد نبوی کی نظیروں سے کافی تشریح اور توضیح ہوتی ہے۔ زندہ قوموں میں اجتماعی مفاد کے لئے تالیف قلبی کے لئے خصوصی وزارت قائم ہوتی ہے تو مردہ قوموں میں رشتہ داری اور انفرادی مفاد کے لئے مملکت کا نقصان روا رکھا جاتا ہے۔ ایک جیتتا اور نفع حاصل کرتا ہے اور دوسرا کھوتا اور نقصان اٹھاتا ہے۔ وما توفیقنا الا باللہ

(رسالہ نظامیہ حیدرآباد دکن ربیع الانور ۱۳۵۷ھ)

ہجرت

جلاوطنی، توطن، تبادلۂ آبادی اور مماثل مفہوم رکھنے والی اصطلاحیں آج کل نہ صرف بین الاقوام اور بین الممالک سیاست میں روزافزوں اہمیت اختیار کرلی جارہی ہیں بلکہ ایک جماعت کے سیاسی خیالات کے باعث یہ مسئلہ اب خود ہمارے گھروں میں منڈلانے لگا ہے۔ حضرت موسیٰؑ کے زمانے میں بنی اسرائیل نے اجتماعی طور سے مصر سے ترکِ وطن اور بعد میں فلسطین والوں کو نکال کر ان کے ملک میں خود توطن اختیار کیا تھا۔ پھر بخت نصر کے زمانے میں انہیں فلسطین کے اس نئے وطن سے دیس نکالا ملا تو اس کی صدا ہائے بازگشت مختلف زمانوں میں مختلف ممالک میں آتی رہیں۔ اس تاریخ کا جدید ترین اعادہ یہودیوں کے فلسطین میں قومی وطن بنانے اور نازی جرمنی سے ان کے نکالے جانے کی صورت میں ہویدا ہوا ہے۔

یہودیوں سے قطع نظر حالیہ سالوں میں ترکوں نے پچاس لاکھ سے زائد انسانوں کا ہمسایہ ممالک سے تبادلہ کیا ہے۔ جنوبی تیرول سے کئی لاکھ جرمن درہ برینیر کے اُس پار چلے جانے پر حال میں اٹلی کی طرف سے مجبور کئے گئے جن کی جائیداد غیر منقولہ کی قیمت کا اندازہ پانچ تا بارہ ارب لیرا کیا گیا اور ساڑھے سات ارب پر تو سب متفق ہیں۔ ۲۰ نومبر ۴۹ء کے لندن ٹائمز کے مطابق

پولینڈ میں ٹیلن کے اطراف جرمنی، آسٹریا، چکوسلواکیا اور پولینڈ کے کوئی ڈیڑھ کروڑ یہودی یکجا کئے جارہے ہیں۔ اسی طرح بالٹک ممالک سے کئی لاکھ جرمن مشرقی جرمنی میں منتقل کئے گئے ہیں۔ ۱۴ فروری ۱۹۴۱ء کے لندن ٹائمز کے مطابق بارہ دن میں چھ لاکھ روسیوں کو جرمن مفتوحہ علاقے سے روس منتقل کرنے کے انتظامات کئے گئے ہیں۔ فرانسیسی مستشرق خاص کر حالیہ زمانوں میں قدیم عرب نوآبادکاری کا مطالعہ کرنے لگے ہیں کیونکہ عربوں سے بڑھ کر کوئی نوآبادکار قوم نہیں گزری ہے جس نے جذب اور تقلب ماہیت کے شام، مصر، عراق، شمالی افریقہ وغیرہ میں عجیب اور حیرت انگیز واقعات ثبت تاریخ کئے ہیں۔ عربوں کی کارروائی جو زیادہ تر حضرت عمرؓ کے زمانے میں عمل میں آئی، دراصل عہد نبویؐ ہی کی تعلیم اور عمل پر مبنی ہے۔ تاریخ کے اس اہم گوشے پر بہت کم کبھی کسی نے لکھنے کی کوشش کی ہے۔ کم از کم میرے مطالعے میں کسی زبان میں ایسی کوئی چیز پڑھنے میں نہیں آئی[۱]۔ پانچ چھے سال سے میں اس موضوع پر مواد جمع کرتا رہا ہوں۔ اب اس جمع شدہ مواد سے ایک سرسری خاکہ کھینچ کر اہلِ علم کی خدمت میں بغرض تنقید و اصلاح اور بغرض توضیح و امداد پیش کرنے کی جرأت کرتا ہوں۔

لغتی تحقیق لفظ "ہجرت" سامی زبانوں میں ایک دلچسپ تاریخ رکھتا ہے۔ یہ لفظ "ہَجَر" سے ماخوذ ہے جس کے معنے حبشی اور بعض دیگر سامی زبانوں بلکہ خود قدیم

۱؎ اس مضمون کے مطبع کو جانے لیکن شائع ہونے سے کوئی تین ماہ پہلے عبدالقدوس ہاشمی صاحب نے روزنامہ رہبر دکن میں البتہ ایک مختصر عام پسند مضمون لکھا ہے۔

عربی میں " شہر" کے ہیں۔ چنانچہ مشہور بیس جلدوں والی بڑی عربی لغت "لسان العرب" میں ایک قدیم لغت نویس الازہری کے حوالے سے لکھا ہے ؎

قال الازهری : "واصل" الهجرة"	الازہری کا بیان ہے کہ عربوں کے
عند العرب خروج البدوی	نزدیک اصل میں "ہجرت" کے معنے یہ ہیں
من بادیته الی المدن یقال	کہ کوئی خانہ بدوش صحرانشین (بدوی)
"هاجر الرجل" اذا فعل ذلک	اپنے صحرا کو چھوڑ کر کسی شہر میں جا بسے۔

(لسان العرب تحت کلمہ "هجر" نیز دیکھو تحت کلمہ "عرب")

ظاہر ہے کہ جب " ہجر" کے معنے شہر کے ہیں تو ہجرت کے معنے ابتداءً صرف یہی ہو سکتے تھے کہ کسی بستی، کسی شہر میں جا کر آباد ہو جانا اور خانہ بدوشی کی جگہ حضری زندگی اختیار کر لینا۔ اس سلسلے میں یہ بھی بیان کیا جا سکتا ہے کہ عرب میں خود "ہجر" نام کا ایک بڑا مشہور شہر گزرا ہے۔ یہ سلطنت بحرین کا پایہ تخت تھا اور حالیہ صوبہ " الحسا " میں (جو عرب میں خلیج فارس پر واقع ہے) آباد ہوا تھا۔ کسی شہر کو " شہر" کا نام دینا سچ پوچھئے تو نیا نہیں بلکہ قدیم سے ہر قوم اپنے پایہ تخت کو شہر ہی کہتی رہی ہے۔ " مدینہ" کے معنے بھی شہر کے ہیں۔ مکے کا قدیم نام "بکہ" بھی یہی معنے رکھتا ہے۔ چنانچہ بت بعل کا شہر بعلبک کہلاتا ہے۔ قرآن میں مکے کو " هذا البلد الامین" کا بھی نام دیا گیا ہے۔ اور " بلد" کے معنے بھی شہر کے ہیں۔ حضرت ابراہیم کے زمانے میں ان کے ملک کے صدر مقام کا نام " اُور" تھا۔ اور " اُور" کے معنی بھی شہر کے ہیں، اور کسی نہ کسی طرح ہندوستان بھی یہ لفظ پہنچ کر زیادہ تر دکن میں بنگلور، میسور، ناگور، متور وغیرہ ناموں میں بطور لاحقہ موجود ہے۔

ردمی بھی اپنے شہر "روم" کو عام طور سے اربس کہتے تھے۔ اس کے معنے بھی شہر کے ہیں (انگریزی لفظ اربن بمعنی شہری، اسی سے ماخوذ ہے) بلدہ حیدرآباد اور مصر القاہرہ بھی قابل ذکر ہیں۔

غرض ہجرت کے لغوی معنے شہر میں جا بسنے کے ہیں[۱۵] اور آسان ہے کہ کوئی صحرا کی تکلیف دہ زندگی کو چھوڑ کر کسی نخلستان کی سرسبز بستی میں جا بسے تو لفظ "ہجرت" کو بعد میں یہ معنے دئے جائیں کہ کسی نعم البدل کو حاصل کرنا، کسی خراب جگہ کو چھوڑ کر اچھی جگہ جا رہنا۔ میں سمجھتا ہوں کہ رسول کریمؐ کے ترک وطن کر کے مدینہ جا رہنے کو اسی آخر الذکر مفہوم میں بلحاظ ادب "ہجرت" کے نام سے موسوم کیا گیا۔ جیسا کہ ہم آگے دیکھیں گے، سیرت نبویؐ اور خلافت راشدہ کے سلسلے میں ہجرت کے معنے صرف ہجرت مدینہ ہی کے نہ تھے بلکہ نومسلموں کا اسلامی علاقے میں آکر اکٹھا ہونا اور مفتوحہ علاقوں میں مسلم نوآبادکاروں کا لیجا کر بسانا اسی نام سے یاد کیا گیا ہے۔

---

[۱۵] فرانسوا نو (FRANÇOIS NAU) نے اپنی فرانسیسی کتاب "عراق اور شام کے عیسائی عرب ساتویں سے آٹھویں صدی عیسوی تک" مطبوعہ ۱۹۳۳ء ص ۱۲۹ تا ۱۳۲
Les Arabes chretiams du Mesopotamie
میں ایک جگہ ضمناً لفظ ہجرت کو "ہاگر" یعنی بی بی ہاجرہ کے (جن کو بخاری شریف میں ہاجری کے نام سے یاد کیا گیا ہے اور جو ابراہیمؑ کی بیوی اور حضرت اسمعیلؑ کی ماں تھیں) نام سے ماخوذ سمجھا ہے مگر یہ توجیہ محض تاکلی تھی اور ظاہر ہے کہ کسی نے قبول بھی نہیں کی۔

۱۔ ترک وطن

عہد نبوی میں ہجرت کا تاریخی مفہوم

مکے میں تبلیغ اسلام کی رکاوٹوں سے مجبور اور دل برداشتہ ہونے کے بعد حضرت رسول کریمؐ نے اپنے ساتھیوں کو ابتدائً حبشہ ہجرت کر جانے کی ہدایت فرمائی۔ چنانچہ کئی سو آدمی چھوٹی بڑی ٹکڑیوں میں بحری راستے سے نجاشی کے ملک میں جا رہے۔ ایک ٹکڑی کی سرگزشت طبری نے لکھی ہے کہ یہ لوگ مکے سے چل کر شعیبہ کی بندرگاہ پہنچے جو حالیہ جدہ کے قریب تھی۔ وہاں ایک جہاز لنگر اٹھانے کو تیار تھا اور ان لوگوں نے نصف دینار یعنی پانچ درہم کرایہ پیش کیا اور حبش جا اترے۔ معلوم نہیں یہ کرایہ فی کس تھا یا جملہ جماعت کا۔ کچھ دنوں کے بعد "غرانیق"[۱] کے مشہور واقعے کے سلسلے میں چند لوگ مکہ واپس

---

[۱] قرآن مجید میں ایک جگہ لات، عزیٰ اور منات تین بتوں کا ذکر ہے اور اس کے بعد بتوں کی بے بسی اور بت پرستی کی برائی کا ذکر ہے۔ قرآن کی تفسیروں میں ایک قصہ مشہور ہے کہ جب آنحضرتؐ نے ایک مرتبہ "اللات و العزیٰ و منات الثالثۃ الاخریٰ" کی آیتیں پڑھیں تو کسی نے قافیہ ملا کر "تلک الغرانیق العلیٰ وان شفاعتھن لترتجیٰ" (یعنی وہ بڑے سردار ہیں اور ان کی سفارش کی توقع کی جا سکتی ہے) کا جملہ کس دیا اور شہر میں مشہور ہو گیا کہ آنحضرتؐ بتوں کے متعلق اس روایت کو منظور کرتے ہیں کہ وہ خدا تو نہیں ہیں لیکن وہ خدا کے پاس سفارش کر سکتے ہیں۔ جب آنحضرتؐ کو یہ معلوم ہوا تو آپ نے اس آیتیں پڑھیں اور مکے والوں کو کوئی دھوکا نہ رہا۔ مگر ابتدائی خبر کا ایک جز حبشہ پہنچ گیا کہ آنحضرتؐ اور مکہ والوں میں صلح ہو گئی ہے۔

(بقیہ نوٹ صفحہ ۲۸۶ پر)

آ گئے مگر بہت جلد وہ اور ان کے علاوہ بعض دیگر مسلمان دوبارہ حبش چلے گئے۔ یہ دونوں واقعے ہجرتِ حبشہ کے نام سے مشہور ہیں۔

آنحضرتؐ کو جب مربی و با اثر چچا اور شفیق بیوی کی وفات کے بعد آپ کے نئے بزرگ خاندان (ابولہب) نے جات باہر کر دیا تو آپ اپنے ایک غلام کے ساتھ طائف تشریف لے گئے اور ارادہ فرمایا کہ اگر وہاں تبلیغ میں کوئی کامیابی کی صورت ہو تو وہیں بس جائیں۔ لیکن وہاں کے سے زیادہ تکلیف ہونے پر آپ واپس چلے آئے۔ مگر تاریخ نے اسے ہجرت کی اصطلاح سے یاد نہیں کیا ہے۔

قدیم عرب بھی حج کیا کرتے تھے چنانچہ حج کے موسم میں جب مختلف اقطاعِ عرب کے حاجی آ کر منا (قریب مکہ) کے میدان میں جمع ہوتے تھے اور میلہ لگتا تھا تو اس اجتماع سے فائدہ اُٹھا کر آنحضرتؐ مختلف قبائل کے پڑاؤوں میں جاتے اور انہیں اسلام کی دعوت دے کر کہتے کہ مجھے اپنے ملک لے چلو۔ اگر تم میری بات مانو تو قیصر و کسریٰ کی دولتیں تم پر نچھاور ہونے کو تیار رہیں۔ تاریخ نے اس خواہشِ ترکِ وطن کو بھی ہجرت کا نام عام طور سے نہیں دیا گو بعض وقت

(بقیہ نوٹ صفحہ ۲۸۵) میرا ذاتی گمان ہے کہ غرانیق کی آیتیں ممکن ہے آنحضرتؐ ہی نے تلاوت فرمائی ہوں لیکن سوال کے طور پر (یعنی کیا وہ بڑے سردار ہیں اور کیا ان کی سفارش کی توقع کی جا سکتی ہے؟) بغیر حرفِ سوال کے سوالیہ آیتیں قرآن مجید میں بکثرت ہیں (مثلاً حضرت ابراہیمؑ کا چاند سورج وغیرہ کو خدا کہنا) ــــ اور جب التباس کا شبہہ ہوا تو یہ آیتیں منسوخ ہو گئیں، جس طرح قرآن میں اور جگہ بھی ہوا ہے اور نئی آیتیں نازل کی گئی ہیں۔

"ہجرت کا ارادہ" اسے ضرور سمجھا گیا ہے۔

آخر مدینے والوں سے بیعتِ عقبہ ہوئی اور انھوں نے اقرار کیا کہ آنحضرتؐ اور دیگر مسلمانوں کے مدینہ آنے پر وہ ویسی ہی حفاظت کریں گے جیسی اپنی اور اپنے بیوی بچوں کی۔ اور چند سو مسلمان جو مکے میں تھے مدینہ چلے گئے۔ یہ وہ ہجرت ہے جس کی طرف منسوب ہو کر سنہ ہجری بھی رائج ہے اور لفظ ہجرت سے اب عام طور پر دماغ فوراً اسی واقعے کی طرف رجوع ہوتا ہے۔

٢- نومسلموں کو اسلامی علاقے میں آ رہنے کا حکم دینا

لفظ ہجرت کے اس دوسرے مفہوم کے دو پہلو ہیں۔ ایک تو وہی جو آج کل "ملکی بننا" (نیچرالیزیشن) کہلاتا ہے، یعنی جب ایک قومیت والا دوسری قومیت اختیار کرنا چاہے تو آخرالذکر کے ملک میں جا کر مقیم ہو جائے اور حتی الامکان اسی کا تمدن اور تخیل بھی اختیار کرے۔ چونکہ اسلام ایک خاص قسم کی اور مستقل قومیت ہے جو دیگر جغرافی، نسلی، لسانی اور رنگی قومیتوں سے جدا ہے اس لیئے ظاہر ہے کہ اسلام اپنے گھر میں اپنے مخصوص اصولوں پر عمل چاہے گا۔ جو شخص اسلامی قومیت اختیار کرنا چاہے تو اس کے رنگ، اس کی نسل اور اس کی زبان سے بحث نہیں ہوگی۔ اسے صرف لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کا قائل ہونا اور قرآن پر چلنے کا اقرار کرنا ہوگا۔ اسی لیئے نہ تو ایسے شخص کو بارہ سالہ قیام کی ضرورت ہوتی ہے، نہ مقامی زبان اچھی طرح جاننے کا صداقت نامہ پیش کرنا ہوتا ہے اور نہ کسی خاص جگہ رہنے کی پابندی

ہوتی ہے۔ البتہ یہ صحیح ہے کہ اس پر وہ سب ذمہ داریاں فوراً عاید ہو جاتی ہیں جو عام مسلمانوں پر عائد ہیں اور وہ سب حقوق بھی حاصل ہو جاتے ہیں جو عام مسلمانوں کو حاصل ہیں۔ آج کل تو یہ ضروری نہیں رہا ہے کہ کوئی شخص جو اسلام قبول کرنا چاہے وہ اسلامی ملک میں بھی آ رہے اور عہدِ نبویؐ میں بھی فتح مکہ کے بعد ایسی کوئی پابندی نہیں تھی۔ لیکن ہجرتِ مدینہ کے بعد ابتدائی چند سالوں میں ہر مسلمان ہونے والے شخص کو اسلامی سرزمین میں آ کر مقیم ہونا پڑتا تھا۔ جیسا کہ نیچے مزید تفصیل آئے گی۔

اس مفہوم کا دوسرا پہلو وہ پالیسی ہے کہ مسلمان اسلامی علاقے میں رہیں اور مرکز سے بچھڑے رہنے کے باعث نقصان نہ تو خود اٹھائیں اور نہ دیگر مسلمانوں کو پہنچائیں۔ اسلامی علاقے میں آ رہنے سے ایک تو "افتتان" سے بچنا ممکن ہے، ورنہ غیر مذہب والے ہمسایہ بہلا پھسلا کر، ڈرا دھمکا کر، خانگی یا اجتماعی یا سرکاری دباؤ ڈال کر فتنے میں مبتلا کر سکتے ہیں۔ چنانچہ خود عہدِ نبویؐ میں مہاجرین حبشہ میں سے کم از کم دو باوجود نجاشی کی غیر متعصبانہ حکومت کے اُس عیسائی ماحول میں عیسائی بن گئے۔ ایک بی بی سودہؓ کا شوہر سکران دوسرا بی بی اُم حبیبہؓ کا شوہر عبیداللہ بن جحش۔ اس آخر الذکر نے بقول طبری اپنی بیوی کو بھی عیسائی بننے کے لئے دباؤ ڈالا مگر وہ ثابت قدم رہیں۔ دوسرے اسلام کے جملہ اصول کا سیکھنا اسلامی تہذیب اور اسلامی ماحول کا حاصل کرنا غیر اسلامی ملک میں بڑی حد تک ناممکن ہے۔ جرمنی اور انگلستان میں چھوٹے چھوٹے دیہات میں بھی میں نے نو مسلم دیکھے ہیں اور ان کو

سب سے بڑی تکلیف یہ محسوس ہوتی تھی کہ ان کے بچوں کی تعلیم عام مقامی مدارس کے غیر اسلامی ماحول میں کما حقہ نہیں ہو سکتی۔ تیسرے اگر مسلمان چو طرف بٹے رہیں تو ہر ٹکڑی کمزور ہوگی اور ہر کسی طاقت والے کا شکار بن جائے گی۔ اس لئے مسلمانوں کا عہد نبوی میں یہ فریضہ قرار دیا گیا تھا کہ وہ نہ صرف اسلام قبول کر کے اسلامی احکام پر چلیں بلکہ اسلامی علاقے میں بھی آ کر آباد ہو جائیں۔ اس طرح مسلمانوں کی اجتماعی قوت زیادہ ہوگی اور وہ اپنے حریفوں کا نسبۃً زیادہ آسانی کے ساتھ مقابلہ کر سکیں گے، غرض "اولاً استحکام پھر توسیع" کا اصول کار فرما رہا۔

یہی وجہ ہے کہ جب کبھی کسی قبیلے کا وفد مدینہ آ کر اسلام قبول کرنے کا اظہار کرتا تو آنحضرت ان لوگوں کو مدینہ آ بسنے کی ہدایت فرماتے۔ اسی طرح جب کبھی دورہ کرنے والے مبلغ بھیجے جاتے تو انھیں سمجھا دیا جاتا کہ نومسلموں سے کہہ دیں کہ وہ مدینہ جا رہیں جہاں ان کے لئے روزگار کا انتظام کیا جائے گا یہ لوگ زیادہ تر قابل کاشت افتادہ زمینوں، بعض صورتوں میں معدنیات کی کانوں میں کام کرتے اور اپنی گزر بسر کا انتظام کر لیتے تھے۔

سات سال تک اس اصول کی پابندی ہوتی رہی اور جب مکہ فتح ہو گیا اور اسلام کا پورے عرب میں بول بالا ہو گیا تو پھر اعلان نبوی شائع ہوا کہ لا ہجرۃ بعد الفتح (فتح کے بعد ہجرت کی ضرورت نہیں)۔ اس مشہور و معروف حدیث شریف کا ایک تو یہ مفہوم ہو سکتا ہے کہ اہل حجاز کو ہجرت کی ضرورت نہیں کیونکہ اب ان کا پورا علاقہ اسلامی سرزمین بن چکا ہے اور اسلامی قلمرو میں داخل ہو گیا ہے

یا اس کا مفہوم ایک عام حکم ہے کہ جب کسی علاقے پر اسلامی مملکت قائم ہو جائے تو پھر اس علاقے کے اندر مسلمانوں کا جبری تبادلۂ آبادی غیر ضروری ہے کیونکہ اس سرزمین کے ہر گوشے میں اسلامی حکومت ہوگی، اسلامی ماحول ہوگا اور اسلامی تعلیم و عبادت کی سہولت ہوگی۔

عہد نبوی میں فتح مکہ سے پہلے چند قبائل کو اس قاعدے سے مستثنا بھی کیا گیا تھا۔ طبقات ابن سعد وغیرہ میں تلاش پر مجھے ایسی دو ہی چار نظیریں مل سکی ہیں۔ ان پر غور کرنے سے سیاست نبوی کی دور رس مصلحتوں پر روشنی پڑتی ہے۔ چنانچہ جب کبھی کسی قبیلے کا اکا دکا آدمی مسلمان ہوتا تو اسے اپنے سابقہ وطن میں رہنے نہیں دیا جاتا تھا بلکہ اسے لازمی طور سے مدینہ آ رہنے کی تاکید کی جاتی اور وہ (مع بیوی بچوں کے اگر کوئی ہوں) اسلامی علاقے میں آ کر بس جاتا۔ اس کے برخلاف اگر کوئی پورے کا پورا قبیلہ مسلمان ہوتا تو یہ دیکھا جاتا کہ وہ کس جگہ رہتے ہیں۔ اگر ان کا علاقہ اسلامی سرزمین سے متصل یا بہت قریب ہوتا اور اس قبیلے کی قوت بھی کافی ہوتی تو اسے وہیں اس کے سابق وطن ہی میں رہنے دیا جاتا۔ کیونکہ اس کے معنے دراصل اسلامی مملکت کی سرحد کی توسیع اور نئے علاقے کا الحاق تھا۔ قبیلہ مزینہ اس کی اچھی نظیر ہے جس کے حالات ابن سعد نے لکھے ہیں [illegible] میں یہ قبیلہ مسلمان ہوا۔ اس قبیلے کے وفد ہی میں کئی سو آدمی تھے۔ ان کا علاقہ مدینے سے صرف بیس میل پر واقع تھا آنحضرتؐ نے ان سب کو ان کے سابقہ مسکن ہی میں رہنے کا حکم دیا۔ البتہ تعلیم و تربیت وغیرہ کا مناسب بند و بست کر دیا گیا۔ اس توسیع کی پالیسی کا ایک پہلو یہ بھی تھا کہ دشمن کو [illegible] چنانچہ مکے کے

چاروں طرف اسلامی قبائل آباد رہنے دیے گئے۔ قبیلۂ اسلم خاص طور پر اس سلسلے میں قابل ذکر ہے۔ اس قبیلہ کے لوگوں کو آنحضرتؐ نے فرمایا تھا کہ تم لوگ اپنے ملک ہی میں رہو اور تمھیں وہی حقوق اور وہی ثواب حاصل ہوگا جو مہاجرین کو حاصل ہوتا ہے۔ اس جگہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ آنحضرتؐ نے ہجرت کا حکم دے کر اس کو مذہبی رنگ بھی عطا کر دیا کہ ہجرت کرنا ایک ثواب کا کام ہے اور کسی مذہبی آدمی کے لئے یہ بات کافی ہے۔ مزید برآں مہاجرین کے لئے چند حقوق بھی تھے مثلاً اسلامی مملکت کی آمدنی اسلامی سرزمین ہی پر خرچ ہوتی تھی اور روز ینے، تنخواہیں، انعام و اکرام وغیرہ بھی وہیں کے باشندوں کو حاصل ہو سکتے تھے۔

قبیلۂ اسلم اصل میں قبیلۂ خزاعہ کی ایک شاخ تھی۔ خزاعہ مکّے کے جنوب میں رہتے تھے اور غالباً اسلم بھی وہیں رہتے ہوں گے۔ جب دشمن کے چاروں طرف اس طرح اسلامی بستیوں کا سلسلہ قائم ہو کر جال بن گیا تو زبردست دشمن کو بے خونریزی مطیع کرنے کا عام اسلامی اصول بہ آسانی روبعمل آسکا۔ اور زبردست دشمن کے مطیع اور مسلمان ہو جانے سے اس کی پوری قوت اسلام کے کام آسکتی ہے۔ اس کے محض تباہ کر دینے کے معنے ایک ممکنہ قوت و مدد سے محروم ہونا ہے۔

بہرحال اس طرح کی اجازت دینے میں اس کی سختی سے جانچ پڑتال ہوتی تھی کہ آیا وہ لوگ اپنی ضرورتیں خود مہیا کرتے ہیں، ان کے پاس کافی ذرائع معیشت مثلاً جانور اور زمین وغیرہ ہیں یا نہیں اور یہ کہ حریف ان پر معاشی دباؤ ڈال کر انھیں مرتد تو نہیں کر سکتا ہے؟ ان سب کے علاوہ ایک اور صورت بھی ممکن تھی اور اس کی بہ کثرت نظیریں ابن سعد وغیرہ نے محفوظ کی ہیں۔ وہ یہ کہ

اگر کسی قبیلے کے چند خاندان مسلمان ہو جائیں اور یہ نومسلم بذات خود کافی قوت رکھتے ہوں اور معاشی حیثیت سے پختہ ہوں تو ایسے نومسلموں کو آنحضرت کا حکم "فارقوا المشرکین" ہوا کرتا تھا۔ یعنی اپنے غیر مسلم رشتہ داروں اور حلیفوں سے ہر طرح کے تعلقات منقطع کر لو۔ شادی، بیاہ، بین القبائل جنگیں، اور مماثل معاملات میں مشرکین سے ان کا کوئی تعلق نہ رہے۔ وہ اسلامی تعلیم پر عمل کریں، نماز اور زکات کی پابندی کریں اور سیاسی حیثیت سے مدینے کے ساتھ ملحق ہو جائیں۔ ایسے دور دراز قبائل کو مقامی خود اختیاری بھی حاصل ہو جاتی تھی اور مدینے کے ساتھ ان کا تعلق میری نظر اور اندازے میں ایک عہدیہ (کنفی ڈریشن) سے بڑھ کر نہ تھا۔ چنانچہ آس پاس کے دیگر اسلامی قبائل یا بستیوں کی وقتِ ضرورت حفاظت کرنا، کمک اور مدد بہم پہنچانا اور دیگر غیر مسلم قبائل سے لڑ کر اپنی حفاظت واستحکام کے فرائض انجام دینا، یہ سب ایسے امور تھے جن کی ہدایت تو مدینے سے ہوتی تھی لیکن نگرانی اور تعمیل مقامی وحدت سے متعلق تھی۔ چنانچہ ایسی تفصیلی نظیریں متعدد موجود ہیں۔ اسی طرح کے نومسلم قبائل میں سے یمن کی ایک دلچسپ نظیر ابن سعد نے محفوظ کی ہے کہ چند لوگ مدینہ آئے اور آنحضرتؐ سے کہا کہ آپ کے بھیجے ہوئے معلم ہمارے پاس آئے اور انھوں نے ہم سے کہا کہ جو ہجرت نہ کرے اس کا اسلام قبول نہیں۔ ہمارے ملک میں ہماری جائداد اور معیشت کی چیزیں ہیں۔ کیا آپ کے معلم کا کہنا ٹھیک ہے؟ ہمیں اس کی تعمیل میں کوئی تامل نہیں۔ آنحضرتؐ نے فرمایا۔ نہیں اسلام کا قبول ہونا اس پر موقوف نہیں۔ تم جہاں رہو تمھیں مہاجرین ہی کے حقوق و فرائض حاصل ہوں گے۔

اس طرح کی دور دراز اسلامی بستیوں میں تعلیم کے بندوبست کے لئے دورہ کناں معلم مقرر کئے جاتے تھے۔ ان مقاموں کے نوعمر اور ذہین لوگوں کو مدینہ بلاکر کچھ عرصہ اسلامی صدر مرکز میں رکھا جاتا اور اسلامی تربیت سے آراستہ کرکے ان کے ملک کو واپس کر دیا جاتا تھا۔ ان کے علاقوں میں مسجدیں بنانے کی خاص تاکید ہوتی تھی۔ عمان جیسے دور دراز مقام کے نومسلموں کے نام آنحضرتؐ کا ایک تنبیہی ہدایت نامہ بخاری وغیرہ نے محفوظ کیا ہے کہ مسجدیں بناؤ ورنہ فوج بھیج کر تمہیں سزا دی جائے گی۔

مختصر یہ کہ عہد نبویؐ میں ہجرت کا یہ مفہوم بھی تھا کہ نومسلموں کو اسلامی علاقے میں بسایا جائے اور آیت وَمَن يَخْرُجْ مِن بَيْتِهِ مُهَاجِرًا إِلَى اللَّهِ وَرَسُولِهِ میں اسی طرف اشارہ ہے کہ اس طرح سے رفتہ رفتہ اسلامی علاقے کی توسیع ہوتی رہے گی، تاکہ اس بڑھنے والی آبادی کے لئے خدا کی زمین تنگ نہ ہو جائے۔ اصل منشا یہ تھا کہ خدا کے ملک میں خدا ہی کا راج ہو۔ اور عام فاتحین کے برخلاف جو فتح کا منشا لوٹ مار کرنا اور اپنوں کو نوازنا سمجھتے رہے ہیں، اسلامی فتح کا منشا یہ تھا کہ کسی انسان اکسی جانور تک کا بے ضرورت خون نہ بہایا جائے اور کوئی درخت کوئی پودا تک رائیگاں ضائع نہ کیا جائے، جیسا کہ سپہ سالاروں کو دی ہوئی ہدایتوں میں آنحضرتؐ نے بارہا فرمایا ہے۔ منشا صرف یہ تھا کہ دنیا میں خدا کی حکومت اور خدا ہی کا بول بالا ہو اور خدا کے احکام سے کوئی بھی مستثنا نہ ہو یہاں تک کہ حکمرانِ ملک تک اپنے کیے کا مواخذہ دار ہو۔ سیرت شامی میں ایسے بکثرت نظائر ایک مستقل باب میں جمع کئے گئے ہیں جب آنحضرتؐ نے

اپنی ذات کے خلاف مقدمے سنے اور فریق ثانی کے حق میں فیصلہ کرے۔

۳۔ نو آبادکاری یا مفتوحہ علاقے میں مسلمانوں کو بسانا

رسول کریم نے دس مصروف سال ایک مملکت کے قیام و استحکام میں نہ صرف صرف کئے بلکہ اپنے ہونے والے جانشینوں کو حکمرانی اور سپہ سالاری کی ساتھ ساتھ مکمل تربیت بھی دی۔ یہی وجہ ہے کہ آنحضرتؐ کی وفات کے چند ماہ بعد ہی جب آپ کے جانشین نے حضرت سیف اللہ خالد بن الولید کو ایرانی سرحد پر بھیجا تو اس وقت ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عرب میں عربوں کا نہ سما سکنا اور سرحد پر نئی عرب بستیوں کا بسانا ایک طے شدہ مسئلہ تھا۔ چنانچہ امام ابو یوسف نے اپنی مشہور کتاب الخراج (صفحہ ۸۵) میں حضرت خالد اور حیرہ والوں کا ۱۲ھ کا جو طویل معاہدہ نقل کیا ہے اس میں دار الاسلام اور دار الہجرت کا اس طرح سے ذکر کیا گیا ہے کہ گویا وہ مشہور و معروف چیزیں ہیں اور سیاق و سباق اس بات میں ذرا بھی شبہ نہیں کرنے دیتے کہ دار الاسلام سے مراد عرب ہے اور دار الہجرۃ سے مراد جنوبی عراق کا وہ مفتوحہ اسلامی علاقہ ہے جہاں عرب فوراً بستے جا رہے تھے۔ اس سلسلے میں قادسیہ کی مشہور اور عہد آفریں جنگ کے بعد اسلامی سپہ سالار اور مرکز خلافت کی جو مراسلت ہوئی وہ ایک مزید اہم تاریخی دستاویز ہے:-

ثم کتب سعد الی عمر یسالہ ما یأمرہ اللہ علیہ بسلمین۔ فکتب الیہ عمر ان قف وکا تطلبوا غیر ذلک	قیلۂ مارشل حضرت سعد بن ابی وقاص نے خلیفہ حضرت عمرؓ کو اس فتح کی کیفیت لکھ بھیجا جو خدا نے مسلمانوں کو

فكتب إليه سعد أيضاً إنما هي سربة أدركناها والأرض بين أيدينا. فكتب إليه عمر أن قف مكانك ولا تتبعهم واتخذ للمسلمين دار هجرة ومنزل جهاد ولا تجعل بيني وبين المسلمين بحراً (تاریخ طبری احوال سنہ ۱۶ھ نیز تاریخ مقدسی برموقع)

(قادسیہ میں) عطا کی تھی، تو حضرت عمرؓ نے انھیں جواب دیا کہ ٹھہرے رہو اور کسی دوسری چیز کی تلاش نہ کرو۔ اس پر حضرت سعدؓ نے پھر لکھا کہ یہ تو (چوپایوں یا عورتوں کا) ایک گلہ تھا جو ہمیں ملا اور زمین تو ہمارے سامنے پڑی ہوئی ہے۔ حضرت عمرؓ نے پھر یہی جواب دیا کہ اپنی جگہ ٹھہرے رہو اور ان کا پیچھا نہ کرو اور مسلمانوں کے لئے ایک جا بسنے کا مقام (دار ہجرہ) اور ایک جہاد کے لئے راستے میں ٹھہرنے کی منزل تیار کر دو لیکن مجھ میں اور مسلمانوں میں کوئی ندی سمندر حائل نہ ہو۔

غرض اصول یہ تھا کہ سرحدوں اسلامی علاقے اور دشمن کے علاقے کے بیچ میں نو آبادیاں بسائی جائیں اور مرکز سے ان کو کمک جانے میں کوئی موانع حائل نہ ہوں اور اس نو آبادی کا منشا صرف ایک منزل اور اسٹیشن کا ہو تاکہ اور آگے جانے میں سہولت ہو۔ اور بغیر اس طرح کے استحکامی انتظامات کرنے کے محض آگے بڑھ جانا، چاہے اس میں کتنی ہی سہولت کیوں نہ ہو، نامناسب ہے۔ چنانچہ ان احکام کی تعمیل میں بصرہ اور پھر کوفہ بسائے گئے اور سکندر دہلاکو کی سی بے اصول

فتوحات کا باوجود ہر طرح کی للچاہٹ کے سدباب کیا گیا۔ نتائج ظاہر ہیں کہ کس کی فتوحات دیرپا رہیں۔

جب اس طرح کی نوآبادیاں (یا اس زمانے کی اصطلاح میں "دارِ ہجرت") چھن لی جائیں تو پھر سینکڑوں ہی نہیں ہزاروں عرب مع خاندانوں، بیوی بچوں اور غلاموں کے وہاں جا بستے۔ نوآبادی کا ایک خصوصی افسر ہوتا تھا جو سڑکوں کی جگہ چھوڑتا، مسجد اور بازار کی جگہ معین کرتا اور پوری باقاعدگی سے دیکھتے دیکھتے ایک عرب شہر آباد ہو جاتا۔ پروفیسر مارسے نے فرانسیسی اکاڈیمی کی رکنیت پر منتخب ہونے پر جو افتتاحی مضمون لکھ کر سنایا تھا وہ "اسلام اور حضری زندگی" پر تھا۔ اس میں وہ تسلیم کرتا ہے کہ نئے شہر بسانے میں عرب بڑے خوش نصیب رہے ہیں۔ ان کا بسایا ہوا تقریباً ہر شہر آج بھی آباد و سرسبز ہے اور بعض کی اہمیت تو تیرہ سو سال گزرنے پر بھی روز افزوں ہے (مثلاً بصرہ)۔ شہر کوفہ حضرت عمرؓ کے زمانے میں جس طور سے بسایا گیا تھا اس پر پروفیسر ماسینیوں نے ایک دلچسپ مقالہ شائع کیا ہے جس کے ساتھ اس ابتدائی بستی کا نقشہ بھی موجود ہے جو اس عہد کی "تمصیر" یعنی شہر بسانے کے اصول پر اچھی روشنی ڈالتا ہے۔

نظر بندی | اس عنوان سے میرا منشا یہ ہے کہ اپنے لوگوں کو فرار ہو کر دشمن سے جا ملنے سے جبراً روکا جائے تاکہ عارضی اختلاف رائے کے باعث اپنے دل برداشتہ بھائیوں کو ایسی حرکت نہ کرنے دی جائے جس کے سبب سے قطع تعلق دائمی اور ناقابل اصلاح ہو جائے۔

اس سلسلے میں ایک تو صلح حدیبیہ کا مشہور واقعہ ہے جس میں قریش نے

آنحضرتؐ سے یہ اقرار لیا تھا کہ اگر کوئی قریشی اپنے ولی و سرپرست سے پوچھے بغیر آنحضرتؐ کے پاس چلا آئے تو قریش کے مطالبے پر آنحضرتؐ اُسے واپس کردیں۔ لیکن کوئی مسلمان قریش کے پاس چلا جائے تو اس کی تحویل نہیں ہوسکے گی۔ قریش کا اس سے ظاہر ہے وہی منشا تھا جو اوپر بیان ہوا۔ اس یک طرفہ شرط کی پابندی کو آنحضرتؐ نے امام سرخسی کی رائے میں اس لئے قبول کیا تھا کہ اس وقت (۶ھ میں) مسلمانوں کے وقتِ واحد میں دو دشمن تھے :۔ مدینے کے شمال میں خیبری یہود اور مدینے کے جنوب میں مکی قریش۔ ان میں باہم حلیفی کی گفت و شنید ہو رہی تھی اور مسلمانوں میں اتنی قوت نہ تھی کہ دونوں کے علاقوں پر فوجیں بھیج کر سانپوں کو انڈے ہی میں کچل سکیں اور مناسب معلوم ہوتا تھا کہ کسی ایک فریق سے صلح کر کے دوسرے کا قلع قمع کیا جائے۔ حسبہ صلح حدیبیہ کی یہ شرط منظور کی گئی اور معاوضے میں قریش سے غیر جانبداری کا اقرار لیا گیا ہے اور مہینے بھر بعد خیبر کے فتنے کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ کر دیا گیا۔

آنحضرتؐ نے حدیبیہ کی شرطِ تحویل کی تعبیر یہ فرمائی کہ کوئی مرد اگر مکے سے آئے تو وہ مطالبے پر واپس کر دیا جائے گا لیکن کوئی عورت اس طرح واپس نہیں کی جائے گی اگر وہ مسلمان ہو چکی ہو۔ معاہدہ ہو چکنے کے بعد بعض مقدمات میں اس تعبیر کی ضرورت پیش آئی تھی اور قریش نے بھی اسے تسلیم کر لیا تھا۔

دوسری نظیر حضرت عمرؓ کے زمانے کی ملی ہے۔ چنانچہ ۱۵ھ کے حالات میں طبری نے حضرت عمرؓ کا ایک خط بنام قیصر ہرقل نقل کیا ہے :۔

مجھے اطلاع ملی ہے کہ ایک عرب قبیلہ ہمارے ملک کو چھوڑ کر

تیرے ملک میں آگیا ہے۔ خدا کی قسم اگر تو ان کو نکال واپس نہ کرے
تو ہم ہمارے ملک میں رہنے والے نصرانیوں سے صلح
توڑ دیں گے اور ان سب کو تیرے ملک کی طرف جلا وطن کر دیں گے۔

تبادلۂ آبادی | عہد نبویؐ اور خلافت راشدہ میں سوائے جنگی قیدیوں کے دیگر طبقات آبادی کے دوسرے ممالک میں تبادلے کی مجھے کوئی نظیر نہیں ملی فقہ کی کتابوں سے اتنا پتہ چلتا ہے کہ کسی نو مفتوح علاقے کے باشندوں کو عام طور پر چھ مہینوں کی مہلت ہوتی تھی کہ وہ اپنے مسکن کے متعلق فیصلہ کرلیں کہ اسلامی رعایا اور ذمی بننا چاہتے ہیں یا اپنے لئے کوئی اور ملک پسند کرکے چلے جانا چاہتے ہیں۔ مگر اسے مشکل ہی سے تبادلہ آبادی کہا جا سکتا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ جو قومیت نسل، زبان یا رنگ پر مبنی نہیں ہے۔ اس کے لئے اس زمانے میں غیر ممالک سے ہم قوم (یعنی مسلمان) تبادلے میں مل بھی نہیں سکتے تھے۔

منتقلی و جلا وطنی | جلا وطنی کی البتہ بہت سی نظیریں ملتی ہیں۔

آں حضرتؐ نے مدینے کے یہودی قبائل بنو قینقاع اور بنو نضیر کو ان کی شرارتوں کی بنا پر حکم دیا تھا کہ مدینے سے چلے جائیں۔ ان میں سے اکثر خیبر میں جا بسے جو اس وقت تک ایک آزاد شہری مملکت تھا۔ سنہ ھ میں جب اس کا الحاق مملکت اسلامیہ سے ہوا تو ابتداءً سب یہودیوں کو وہاں سے بھی چلے جانے کا حکم دیا گیا۔ پھر انھیں تا حکم ثانی اس شرط پر وہاں رہنے کی اجازت دی گئی کہ وہ اپنے باغوں کی آدھی فصل مالگزاری میں دیں۔

جلا وطنی کے سلسلے میں آں حضرتؐ کی وہ مشہور حدیث یہاں بیان لائق کی

جا سکتی ہے جو اپنی وفات سے کچھ ہی عرصہ پہلے آپؐ نے ارشاد فرمائی تھی کہ عرب میں دو دین والے نہ رہیں (یعنی صرف ایک ہی دین کے پیرو یعنی مسلمان رہیں) اور یہ کہ یہود و نصارا کو عرب سے نکال دیا جائے۔ اس کی تعمیل میں حضرت عمرؓ نے نجران (یمن) سے عیسائیوں کو اور خیبر وغیرہ سے یہودیوں کو نکال کر دیگر اسلامی علاقوں یعنی عراق اور شام میں منتقل کر دیا۔ اس پالیسی کا شاید یہ منشا تھا کہ صدر مقام اور مرکز میں اجنبی اور ناقابل اعتماد عناصر نہ رہیں اور یہ امر نیم جنگی اور نیم معاشرتی مصلحت پر مبنی تھا۔

حضرت عمرؓ کے زمانے میں فیلڈ مارشل حضرت ابو عبیدہؓ نے بعلبک والوں سے جو معاہدہ کیا تھا (دیکھئے تاریخ طبری) اس میں یونانیوں کو چند ماہ تک ملک میں رہنے کی اجازت دی گئی تھی جس کے بعد انھیں وہاں سے جہاں جی چاہے نکل جانے کا پابند کیا گیا تھا بجز ان کے جو مسلمان ہو جائیں۔ شہر بیت المقدس سے جو معاہدہ ہوا اس میں حضرت عمرؓ نے مقامی عیسائیوں کی یہ شرط منظور کی تھی کہ ان کے شہر میں یہودی نہ رہنے دئے جائیں۔ (حوالہ ایضاً)۔

مختصر یہ کہ "اولاً استحکام پھر توسیع" کا اصول اس عہد کی پالیسی کا ایک اہم ستون تھا اور "لا اکراہ فی الدین" کے حکم کے باعث جبراً کسی کو مسلمان بنانے کی تو کبھی بھی اجازت نہ ملی لیکن حکومت الٰہیہ کا قیام ایک فریضہ قرار دیا گیا (اور "وَقَاتِلُوهُمْ حَتّٰى لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ وَيَكُونَ الدِّينُ كُلُّهُ لِلّٰهِ" میں "دین" سے مراد غلبہ اور حکومت ہے) اور ذمی رعایا بننے کی اس شرط پر اجازت دی گئی کہ وہ اطاعت کریں، "صغار" قبول کریں یعنی حکومت میں شرکت نہ چاہیں

اور شرائط معاہدہ کی تعمیل کرتے ہیں۔ ایسا ہو تو ان کو ہر کام کی آزادی رہے گی۔ اور ان کے مذہبی اور عدالتی مسائل انھیں کے ہمقوم افسروں کے سپرد رہیں گے اور ان کی جان و مال کی اسلامی حکومت اتنی ہی حفاظت کرے گی جتنی مسلمانوں کی۔ یہی حال عہد نبوی میں شروع سے رہا جب کہ مدینے کے یہودیوں نے آں حضرت صلعم کو اعلیٰ ترین عدالتی اور فوجی اور سیاسی اختیارات سپرد کر دیئے تھے اور یہی اصول خلافت راشدہ میں بھی کارفرما رہا۔

(رسالہ سیاست حیدرآباد۔ جولائی سنہ ۱۹۳۱ء)

لہ ملاحظہ ہو باب "دنیا کا سب سے پہلا تحریری دستور" جس میں آں حضرت کے مرتب کئے ہوئے تحریری دستور مملکت مدینہ بابت سنہ ۱ھ کی تحلیل کی گئی ہے۔

آں حضرت صلعم اور جوانی

قرآن مجید کی پہلی آیت ہے "اَلحَمدُ لِلّٰہِ رَبِّ العالمین" ہر طرح کی تعریف اسی خدا کو سزاوار ہے جو تمام عالموں کا آقا ہے۔ انسان خدا کا نائب انسانوں میں مسلمان خیرِ اُمّت اور خدا کے دین و مذہب کے پیرو ہونے کے مدعی ہیں تو آنکھیں یہ دیکھنے کی اور کان یہ سننے کے منتظر تھے کہ دنیا کی آقائی مسلمان ہی کرتے ہوں گے۔ اگر ایسا نہ ہو تو دعویٰ غلط ہے یا اسلام کے مدعی احکام اسلام پر عامل نہیں ہیں۔ اس کے علاوہ کوئی تیسرا امکان ہی نہیں۔

تاریخ کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ دعوے میں کوئی مبالغہ یا غلطی نہیں ہے۔ عہد نبویؐ میں وطن سے بے وطن ہونے کے بعد جب سنہ ۱ھ میں شہر مدینہ کے چند محلے اسلامی مملکت کہلانے لگے تو اس میں دس سال تک اوسطاً روزانہ (۴۷۲) مربع میل کی بے نظیر سرعت سے اضافہ ہوتا رہا اور جب سنہ ۱۱ھ میں رسول کریم نے اس دنیاوی زندگی سے علیحدگی اختیار فرمائی تو پورے دس لاکھ مربع میل یعنی تقریباً ہندوستان کے برابر علاقہ مسلمانوں کی آقائی میں آچکا تھا۔ اور ابھی آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کو پندرہ سال بھی نہیں ہوئے تھے کہ احکام اسلام پر عمل کرنے کے باعث مسلمان ایشیا، یورپ اور افریقہ کے تین براعظموں پر پھیل گئے، اور یہ حضرت عثمانؓ کا زمانہ تھا جب ایک طرف

اسپین میں مسلمانوں نے قدم جمالیئے اور دوسری طرف قسطنطنیہ کا بحری محاصرہ کرلیا اور قریب تھا کہ اسپین اور قسطنطنیہ دونوں طرف کی فوجیں آگے بڑھتی ہوئی یورپ کے وسط میں کسی جگہ باہم مل جائیں - اور دوسری طرف ترکستان سے گزر کر چین کے مغربی صوبوں پر قبضہ حاصل کی ہوئی اسلامی فوجیں چین کو چیرتی ہوئی بحر الکاہل تک پہنچ جائیں - اور حضرت عمرؓ کے زمانے میں صوبہ بمبئی پر (ہندوستان میں) جو چڑھائی ہوئی تھی وہ جلد صوبہ بنگال تک اتر آتی - لیکن مشیت الٰہی یہ تھی کہ عین اس وقت مسلمانوں میں کاسنگی اور خانہ جنگی شروع ہو اور "مشارق الارض ومغاربھا" کی تعبیر اتنی جلد آنکھوں کے سامنے نہ آئے - پھر بھی ترکستان سے تونس اور اسپین کے بعض ساحلی علاقوں تک مسلمان اس پہلے ہی ملے میں چھاگئے۔

جب یہ تاریخی اور ناقابل تردید واقعات ہیں تو ماننا پڑتا ہے کہ "اسلام" اور "دنیا کی آقائی" لازم و ملزوم ہے جو اصولِ اسلام پر عمل کریگا وہ بڑا جیگا اور جو اُن سے غفلت کرے گا مغلوب بلکہ نابود ہوگا۔

یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ اسلام حقیقت میں رسولِ عربی کی سیرت ہی کا دوسرا نام ہے - اس لیئے اگر کوئی یہ معلوم کرنا چاہتا ہے کہ اصول اسلام کیا ہیں تو اسے رسولِ عربی کی سوانح عمری، آپ کا عمل اور آپ کی تعلیم ـــــ انھیں تین چیزوں کو دیکھنا ہوگا اور یہ اس غرض کے لیئے کافی رہیگا۔

قرآن مجید نے ایک اہم مظہر قدرت کو بڑے دلچسپ انداز میں بیان کیا ہے "آدمی کیا ہے؟ اولاً ایک ضعف و کمزوری اور بے بسی کا نام ہے - پھر قوت (جوانی) آتی ہے اور قوت کے بعد پھر کمزوری یعنی بڑھاپا چھا جاتا ہے" دوسرے

الفاظ میں کچھ کرنے کا زمانہ اور ان "دو کم زوریوں" کا درمیانی مختصر وقفہ یعنی جوانی ہی ہے۔ یہی دن ہیں جب آدمی کو آخرت کا توشہ کما لینا چاہیے اور تاریخ بتاتی ہے کہ یہی وہ زمانہ ہے جب بڑی شخصیتوں کے بڑے کارنامے انجام پائے۔ کسی بچے یا بوڑھے کھوسٹ نے آج تک نہ تو کوئی کارنامہ دکھایا اور نہ آیندہ اس کی کوئی توقع ہے۔

اسی اصول کے تحت رسول کریم علیہ السلام کی سوانح عمری کا وہ باب جو آغاز تا انتہائے جوانی سے متعلق ہے یہاں زیر بحث آ رہا ہے۔

"انسان کی کوتاہ نظری کو کیا کیجیے کہ وہ بڑے شخص کو تو بڑا مان لیتا ہے لیکن کسی ہونے والے بڑے شخص کو پہچان نہیں سکتا۔ بڑے شخص عموماً غیر متوقع مقام اور ماحول سے اُبھرتے ہیں۔ ان کے ساتھیوں اور ہمسایوں میں کسی کو خیال آتا ہے نہ پرواہ ہوتی ہے کہ ان کے حالات تفصیل سے قلم بند کرتے جائیں اور جب یہ جاڑوں کا سورج افق سے ابھرنے کے بعد دھند اور کہر کو اپنے راستے سے صاف کرکے یک بیک آفتابِ عالم تاب بن کر جگمگانے لگتا ہے تو اس وقت لوگوں کو معلوم ہوتا ہے کہ سورج نکل چکا ہے۔ مگر کس طرح نکلا، کتنی دشواریوں پر کس کس طور سے غالب ہوا۔ اس کے جاننے والے بہت کم ہوتے ہیں۔"

یہی وجہ ہے کہ بڑے لوگوں کے بچپن اور آغاز جوانی کی مکمل سوانح عمری نہیں ملتی اور خود ایسے بڑے بڑے لوگ اتنے خود نما کبھی نہیں ہوتے کہ بعد میں ان چیزوں کو خود مرتب کرائیں۔ رسول کریم اس سے کیسے مستثنیٰ ہو سکتے۔ پھر بھی چند باتیں آپ کی ابتدائے عمر کے منتشر سالوں سے متعلق تاریخ نے محفوظ کی ہیں وہ کافی سبق آموز ہیں

حلیمہ پیدا ہونے اور ملکی رواج کے تحت آپ کے ساتھ اس کے گھر (ایک جنگل میں) جا رہنے کے متعدد اثرات کسی بچے پر پڑ سکتے ہیں۔ والدین کا لاڈ پیار اور چوچلے نہیں ملتے۔ بڑے شہر کے مخلوط اور کاروانی اسٹیشن ہونے کے باعث شہر روز بدلنے والی آبادی کے برے اثرات، دولت، آرام طلبی، سہولت بخش اسباب زندگی، مضر تفریحات، ناچ گانا، عیاشی، شراب خواری جیسیوں رذائل سے بچہ بچ جاتا ہے۔ صحرائی زندگی جفاکش، محنت اور سادگی پسند، ہوتی ہے۔ مصنوعات انسانی کی جگہ مناظر قدرت سے لگاؤ اور محبت، ستاروں، کاریتوں، چشموں، سوتوں، شہابیات، سموم اور دیگر ہواؤں اور اسی طرح کے انتظامات فطرت کے کارآمد قواعد سے واقفیت آئندہ زندگی میں مفید ثابت ہوتی ہے۔ بڑے اور ہونہار لوگوں کی باتیں عامیوں کی بڑی عجیب لگتی ہیں مگر بڑے لوگ خود بھی تو عجیب ہی انسان ہوتے ہیں۔ کہتے ہیں رسول کریم اپنی آپا کے صرف ایک طرف سے دودھ پیا کرتے تھے اور اس کا دوسرا دودھ اپنی دودھ بہن کے لئے چھوڑ دیا کرتے تھے۔

ہونہار بچوں میں کم عمری میں بھی چلبلاپن اور شوخی ہوتی ہے۔ آنحضرتؐ کی دودھ بہن لڑکی کا بیان ہے کہ جب وہ آنحضرتؐ کے ساتھ بچپن میں کھیلا کرتی تو ایک دن آپ نے اسے زور سے کاٹا کہ تمام عمر دانت کے نشان جسم پر باقی رہے اور یہ نشان ایک نعمت بھی ثابت ہوئے چنانچہ بعد کو تاجدار مدینہ (علیہ السلام) کی ایک فوج چند لوگوں کو گرفتار کر کے لائی تو ان میں یہ بھی تھی اور اس نے کہا "محمدؐ میں تیری دودھ بہن ہوں چنانچہ تیرے کاٹے کا نشان اب تک میرے کندھے پر

موجود ہے "آنحضرتؐ بڑی محبت سے پیش آئے اور انعام واکرام دے کر اعزازانہ سے اس کے گھر بھجوا دیا۔

ایک دوسرا واقعہ اس وقت کا ہے جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر کوئی پچیس سال کی ہوگی۔ آپ کے شہر والوں سے بعض دیگر قبائل کی چل گئی تھی اور حربِ فجار پیش آئی۔ آنحضرتؐ اپنے چچاؤں کے ساتھ جنگ کو گئے اور ذرا نہ ڈرے بلکہ تیریں اُٹھا اُٹھا کر اپنے چچاؤں کو دیتے گئے کہ ماریئے! اس جنگ سے واپس آتے ہی شہر مکہ سے چند انسانیت پرور لوگوں نے ایک جلسہ طلب کیا اور بتایا کہ ہم خدا کے گھر کے پاسبان ہو کر ظلم اور زیادتی کیا کریں تو یہ بڑے شرم کی بات ہے۔ ہمیں دنیا کے سامنے ایک نمونہ اور مثال پیش کرنی چاہیئے۔ چنانچہ سب حاضرین اور ان کے رشتہ داروں نے حلف اٹھایا کہ آج سے ہم نہ تو خود کسی پر ظلم کریں گے اور نہ ہماری آنکھوں کے سامنے کسی پر ظلم ہوتا ہوا باقی رہنے دیں گے اور اس وقت تک چین نہ لیں گے جب تک مظلوم کو اس کا حق ظالم سے نہ دلا دیں۔ اس حلف کا نام حلف الفضول تھا۔ اور اس رضاکار جمعیت میں بڑے جوش و خروش اور خوشی خوشی وہ نوجوان بھی شریک تھا جو تمام کائنات سے ظلم کو مٹانے پر کمر باندھتا ہے اور جس کی مہم اس کے جانشین تیرہ سو برس سے اب تک لگاتار چلا رہے ہیں۔ اس حلف کے تحت آنحضرتؐ نے کئی ایک مرتبہ بڑے بڑے سرکشوں کا سر نیچا کیا اور ابو جہل جیسے سرپھرے شخص سے ایک اراشی قبیلے والے کا حق دلایا جس کا ذکر تفصیل سے ابن ہشام وغیرہ نے کیا ہے۔

یہی انصاف پسند طبیعت تھی جس نے زبانِ خلق سے آپ کو الامین (امانت دار) کا قابلِ رشک خطاب دلایا۔ قریش آپ سے لڑتے تھے آپ کے خون کے پیاسے تھے۔ آپ کا مال و متاع لوٹ لینے سے دریغ نہیں کرتے تھے لیکن ایسے وقت میں بھی آپ کے پاس اپنا مال لا کر امانت رکھانے سے نہیں ہچکچاتے تھے۔ اور وہ ٹھیک کرتے تھے۔ چنانچہ ہجرت کے وقت جب ایک مکمل و منظم سازش آپ کی جان لینے کی کی گئی اور کسی طرح آپ بچ گئے تو جاتے ہوئے اپنے چچازاد بھائی کو تمام امانتیں دے گئے کہ انھیں اقدامِ قتل کرنے والوں میں سے اصل مالکوں کو واپس کر دیں کہ اب مزید عرصہ حفاظت ممکن نہیں۔ یہی وہ خصلت تھی جس سے وہ لوگ بھی رام ہوتے گئے جنھیں تلوار کچھ نہ سمجھا سکتی تھی۔ اپنوں ہی سے نہیں غیروں اور ذمیوں بلکہ دشمنوں کے ساتھ بھی بات کا پاس کرنا اور اعتماد شکنی سے اجتناب کرنا جس طرح پہلے مفید تھا آج بھی ویسا ہی واجب التعمیل اور یقیناً باعثِ برکت و فلاح ہے۔

یہی امانت و راست بازی تھی کہ بڑے بڑے مشکل مسائل میں لوگ آپ کو ثالث بناتے تھے اور آپ کے حکم کو کتنا ہی اپنی خواہش کے خلاف ہو ہنسی خوشی مان لیتے تھے۔ اور آنحضرتؐ موقع ملنے پر بھی کبھی ناحق اپنے رشتہ داروں دوستوں کا ساتھ نہیں دیتے تھے۔ کعبے کی تعمیر میں حجرِ اسود کے نصب کرنے کا واقعہ سب جانتے ہیں۔ آنحضرتؐ حَکَم تھے اگر چاہتے تو فیصلہ کر دیتے یہ حق بنی ہاشم یعنی اپنے خاندان کا ہے۔ مگر آپ نے اس قومی معبد کے ایک اعزازی کام کی انجام دہی کا اعزاز پوری قوم کو دلایا اور اس وسعتِ قلبی سے آپ کا اعزاز اس سے

بہت بڑھ گیا جتنا محض ایک پتھر کو کسی معبد کی ایک دیوار میں لگانے سے حاصل ہوتا حجر اسود کو اٹھانے والوں کے نام آج کسی کو معلوم نہیں لیکن ان لوگوں کو حجر اسود اٹھانے دینے والے کا نام دوست بھی اور دشمن بھی عزت کے ساتھ یاد رکھتے ہیں

اس امانت داری کے ساتھ ساتھ خود داری کا وصف بھی آپ میں بہت نمایاں نظر آتا ہے۔ آپ یتیم پیدا ہوئے۔ چند سال میں دادا بھی چل بسے تو چچا کے گھر جا رہے۔ چچا کا کنبہ بڑا تھا اور دل بھی بڑا تھا۔ اسی لئے گھر میں اکثر تنگی رہتی تھی۔ آج کل کس بھتیجے کو پرواہ ہے کہ وہ اپنے کفیل چچا کا روزگار کمانے میں ہاتھ بٹائے خود بھاگے پڑھنا درکنار، اگر چچا حکم بھی دے تو ہزار طرح اسے ٹالنے اور کام کو عملاً بگاڑنے کی کوشش کریں گے۔ مگر سچے معلم اخلاق صلی اللہ علیہ وسلم کہنے سے پہلے خود عمل کرتے تھے۔ ابھی آپ کی عمر بارہ ایک سال ہی کی تھی کہ چچا روزگار کے دھندے میں کچھ اسباب تجارت لے کر فلسطین روانہ ہوئے۔ آنحضرت رونے لگے کہ مجھے بھی ساتھ لے چلو۔ اور چچا کو مجبور کر دیا۔ راستے میں آپ چچا کی ہر طرح خدمت کرتے گئے۔ اسباب کی حفاظت اور دیکھ بھال کرنا اور اسی طرح کے سعادت مندانہ کام آپ نے اپنے ذمے لئے۔ اور اپنی موجودگی سے چچا کو ہر فکر سے آزاد کر دیا اور وہ اچھے سے اچھے داموں اسباب فروخت کرنے میں کامیاب ہوئے۔

چند سال بعد چچا ضعیف ہو گئے تو تنہا خود اپنا اور بعض شہر والوں کا سامان لے کر فلسطین گئے اور کاروبار کے ذریعے سے اس قابل ہو گئے کہ نہ صرف اپنی آپ پرورش کرنے لگیں بلکہ چچا کو بھی مدد دینے لگے اور چچا کے ایک بیٹے کو اپنا منہ بولا

بٹیا بناکر پالنے لگا۔

حرکت میں برکت ہو اور دیانت میں نفع ہی نفع ہے، آں حضرتؐ شام، یمن اور بحرین دعمان جیسے دور دراز مقاموں کا سفر کرنے لگے اور کاروانی کاروبار تجارت کے باعث شہر کے بڑے بڑے لوگ ساجھا کرنے کے لئے بلانے لگے۔ آپ کے بعض ساتھی کہا کرتے تھے کہ زمانہ جاہلیت میں ہم نے محمدؐ کے ساتھ تجارتی ساجھا کیا مگر ہمیں یاد نہیں کہ کبھی بھی آپ نے حساب کے بارے میں کچھ جھگڑا کیا ہو۔ اگر ہم آپ کا اسباب لے کر جاتے تو واپسی پر آپ ہم سے صرف خیریت اور مزاج کی کیفیت پوچھتے اور مال کا ذکر تک نہ کرتے اور اگر خود اسباب لے کر جاتے تو سب سے پہلے اس کا ہم سے تذکرہ کرتے۔ اور حساب چکانے کے پہلے گھر تک نہ جاتے۔

اسی حسن سیرت نے آپ کو دولت کے ساتھ شفیق و حسین رفیق زندگی بھی مہیا کیا اور مکے کی لکھ پتی بیوہ بی بی خدیجہ نے خود ہو کر آپ سے نکاح کی خواہش کا

اس دولت سے آپ نے جو کام کیا اُسے آپ کے چچا نے ۵

وابیض یستسقی الغمام بوجہہ ثمال الیتامی عصمۃ للارامل

وہ گورا چٹا جس کا واسطہ دے کر بارش کی دعا مانگی جاتی ہے۔ جو یتیموں کا ملجا ہو تو بیواؤں کا ماوا) یہ کہہ ثبت تاریخ کیا ہے۔

آنحضرت صلعم کا سلوک نوجوانوں کے ساتھ

سیرت طیبہ کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ ذمہ داری کا کام اکثر نوجوانوں ہی کے سپرد کیا جاتا تھا اس کی متعدد نظریں تاریخ نے صراحت سے مہیا کی ہیں۔

کہ جب کسی قبیلے نے اسلام قبول کیا تو آں حضرتؐ نے کسی ذہین و فطین نوجوان کو اس کا سردار مقرر کیا۔ اصل میں معیار یہ تھا کہ اسلامی اصول و شریعت سے کون زیادہ واقف ہے؟ نماز پڑھانے کے لئے قرآن کی سورتیں کسی کو زیادہ یاد ہیں کون اپنے نئے دین سے زیادہ جوش اور دلچسپی کا اظہار کرتا ہے؟ اور یہ صفتیں عموماً نوجوانوں میں پائی جاتی ہیں۔ عموماً نوجوان مدینہ آکر زیادہ تیزی سے قرآنی سورتیں حفظ کر لیتے تھے۔ دیگر امور مثلاً مال و دولت وجاہت و تجربہ زیادہ پیش نظر نہیں رہتا تھا۔ ایک صحابی کا بیان ہے جب میں اپنے قبیلے والوں کے ساتھ مسلمان ہوا تو میری عمر بہت کم تھی لیکن قرآنی سورتیں زیادہ یاد ہونے سے آں حضرتؐ نے مجھے میرے قبیلے کا امام مقرر فرما دیا۔ ایک بہت چھوٹی تہمد کے سوا میرے پاس کپڑے بھی کچھ نہ تھے۔ آخر ایک دن قبیلے کی ایک عورت نے ہمارے مجمع کو مخاطب ہو کر کہا۔ اجی اس لونڈے کو کچھ کپڑے بنا کر دو۔ ورنہ خواہ مخواہ ہماری نماز خراب ہوتی ہے۔ اس پر قبیلے والوں نے چندہ کر کے مجھے ایک جوڑا بنا دیا اور مجھے اس سے اس وقت اتنی خوشی ہوئی تھی کہ بیان سے باہر ہے۔

مدینہ ہجرت کر آتے ہی آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے گھر کے سامنے ایک چبوترہ بنا دیا جس پر سائبان بھی تھا۔ اُسے صُفّہ کہتے تھے۔ دن کو یہ مدرسہ (بلکہ جامعہ!) بن جاتا تھا اور رات کو دار الاقامہ اور بورڈنگ۔ یہاں اعلیٰ تعلیم تو خود رسول کریم دیا کرتے تھے لیکن ابتدائی تعلیم اور لکھنا پڑھنا سکھانا، یہ کام نوجوان رضاکاروں کے سپرد تھا۔ ہجرت کے ڈیڑھ ہی سال بعد بدر کی جنگ پیش آئی اور مکے کے قیدیوں کا فدیہ آنحضرتؐ نے یہ مقرر فرمایا کہ شخص دینے کے دس دس مسلمان

بچوں کو لکھنا پڑھنا سکھائے۔ حضرت زید بن ثابت نے اسی طرح لکھنا سیکھا اور ان کی ذہانت اور خوشخطی کو دیکھ کر آنحضرت نے انھیں اپنا میر منشی (چیف سکریٹری) مقرر کر لیا۔ معاہدات کا لکھنا اور راز کی خط وکتابت انھیں سے متعلق تھی۔ (ان کی ذہانت کا اندازہ اس سے کیجئے کہ فارسی، حبشی اور عبرانی زبانیں بھی اپنے شوق سے مدینہ آنے والے مسافروں سے چند روز میں سیکھ لیں اور جب آنحضرتؐ نے انھیں عبرانی خط بھی سیکھنے کا حکم دیا تو پندرہ دن میں اس میں مہارت پیدا کر لی تاکہ یہودیوں کے خط وکتابت میں اسلامی محکمۂ خارجہ کسی غیر مسلم یہودی کا محتاج نہ رہے۔ حضرت زید بن ثابت کے علاوہ دیگر کاتب بھی اکثر نوعمر تھے۔ حضرت علیؓ، حضرت معاویہ، حضرت ابن مسعودؓ وغیرہ سب نوجوان لوگ تھے۔

اس سے بڑھ کر اہم اور ذمہ داری کے کام بھی کثرت سے نوجوانوں کے سپرد کئے جاتے تھے۔ حضرت اسامہ بن زید کو بارہا فوج کا سپہ سالار مقرر کیا گیا جنگ خیبر میں حضرت علیؓ کی عمر مشکل سے پچیس سال کی ہوگی۔ انھیں ایک بہت اہم معرکے کا افسر بنایا گیا۔ اس کے بعد کے سالوں میں انھیں گورنر اور قاضی جیسے عہدے بھی دئے گئے۔ حضرت عمرو بن حزم اور حضرت معاذ بن جبلؓ بھی بہت نوعمر صحابہ تھے۔ انھیں یمن کے اہم صوبے کا علی الترتیب گورنر اور انسپکٹر جنرل تعلیم بنایا گیا حضرت معاذ کے متعلق مورخ طبری نے لکھا ہے کہ ان کا کام یہ تھا کہ گاؤں گاؤں اور ضلع ضلع دورہ کریں اور وہاں تعلیم کی نگرانی اور بندوبست کریں

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ذاتی صلاحیتیں دیکھ کر مختلف نوجوانوں کو ایک نئی تخصیص کا موقع دیا چنانچہ حضرت زید بن ثابت حساب کے بھی ماہر تھے

اس لئے انھیں تقسیم ترکہ کے ریاضیاتی فن کا امام قرار دیا۔ کسی کو فن تجوید اور قرارت کا ماہر، کسی کو عام مسلئے مسائل اور فقہ کا مستند عالم قرار دیا اور حکم دیا کہ جس کسی کو ان فنون کے متعلق کچھ پوچھنا ہو تو ان ماہرین سے پوچھ لے۔ غالباً ترمذی میں وہ حدیث ہے جس میں تھا:۔

انا مدینۃ العلم و علیؓ بابھا کہہ کر حضرت علی کی عام علمیت کو سراہا گیا ہے۔

آنحضرت کے مشیرانِ خاص بھی اکثر نوجوان تھے۔ ایک حضرت ابوبکرؓ کو چھوڑ کر جو آنحضرت کے تقریباً ہمعمر تھے، باقی تمام اکابر صحابہ حضرت عمرؓ حضرت عثمانؓ، حضرت علیؓ، حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ، حضرت ابن مسعودؓ حضرت سعد بن ابی وقاصؓ، حضرت ابن الجراحؓ سب ہجرت کے وقت نوعمر تھے۔ حضرت ابن عمرؓ، حضرت ابن عباسؓ، حضرت زید بن ثابتؓ وغیرہ تو محض بچے تھے۔

آنحضرتؐ حسب احکام قرآن ہر امر میں مشورہ فرمایا کرتے تھے جس کا منشا نوجوانوں کی تربیت تھا۔ وہ واقعات اور گتھیوں سے واقف ہوتے اور آنحضرت کے فیصلے کو آخر میں سنتے اور اس طرح آئندہ اہم کاموں کے لیئے تیار ہوتے جاتے۔

انتظام مملکت اور سیاست مدن کے لئے جہاں بہت سے عام ادارے (گورنری، عدالت، تحصیل مالگزاری وغیرہ) قائم ہوئے وہیں شہروں اور قبیلوں کا اندرونی نظام بھی درست کیا گیا۔ ہر گاؤں یا بڑے شہر کے ہر محلے میں ہر دس دس آدمیوں پر ایک عریف مقرر ہوتا تھا اور جملہ مقامی عریفوں کا ایک نقیب

ہوتا جو براہ راست عامل (گورنر) کے پاس جوابدہ ہوتا اور عامل کے احکام کا نفاذ بھی اس کے ذریعے سے ہوتا۔ عریف کا کام عموماً نوجوانوں کو دیا جاتا اور وہ بڑی مستعدی اور پھرتی سے اپنے فرائض بجا لاتے۔ ہوازن کے قیدیوں کی رہائی کے متعلق ہزاروں ہی آدمیوں سے رائے لینی تھی۔ یہ کام عریفوں نے دیکھتے کے دیکھتے انجام دے دیا اور نتیجہ آکر آنحضرت کو سنا دیا۔

حوصلہ افزائی کے لئے نوجوانوں کو لشا باشی، اور انعام و اکرام کی بھی کمی نہ تھی اور نوجوانوں کی تربیت پر توجہ کرنا ہی وہ راز معلوم ہوتا ہے کہ وہ قوم جس نے ابتدائے آفرینش سے کبھی حکومت کا نام نہ سنا تھا وہ پندرہ ہی بیس سال میں جب تین براعظموں کی مالک بن جاتی ہے تو ایسے اچھے مدبر اور سپہ سالار اور منتظم افسر بھی مہیا کرنے کے قابل ہو جاتی ہے جن پر تاریخ انسانیت فخر کر سکتی ہے۔ آج تہذیب و تمدن کے دعویداروں اور کمالات انسانی کے مالکوں میں سے کونسی گوری سے گوری قوم ہے جو اس اسلامی نظیر کا جواب پیش کر سکتی ہو کہ حضرت عمرؓ کے زمانے میں جب ایک شہر پر قبضہ ہوا اور حسب معمول شہریوں سے حفاظتی ٹیکس وصول کیا گیا لیکن جلدی ہی جنگی ضرورت سے شہر کا تخلیہ کر کے اسلامی فوج کو وہاں سے ہٹنا پڑا تو جملہ حفاظتی ٹیکس شہریوں کو یہ کہہ کر واپس کر دیا گیا کہ اب ہم تمہاری حفاظت کے قابل نہیں ہیں اور ہمیں یہ رقم رکھنے کا کوئی حق نہیں۔ آج مہذب سے مہذب قوموں میں سے کون اس نظیر کا جواب پیش کر سکتی ہے کہ حضرت عمرؓ کے زمانے میں ایک محصور شہر کے لوگوں نے بعض سابقہ التفات کی بنا پر محاصر فوج کے ایک غلام سے امن نامہ حاصل کر لیا۔

اور فوج کا سپہ سالار مجبور ہو گیا کہ اس مسلمان کی بات کا پاس کرے جو چاہے کتنا ہی کم حیثیت اور ادنیٰ مرتبے کا غلام ہی کیوں نہ ہو۔

اصل میں اعلیٰ تعلیم اتنی اہمیت نہیں رکھتی جتنی اعلیٰ تعمیل۔ اسلام نے کبھی دکھاوے کی خوشنما مگر ناقابل عمل تعلیم نہ دی کہ کوئی ایک طمانچہ لگائے تو دوسرا گال بھی ضرور ہی پیش کر دو۔ کوئی کوٹ چھین لے تو قمیص بھی ضرور ہی اتار کر دیدو۔ اسلام نے اوسط انسانوں کی قابلیت کا لحاظ کر کے قواعد بنائے اور ان کی انتہائی تعمیل ادنیٰ اور اعلیٰ سب سے کرائی۔ ان احکام کا بادشاہ وقت بھی اتنا ہی پابند ہے جتنا کوئی غلام۔ ایثار اور فرشتہ سیرت اعمال کی تعریف تو کی مگر ویسا کرنا ہر کسی پر واجب نہیں کر دیا۔ یہ اصول اسلامی تعلیم کے ہر جزو میں نظر آئے گا۔

اسپورٹ اور مردانہ کھیل

مردانگی اور چستی پیدا کرنے کے لئے جہاں ذہنی تربیت کی ضرورت پڑتی ہے وہیں جسمانی ریاضت بھی ناگزیر ہوتی ہے۔ اسی لئے یہ سوال دلچسپ ہے کہ عہد نبوی میں اسپورٹ کی کس حد تک سرپرستی اور حوصلہ افزائی کی جاتی تھی۔

عالم کی آقائی چاہنے والوں کے لئے نشانہ اندازی اور شہ سواری کی جتنی ضرورت ہے وہ ظاہر ہے۔ اسی لئے ہمیں کوئی تعجب نہ ہونا چاہئے جب ایک حدیث میں یہ بیان کیا گیا ہو کہ "ہر کھیل کود برا ہے سوائے شہ سواری، نشان اندازی اور اہل وعیال کو خوش کرنے والی باتوں کے" یہ بیان کرنے کی حاجت

نہیں کہ جب تک موٹر اور ریل اور ہوائی جہاز نہ تھے تو شہ سواری سے مراد صرف گھوڑے کی سواری ہوتی تھی اور اسی طرح جب تک توپ اور بندوق اور سنگیں اور تارپیڈو نہ بنے نشانہ اندازی سے مراد صرف تیر اندازی ہوتی رہی۔

عرب میں خاص کر حجاز میں تیرنے کی ضرورت کم پڑتی ہے اس کے باوجود خود آنحضرت نے کم عمری میں اپنی ننھیال کے کوئیں میں تیرنا سیکھا تھا اور اس کی آئندہ اوروں کو ترغیب بھی دیتے رہے۔

کشتی کا فن بھی اس ضمن میں بیان ہو سکتا ہے۔ آنحضرت کا رکانہ پہلوان کو مسلسل تین بار کشتی میں پٹکنا تاریخ کا ایک مشہور واقعہ ہے۔ مدینے میں بھی آپ اس کی اکثر سرپرستی فرماتے تھے۔ جنگ احد کے موقع پر چند نو عمر رضاکاروں کو کشتی لڑنے میں ماہر ہونے کے باعث باوجود کم عمری کے فوج میں بھرتی ہونے کی اجازت دی گئی تھی۔

دوڑ کے سلسلے میں آدمیوں کی، گھوڑوں، گدھوں اور اونٹوں کی دوڑ سب سے زیادہ مقبول تھی، آنحضرت اس پر خود انعام دیا کرتے تھے۔ تربیت یافتہ اور غیر تربیت یافتہ گھوڑوں کے لئے الگ الگ مسافتیں مقرر تھیں۔ وہ مقام اب تک مدینۂ منورہ میں محفوظ ہیں جہاں سے شرط کے گھوڑے وغیرہ روانہ ہوتے تھے اور وہ مقام بھی جہاں کھڑے ہو کر آنحضرت جیتنے والے کا تعین کرتے تھے۔ اس آخر الذکر مقام پر اب ایک مسجد ہے جو مسجد السبق (دوڑ کی مسجد) کے نام سے موسوم ہے۔ دوڑ میں انعام اول دوم سوم چہارم متعدد افراد کو ملتے تھے۔ کبھی یہ انعام کچھ کھانے کی چیز یں مثلاً کھجور ہوتے تھے اور کبھی

کوئی چیز جن کی تفصیل سیرت شامی میں ملتی ہے۔
نشانہ اندازی کے انعامات اور اس کی ترغیب و تحریص کا ذکر کثرت سے احادیث میں آیا ہے۔

بچوں کے ساتھ عورتوں کا بھی اس سلسلے میں ذکر کیا جا سکتا ہے۔ بی بی عائشہ کے ساتھ خود آنحضرتؐ کا دو مرتبہ دوڑ میں مقابلہ کرنا مشہور واقعہ ہے۔ جنگ ہائے بدر و احد وغیرہ میں زنانہ رضاکار زخمیوں کی مرہم پٹی، پانی پلانے، تیر بیں چن کر اپنے ساتھیوں کو دینے، بلکہ خود تلوار کھینچ کر لڑنے کے کام انجام دیتی رہتی ہیں۔ بی بی عائشہ، بی بی صفیہ وغیرہ خاندانِ نبویؐ کی افراد بھی ان میں برابر کا حصہ لیتی رہی ہیں۔ بعد کے زمانے میں حضرت خالد بن الولید کی لڑکیوں کی شہسواری مشہور رہی اور فنونِ مدافعت عورتوں کو بھی ضرور سکھائے جاتے رہے ہیں۔

یہ تو آپ کے عمل کا سرسری تذکرہ تھا۔ آخر میں آپ کی تعلیم پر بھی کچھ نظر ڈالنی ضروری ہے۔

ایمان لانے کے بعد کسی شخص کو نماز، روزہ، حج اور زکاۃ کا پابند کیا جاتا ہے۔ نماز میں صف آرائی، اجتماعی ہمکاری، فوج کا گھروں اور بارکوں سے اذان کی آواز پر اجتماع گاہ میں پہنچ جانا، اثنائے نماز میں امام مرض یا حدث وغیرہ کسی وجہ سے نماز سے الگ ہو جائے تو فوراً بغیر مقتدی کا اس کی جگہ لے کر بقیہ نماز کی تکمیل کرانا، نماز خوف کا انتظام، پنج وقتہ محلہ واری، ہر ہفتہ شہر واری اور ہر سال دو مرتبہ شہر و مضافات کے عام اجتماع، رکوع سجود کے ذریعے سے جسم میں لچک اور قوت پیدا کرنا ــــ غرض روحانی کے ساتھ بیسیوں عسکری

مصالحہ نظر آتے ہیں۔

فوجوں کو کھانے پینے کی چیزیں ہر وقت کہاں مل سکتی ہے روزے اور تراویح کے ذریعے سے ہر موسم میں دن بھر اور رات کے خاصے حصے میں بھوکے پیاسے کام کو جاری رکھنے کی جو تربیت ملتی ہے اس کے نتائج کا اعتراف گھر والوں سے نہیں حریفوں سے پوچھئے۔

فوج کو کوچ اور پڑاؤ کی جتنی ضرورت ہوتی ہے اس کے لئے حج اور میدان عرفات سے بہتر کیا مقام مل سکتے ہیں۔ تمام دنیا سے لوگ آئیں اور اس بے آب گیاہ مقام پر کوچ اور کیمپ کی تربیت حاصل کریں۔ دن کو آئیں مغرب تک ٹھہریں آگے جا کر رات گذاریں۔ علی الصبح پھر آگے بڑھیں۔ رستے میں کوئی بازار نہیں۔ کوئی ہوٹل اور کوئی دکان نہیں۔ ہر چیز خیمہ، توشہ سب ساتھ لینا پڑتا ہے۔ اور عالمگیر اخوت و تنظیم کا مکمل مظاہرہ ہوتا ہے۔ ہم خیالی سے بہتر اتحاد کا کوئی ذریعہ نہیں۔ زبان، رنگ، ملک اور اسی طرح کے ذرائع اتحاد کچھ اتنے سطحی ہیں کہ اولاد آدم علیہ السلام کو ان خود ساختہ تفریقات کے ذریعے سے اپنی یکجہتی کو نقصان پہنچانا جتنا مضر اور خطرناک ثابت ہوا ہے تاریخ اس کے واقعات سے بھری ہوئی ہے۔

معاشیات کو سیاسی رفتار و حالات میں جتنا دخل ہے اس سے اب کسی کو انکار نہیں۔ سرمایہ داری اور سود خواری کی انسانیت سوز بے رحمیاں اور بالشوزم و کمیونزم کی لعنت اور بربادیاں ان دونوں انتہا پسندیوں کا علاج اسلام نے زکات و صدقات کے ذریعے سے تجویز کیا اس میں اخلاقی

عناصر بھی ہیں، فطرت انسانی کا بھی لحاظ ہے۔ انفرادی ملکیت کو مکمل طور سے باقی رکھ کر اجتماعی ضروریات کی تکمیل کا پورا انتظام کیا گیا ہے۔ یہاں اس کی تفصیل ممکن نہیں صرف اس امر کی جانب اشارہ کرنا مقصود ہے کہ خانگی انتظامات ہوں کہ حکومتی سب کے لئے روپے کی ضرورت ہے اور کوئی سخت اور ناقابل برداشت بار ڈالے بغیر ضرورت سے زیادہ رقم والوں سے ان کی بچت کا ایک خفیف جزء اس غرض کے لئے حاصل کر لیا جاتا ہے اور محتاجوں اور ضرورت مندوں کے کام کے لئے اس کو معین کیا جاتا ہے۔

جب نماز، روزہ، حج اور زکات کے ارکان چہارگانہ کی پوری تعمیل ہوتی ہے تو پھر نوجوانوں کے لئے ممکن ہوتا ہے کہ اپنے فرض کفایہ یعنی جہاد کو انجام دے سکیں جس کا مقصد دنیا میں رب العالمین کی حکومت قائم کرنا اور روز ازل میں اپنے سر لی ہوئی امانت الٰہی کی تکمیل کرنا ہے۔

حَتّٰی لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ۔

(نشریہ انجمن مسلم نوجوانان۔ سکندرآباد دکن)

ج٠م ٣٥١
(٤٥٠)
٣٢٦٥٣

Date	No.	Date	No.